چوبیس زبانوں
کی
ہندوستانی کہانیاں

مترجمہ: شائستہ فاخری

چوبیس زبانوں
کی
ہندوستانی کہانیاں

مترجمہ:

شائستہ فاخری

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

یہ کتاب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

تعارف

نام: شائستہ ناز
قلمی نام: شائستہ فاخری

والد کا نام: سید محمد زاہد فاخری، صاحبزادہ مرحوم مولانا حاجی سید محمد شاہد میاں فاخری، سابق سجادہ نشین، خانقاہ دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد

جائے پیدائش: سلطان پور (یو پی)

تاریخ پیدائش: ۷ انومبر ۱۹۶۳ء

تعلیم: ایم اے (سنسکرت) پی ایچ ڈی (جاری)

ملازمت: سینئر اناؤنسر، آل انڈیا ریڈیو (الہ آباد)

مطبوعات: ۱۔ سندھی بیلا (ہندی)
۲۔ ہرے زخم کی پہچان (اردو)
۳۔ دیہہ کا دکھ (ہندی)
۴۔ ہرے زخم کی پہچان (ہندی)
۵۔ حاشیے پر لکھی تحریر (ریڈیائی ڈرامہ) ریڈیو سے نشر شدہ
۶۔ اداس لمحوں کی خود کلامی (افسانوں کا مجموعہ) اردو
۷۔ چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیاں (ترجمہ: اردو)

زیر طبع: ۱۔ اداس لمحوں کی خود کلامی (افسانوں کا مجموعہ) ہندی
۲۔ شیشے کے آبلے (نظموں کا مجموعہ) اردو، ہندی
۳۔ ایشیا کی منتخب کہانیاں (ترجمہ ہندی)
۴۔ پاکستانی شاعرات: کلام کا انتخاب مع تعارف (اردو، ہندی)
۵۔ بین الاقوامی کہانیوں کے تراجم
۶۔ نرمل ورما کے ناول 'انتم ارنئے' کا اردو میں ''آخری بیابان'' کے نام سے ترجمہ
۸۔ شہر سے کچھ دور (ناول) اردو، ہندی

انعامات:

۱۔ ۱۹۸۷ میں پریاگ راج ٹائمز کی جانب سے اعزاز
۲۔ ۱۹۹۲ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے کتاب 'ہرے زخم کی پہچان' پر انعام
۳۔ ۲۰۰۰ء میں ادبی، کلچرل اور سماجی انجمن 'سمنوئے' کی جانب سے ''چیتنا شری'' کا خطاب
۴۔ ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ میں متر کلں، پریاگ کی جانب سے اعزاز

انتساب

اپنی بیٹی

آفرین زینت

اور

بیٹا

یوسف ذیشان

کے نام

جو میرا مستقبل ہیں۔

پیش لفظ

اردو اور ہندی میں کہانیاں لکھتے لکھتے اور ان دو زبانوں کے علاوہ انگریزی اور سنسکرت زبانوں کے توسط سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے میری دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ہندوستان کی آئین میں مندرج زبانوں کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور ان کو کتابی شکل میں شائع کرایا جائے۔ میں نے اپنے اس ارادے اور منصوبے کے تحت کام کی ابتدا کی اور ہندوستان کی ان زبانوں کی ان کہانیوں کو تلاش کرنا شروع کیا جو اس ملک کی کہانی آپ بیان کرتی ہوں۔ اس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ملی اور پورا کام آپ کے سامنے ہے۔

میں نے کہانیوں کے انتخاب میں کئی امور کا خیال رکھا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ کہ اس مجموعے میں ہر زبان کی ایسی کہانی کا انتخاب کیا گیا ہے جو اس زبان کی سب سے اہم نہ سہی لیکن ایک نمائندہ کہانی کی حیثیت ان معنوں میں رکھتی ہے جن میں ہندوستانی تہذیب وتمدن، یہاں کے رسوم ورواج، یہاں کے رہن سہن، اور یہاں کے ماحول کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہو۔ مثلاً میتھلی کہانی کا اپنا رنگ ہے تو راجستھانی کہانی کا اپنا کلچر، بوڈو کہانی کی اپنی تہذیب ہے تو کشمیری کہانی کا اپنا انداز۔ بنگالی کہانی میں وہاں کی کوئی تاریخ ہے تو آسامی کہانی میں وہاں کے رسوم ورواج۔ غرض ہر کہانی کا موضوع اور تھیم الگ الگ ہے۔ اظہار بیان کی تشکیل وتعمیر بھی اسی کی مناسبت سے ہوئی ہے۔

میں نے ان کہانیوں کا ترجمہ کرتے وقت کہانی کی اصل روح کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس امر پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی ہے کہ کہانی ترجمہ ہوتے ہوئے بھی اپنی

اصل زبان کی کہانی معلوم پڑے تا کہ کہانی اور کہانی کا بنیادی موقف اور اس کا پورا منظر نامہ اپنی ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں نمایاں اور عکس ریز ہو سکے۔ میں نے فن ترجمہ کے اصولوں کو بھی سامنے رکھا ہے تا کہ کہیں کسی کہانی میں جھول نہ پیدا ہو جائے۔

میری یہ محنت کس قدر کامیاب ہو سکی ہے یہ تو قارئین کی دور رس نگاہیں ہی بتا سکیں گی۔

الہ آباد — شائستہ فاخری

فہرست

آسامی کہانی

دیوا پیٹھ کا خون

اندرا گوسوامی

سنہ ۱۹۳۰ء کے ماکھیا دھام کے نیچے آگھور دیو بھاگوتی اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتے تھے..... بارش کا زمانہ تھا۔ دیوا پیٹھ کے لئے اوپر جانے والے راستے کے بڑے بڑے پتھروں پر لگاتار برسات ہونے کی وجہ سے کائی جم گئی تھی۔ بارش کے بعد دھوپ نکلنے پر یہ پتھر ادھ چھلے سنگھاڑے جیسے دکھائی پڑ رہے تھے۔ دیوا پیٹھ کے لئے جاتے ہوئے بچے ان پتھروں پر بار بار چڑھنے اور پھسلنے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ پیٹھ تک پہنچنے کے لئے اور بھی کئی راستے ہیں لیکن بچے اس طرف بھلا کیوں جانے لگے؟ جنگلی کنٹیلے جھاڑ جھنکاڑ اور بیل کی جھاڑیوں والا یہی راستہ انھیں پیارا ہے۔

پدما پریا کو کھڑکی کھولتے ہی مندر کی طرف چڑھتے تیرتھ یاتری دکھائی پڑتے ہیں۔ وہ دیکھو، وہ دل شاید کوچ بہار سے ہی آیا ہے۔ ان کی چیخ پکار اور نئے کپڑوں کی سرسراہٹ جیسے یہاں تک سنائی دے رہی ہے۔ اس دل میں تین بوڑھے دو بوڑھیاں اور دو بڑے نٹ کھٹ بچے ہیں۔ وہ دونوں بار بار پتھروں کی طرف بھاگنا چاہتے ہیں۔ اور بزرگ لوگ بار بار چیخ پڑتے ہیں۔ کون سنتا ہے بڑوں کی باتیں وہ تو من مرضی کریں گے۔ دل کے سبھی بوڑھے لوگ سامنے جھک کر چڑھائی چڑھ رہے ہیں جیسے کوئی سارس کا دل ہو۔

پدما پریا نے کھڑکی سے ہی اس دل کے پیچھے پیچھے ایک نئے شادی شدہ جوڑے کو پہاڑی راستے سے اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ دلہن کے ماتھے پر سیندور دور سے ہی جھلملا رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے لال سورج کو پگھلا کر کسی نے ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ پتھروں کے قریب دیکھو دولہا کیسے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دلہن شرما کر اپنا ہاتھ کپڑوں میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ آس پاس کے پیڑوں ڈالوں کو پکڑ پکڑ کر وہ کسی طرح پھسلنے سے بچ رہی ہے۔ بوٹی دار میکھلا اور پاٹ کی چادر دیکھتے ہی اُتری آسام کے کسی رئیس گھرانے کی بہو ہونے کا پدما پریا نے اندازہ لگا لیا تھا۔ کوچ بہار یا بنگ کی تو بہو نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرف کے رئیس گھرانوں کی عورتیں لال کناری

کی ساڑی پہنتی ہیں اور پاؤں میں آلتا لگاتی ہیں۔

اچانک ایک کرخت آواز سن کر پدما پریا کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ "کیا دیکھتی رہتی ہو اس کھڑکی سے؟ چل کام کر ادھر آ کام میں ہاتھ بٹا۔" باپ کی آواز سے وہ ہڑبڑا کر باہر آ گئی۔

آہستہ آہستہ اسے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ آج کل باپ کی آواز اور لہجے میں تھوڑی سی غیر تعلقی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ شاستری گھرانے والے جب اسے چھوڑ گئے تھے۔ تب جس طرح کی مہربانی ان سے ملی تھی اب اس کا ذرہ برابر بھی حاصل نہ رہی۔ وہ اس خاندان کے لئے ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ پتری دکھوانے آئے دو لوگ باپ کے پوجا کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ وہ پرانے یجمان (شاگرد کی طرح) ہیں دونوں ہی دھوتی پہنے ہیں مگر ایک جو ادھیڑ ہے انھوں نے دھوتی ڈھیلے ڈھالے ڈھنگ سے باندھی ہے۔ اپنی دھوتی کا ایک سرا انھوں نے اپنی نیلی قمیض کی جیب میں ڈال رکھا ہے۔ بیچ کی مانگ نکال کر انھوں نے چپٹے بال بنا رکھے ہیں۔ ان کے ساتھ آئے ٹھگنے سے کم عمر نوجوان نے بھی بیچ میں سے مانگ نکالی ہے لیکن بال الگ ڈھنگ سے سنوارے ہیں۔

پدما پریا نے جھٹ پٹ اندر سے دو مونڈھے لا کر دئے۔ ادھیڑ آدمی نے بے حد عزت سے مونڈھے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! تم ہی روتا کی بہو ہو نا! وہاں کے شاستری گھرانے کے چھوڑے جانے کی بات ہم نے بھی سنی ہے۔" کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولے۔ "کریں بھی کیا۔ قسمت کا کھیل ہے؟" اس پر اس چھوٹے قد کے گورے رنگت والے نوجوان نے کہا۔ "سنا ہے وہ بنگلرہ کی طرف کی عورت بھی لے آیا ہے، یہ تو سراسر ناانصافی ہے، آج ملک اور غیر ملک میں سب اس طرح کی مخالفت کی آواز اٹھا رہے ہیں، ایسے ہی بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ ضرورت پڑے تو عدالت بھی جانا پڑے گا۔"

"عدالت؟" پدما پریا وہاں کھڑی نہیں رہ پائی۔ وہ بھاگ کر کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا، ہاں اب سب لوگ جان چکے ہیں، دیوی مندر کے آس پاس کے کیا قریب کے کیا دور کے سبھی تو جان گئے ہیں۔ دیوار پر ٹنگا چھوٹا آئینہ اس نے پھر اتار لیا۔ اپنا بلاوز کھول ڈالا پھر گھٹنوں تک لمبی مارکین کی قمیض اتار کر بستر پر پھینک دی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے پیٹھ کا چھوٹا سا داغ دیکھنے کی کوشش کی۔ اوہ! اُف ہو...... بڑی مشکل ہے...... کچھ بھی ٹھیک سے دکھائی نہیں

دیتا۔ ماں اس کے سارے کپڑے اتروا کر ہی اس داغ کو دیکھ پائی تھی اور چیخ پڑی تھی اوہو...... اوہو...... یہی ہے۔ وہ سفید داغ؟ اسی داغ کی وجہ سے وہ لوگ تجھے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔''

ایک ادھیڑ آدمی چھتری لے کر لاٹھی کی طرح ٹکا ٹکا کر اوپر کی طرف چڑھ رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے کاماکھیا دھام کا گٹھیلا ہونا سینگ ہے۔ سینگ جمان کو اوپر لے جانے میں مصروف ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ دو جوڑی آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ پل بھر کو ایسا لگا جیسے عریاں ہو کر وہ ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے اور وہ ڈھونڈنا چاہ رہے ہیں کہ وہ داغ جسم کے کس حصے پر ہے۔ ہاں، ہاں، ان کی نظر اسی سفید داغ کو ڈھونڈ رہی ہے۔

ابھی اس دن تک ایسی نظر پڑتے ہی پدما لپک کر بھاگ کھڑی ہوتی تھی مگر نہیں آج وہ نہیں بھاگی، اتنے میں ایک نے شاطرانہ لہجے میں پوچھ ہی لیا۔ ''کیا کرتی رہتی ہو۔ سارا دن؟ کیسے وقت کاٹتی ہو؟''

کیا...... کرتی...... رہتی ہو::

یہ جملہ ہمیشہ پتھر کی طرح آتا ہے اور اس کے جسم سے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔۔

''کیا کرتی رہتی ہو؟''

کیا...... کرتی...... رہتی...... ہو؟

اسے یاد آجاتا ہے۔ شادی سے پہلے پدما اور پجاری کی بیٹی کیسے مخصوصے کیا کرتی تھیں۔ ارے ابھی سے چوٹی میں مالا لپیٹ لے۔ بعد میں تو وقت ہی نہیں ملے گا۔''

''ہاں یہ مرد تو چبا چبا کر گنے کی گنڈیری سا بنا دیتے ہیں۔ بعد میں دانت اگی پھانس جیسی حالت ہو جاتی ہے۔ اور کیسے سب کی سب کھلکھلاتی تھیں۔

لالن وڑ نے پھر چڑھایا تھا۔ ''سنا ہے خوب بھرا ہوا گھرانا ہے۔ جیٹھ کے بچوں کا گو، موت صاف کرتے کرتے ہی تیرا وقت کٹ جائے گا۔''

''ہی...... ہی...... ہی...... کام کرتے کرتے تیرا 'وہ' پیچھے سے آکر تیری چوٹی میں سے پھول نکال لے گا۔ ہاں ری، ہاں تی پوجا، ساتھا بارات اور مدن چترالی پوجا کے وقت تجھے آنے تو دے گا نا؟''

پھر ساری کی ساری ایک ساتھ ہی، ہی، ہی کرتی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

اوہ! کتنے دن بیت چکے ہیں تب سے۔ گٹ مالی پھولوں کی مالا تو چوٹی میں گوتھنا تو بڑی دور کی بات ہے، وہ تو اوپر والی چھن متا اور دھوماوتی دیویوں تک لئے مالا نہیں پرو پاتی۔ لگتا ہے جیسے کانوں میں بار بار کوئی کہہ رہا ہے۔ تم نے چھن متا کو گٹی مالی کی مالا نہیں پہنائی، تم نے دھوماوتی کو بھی گٹی کی مالا کبھی نہیں پہنائی۔......

ہی، ہی، ہی،...... چونک اٹھی تھی پدما پریا۔

''ہٹ، ہٹ۔ ہٹ'' بونا سینگ کھڑکی کے پاس کھڑا اچلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کرنی چاہی مگر وہ پھر بھی کھڑا رہا۔ اپنے پیلے پیلے دانت بے حسی سے نکال کر وہ ہنسنے لگا۔ پدما نے غور کیا اس کا سر اس کے جسم کے مقابلے کافی بڑا ہے۔ بال روکھے، الجھے الجھے، جسم پر سینکڑوں سوراخ والی قمیض اور ہاف پینٹ، اس نے نظر گھمائی۔ تامول پاتر کے لئے وہ پھر اس کمرے میں گئی تو دیکھا ایک اور یجمان تشریف لا چکے تھے۔ وہ تینوں لوگ کوٹ کچہری کی باتوں کو لے کر زور زور سے شور کر رہے تھے۔

''کیس کرنا پڑے گا، دعویٰ تو کرنا ہی پڑے گا نا۔ بیاہی کی لڑکی لا کر گھر پر پٹک گئے اور یہاں سب لوگ منھ بند کر کے بیٹھے ہیں۔''

''قسمت کا کھیل ہے...... قسمت کا...... اگھور دیو اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے خود کو کوسنے لگے۔ پدما کو اندر آتے دیکھ کچھ سنبھل تو گئے مگر بیچ میں مانگ نکالے سپاری چباتا ہوا نیا یجمان پتری پر سے نظر ہٹا کر چشمہ ناک پر تھوڑا سرکا کر بول پڑا۔ ہندو اصولوں نے ہی ہماری عورت ذات کو تباہ کیا ہے۔ وراثت میں ملی زمین جائداد سے جو رانی بن کر راج کر سکتی تھی اس سے کس طرح سب کچھ چھین کر بھیک مانگنے کے لئے گھر سے نکال باہر کیا۔ جانتے ہی ہو نا؟ بیاہ کر لے گئے تھے جسے اسے پھر تمہارے منھ منڈھ کر چھاتی پر مونگ دل رہے ہیں۔

دونوں ہاتھ اٹھا کر بھاگوتی پھر سے آہ بھر کر بول اٹھے۔ میرے ہی آنگن میں کھڑے ہو کر میرے ہی منھ پر تھوک گئے کہ میں نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ پر گنے سے آ کر اسی آنگن میں پیر ٹھونک کر گالی دے گئے کہ میں ٹھگ ہوں، میں نے جان بوجھ کر مریض لڑکی کو بیاہ دیا۔

پدما کے باپ تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھے، اتنے میں ڈھینکی شال سے ماں لپک کر آئیں اور ان کا راستہ روک کر انھیں ٹوکا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں؟''

اگھور دیو بھگوتی چلائے۔ ''میں اپنی بیٹی کی پیٹھ دکھا کر پوچھوں گا، دیکھو کیا ہے...... کیا

بیماری ہے اسے...... دیکھیں سب لوگ دیکھیں۔''

بائیں ہاتھ کے جھٹکے سے بیٹی کو اندر دھکیلتے ہوئے ماں بھی گرنے کو ہوئیں لیکن کھونٹی کو پکڑ کر کسی طرح سنبھل گئیں۔ پس وپیش کی حالت میں تینوں مہمان بھاگوتی کی طرف دیکھ کر بول اٹھے۔ ''مذہب کی کھونٹی تو آپ کی وجہ سے اٹل ہے آپ اتنے بے چین نہ ہوں؟''

ان کے جاتے ہی گھر مرگھٹ جیسا خاموش ہو گیا۔

پدما پھر گھپ اندھیری کوٹھری میں جا گھسی۔ انجانے ہی وہ پھر بلاؤز کے پیچھے ہاتھ سے پیٹھ کے اس داغ کو سہلانے لگی۔ بس کچھ ہی لمحوں کے لئے۔ اس نے پھر کھڑکی کھول دی۔ تین علاقائی خدمت گار مندر کی طرف چڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ بالکل سفید جھک پوشاک میں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تین شویت۔ استھل۔ پدم دیوی کے مندر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

دوپہر میں گاؤں کی تین خدمت گار آئیں۔ وہ باپو کا آشیرواد پانے کے بعد درشن کے لئے یہاں آئی تھیں۔ جاتے وقت کچھ کتابیں اور کاتا ہوا سوت دے گئیں۔ اس نے ان کے سامنے تھوڑا سوت کات کر دکھایا تو وہ شاباشی دیتے ہوئے بولیں کہ جو اتنا مہین سوت کات سکتا ہے اسے کبھی پیٹ بھرنے میں دقت نہیں ہوگی۔ جانے سے پہلے وہ اپل چاٹے کے گاؤں کو تاندے قریب کی گھاس، مٹی اور مٹی موٹی کے کھٹے ساگ سے مانجھ دھو کر پتیل کو سونے سا چمکا گئی۔

اسے ہلکا سا نیند کا جھونکا آتے ہی لگا کوئی دستک دے رہا ہے۔ ''کون؟ کون ہے؟'' وہ چلائی۔

''میں ہوں لال وز۔''

وہ پچھونے پر ہی جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی مگر اگلے ہی پل لپک کر گئی اور دروازہ کھول دیا۔ لال وز اس کی بچپن کی سہیلی ہے۔ اوپر والی دوسری لڑکیوں کو اب اسے گلے لگانے کو یا ہاتھ پکڑنے میں بھی جھجک ہوتی ہے لیکن لال وز کو نہیں۔ آتے ہی وہ پدما کے گلے سے لپٹ گئی اور ایک ہی سانس میں بولی۔ ''سن! آج جو خبر میں تجھے دینے آئی ہوں، اسے سنتے ہی تو چونک جائے گی۔''

''چونک جاؤں گی؟ اب چونک جانے لائق رہا ہی کیا ہے؟ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔ مٹ گیا سب۔''

لال وز پھر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تجھے دکھ تو بہت ہوگا مگر یہ بات تو تجھے بتانی ہی پڑے گی۔ سن میری بہن ملائی

شادی میں بھونیشور آنے والا ہے، وہ نئی عورت بھی آسکتی ہے۔''

''نئی عورت؟''

اچانک سب کچھ واضح ہوگیا۔ اس نے گردن جھکالی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لاں وڑ کچھ دیر چپ رہی پھر پاؤں اٹھا کر بستر پر اس سے سٹ کر اپنے پن سے بیٹھ گئی۔ ایک بھینی سی مہک نے اسے گھیر لیا۔ نو بیاہتا کے جسم کی وہ بھینی مہک کچھ دیر کے لیے اسے بہت کچھ سوچنے کو دے گئی۔ یہ جیسے ابھی ابھی کاٹے ذمرہ پھل کی میٹھی سی مہک تھی جو دل کے کسی کونے کو کچوٹ گئی۔ لاں وڑ دھیرے سے مگر سدھے لہجے میں بولی۔ ''سن تجھے بھونیشور سے آمنے سامنے تو ہونا ہی پڑے گا۔ میں بھی تیار ہو کر آئی ہوں۔''

پدما حیرت سے اس کا منہ تاکتی رہ گئی۔ تب لاں وڑ نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ...نہیں کوئی نہیں آرہا... سب اس پر یقین جو کرتے ہیں۔ پھر بولی۔ ''نہیں نہیں تو یوں ہی پڑی سڑتی کیوں رہے گی؟ وہ لوگ تجھے کوڑے کباڑے کی طرح یہاں پٹک گئے ہیں مگر تجھے تو لگتا ہے اس نے تجھے ٹھیک طرح دیکھا بھی نہیں ہوگا۔''

''مطلب؟''

''مطلب اور کیا... یہی کہ تیرے ہاتھ پاؤں۔ یہ بھرا پُرا بدن... تجھے نہیں معلوم یہ آدمی بھیڑیئے کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک بار تیرے بدن کی لذت پا جائیں تو آدم خور کی طرح خون کی مہک سونگھ کر کپڑے تک چبا کر کھا جاتے ہیں۔ مرد کے خوف میں ایسی قوت ہوتی ہے۔ انسان کو انسان کا گوشت ہی زیادہ بھاتا ہے۔''

''چھی... چھی... کیسی بے شرمی بکتی چلی جا رہی ہے۔''

''ارے میں بھی تو اب جا کر اتنا کچھ جان پائی ہوں، مرد کے دل کو سمجھ پائی ہوں۔''

برہمپتر کی طرف سے آتی ہوئی ہوا سے کھڑکی کا دروازہ کھل گیا اور مندر کی طرف چڑھتے ہوئے دلہا دلہن نظر آئے۔ ان کے آگے آگے ایک خالی پالکی لیے پالکی بردار چلے جا رہے تھے۔ شاید دیوی مندر تک پالکی پر چڑھنے کی دلہن کی خواہش نہیں تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر چڑھ رہی تھی۔ ماتھے پر لمبا گھونگھٹ۔ پاٹ کی نئی پوشاک بارش میں موجیں مارتی برہمپتر کے پچھین سے جگمگا رہی تھی۔ ہائے ہائے۔ یہ کون نظر آ رہا ہے۔ ٹھیک ان کے پیچھے؟ الجھے بال، کمر میں بندھا گچھا۔ اوہ یہ تو سینگ بونا ہے۔ اس کی عادت ہے کہ جب کوئی امیر کبیر یاتری نظر آئے اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اور

ضرورت پڑے تو بلی کا بکرا تک کھینچ کر اوپر تک لا دیتا ہے۔

لاں وزکو شرارت سوجھی۔ "اے بونے سینگ، دے بکرے کی ٹانگ۔"

دلہا دلہن سب بیچے کی طرف جھانکنے لگے۔ منھ میں ہی کچھ بڑبڑا کر سینگ نے ایک عجیب سی آواز نکالی جیسے کوئی بھی سمجھ نہیں پایا۔ اس کا چہرہ چیچک کے داغ سے بھرا ہے۔ بال بناوٹی سے بے جان اور رنگ تانبے جیسا۔ اس سے کبھی بولتے، بات چیت کرتے ہیں۔ وہ چلایا۔"

"سن بدھو پدما، یہ سینگ بڑے کام کا آدمی ہے، سمجھی؟"

پدما نے لاں وز کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سمجھ میں آیا۔؟"

"ہاں سمجھی۔"

دن تاریخ وغیرہ سب ٹھیک سے بتا کر لاں وز نے پدما سے اجازت مانگی۔ لاں وز نے کافی دیر تک اس کا ہاتھ کس کر پکڑے رکھا اور محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں کپکپاہٹ ہے اور پیشانی کی رگیں پھڑک رہی ہیں۔ پیشانی کی یہ رگ تھوڑی سی پھول کر ابھر آئی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ رگ ترشول جیسی دکھنے لگی۔

اچھا ہے اچھا ہی تو ہے۔ ان کیاریوں میں، پھولوں میں دل لگا۔ پدما کھرپی سے پودوں کی جڑوں کے آس پاس نرائی گڑائی کر رہی تھی۔ ماں وہاں کھڑی ہو کر اس کا حوصلہ بڑھا کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔ بونا سینگ مٹی کے ڈھیلے ہاتھ سے توڑ توڑ کر برابر کر رہا تھا۔ لاں وز نے اپنے باپ کے ججمانوں کے ذریعہ لائے گئے بتاشے اور ناریل کے لڈو دے کر سینگ کو پٹا لیا تھا۔

مٹی کو برابر کرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ سر کے مقابلے میں بہت چھوٹے نظر آرہے تھے۔ اس کا باپ کا ماتھیا دھام کے شمشان میں لکڑی اکٹھا کرنے کا کام کیا کرتا تھا اور ماں جنم دے کر کبھی کی مر چکی تھی۔ اسکا 'سینگ' نام کس نے رکھا تھا کوئی بھی نہیں جانتا۔ دیوی دھام کے ہی کسی کمینے آدمی نے رکھا ہو شاید۔ خیر اس کا کھانا پینا سونا سب چنڈی مندر میں ہی ہوتا تھا۔

باپ کی پوجا کی جگہ سے اگربتی اور دھونی کی مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ تبھی تبھی اتری پار سے دو ججمان شنی پوجا کروانے کے لیے آئے ہیں۔ باپ کی بھاری اور گمبھیر آواز گھر بھر میں گونج رہی ہے۔ ستے منیشو رمہا بھاگے اوشان ایشور ... ستے منیشو رمہا ... نمستے ... شمبھو نمستے شول ہستے، پال ہستے دکشی دے

اچانک ماں کے پاس آ کر پدما نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے بھونیشور کے پچھم میں سفید پھولوں کے پودے ہیں۔...... میں ذرا ادھر ہو آؤں؟''

''جا! جا بیٹی، لیکن سینگ کو ساتھ لے کر ہی جانا۔''

ماں نے خوش ہو کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ سچ ہی تو ہے۔ سسرا سے جب سے یہاں چھوڑ گئے ہیں تب سے قریب دو برسوں میں پدما نے کبھی کسی چیز میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ ماں دروازے پر کھڑی اسے دیکھتی رہی، سوچتی رہی، کیسی خوبصورت لڑکی ہے۔ سارے دیوی پیٹھ اور آس پاس کے علاقے میں اس کے مقابلے کی کوئی لڑکی خوبصورت نہیں۔ لیکن دیکھو... قسمت...... چادر کی کورسے اس نے آنکھیں ڈھک لیں...... کیوں...... آخر کیوں ہوا ایسا؟......

وہ بھونیشور پہاڑ سے سینگ کے ساتھ ہی اتری۔ دونوں سفید گٹی مالا پھولوں کے چھوٹے پودے ڈھونڈتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے اور سینگ برابر لوٹ چلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس بھیانک جنگل میں آنے سے وہ بہت گھبراتا ہے...... لیکن پدم پریا؟ وہ سینگ کا ہاتھ تھامے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح کے خوف و ڈر سے کوسوں دور تھی...... وہاں آس پاس کہیں کوئی نہیں تھا۔ صرف جنگلی پھولوں کی خوشبو ماحول میں بسی ہوئی تھی۔ دور...... برہمپتر کے کنارے چٹانوں پر بگلوں کے جھنڈ بیٹھے تھے۔

گٹی مالا کے ایک پودے کو پدما جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پودا بڑا تھا۔ اس لئے سینگ اور پدما دونوں مل کر اسے کھینچ رہے تھے۔ اچانک اس کی جڑ اکھڑ گئی اور پدما چھٹک کر اسی راہ سے اوپر آتے ہوئے ایک آدمی کے اوپر جا گری۔

''ہائے ہائے۔ کون ہے...... نہ جانے کس ذات کی ہے۔'' پھنکارتے ہوئے بلی دینے والے برہمن شمبھو دیو ہاتھ سے گرے کھڈگ اور مالنے کے پھل کو ڈھونڈتے ہوئے کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ سینگ برہمپتر کے بالکل کنارے تک لڑھک گیا۔ اور مالنے کو اٹھا کر لایا۔ اور ''بم...... بم۔'' کہتے ہوئے شمبھو دیو کے قریب آ گیا۔ چھٹک کر دور جا گرے کھڈگ کو ڈھونڈ پانے کے بعد ہی شمبھو دیو کی نظر پدما کی آنکھوں پر گئی۔ انھیں یکبارگی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو پایا۔ سوچنے لگے ایسی خوبصورت لڑکی کبھی دیوی پیٹھ کے آس پاس کہیں نظر نہیں آئی۔ آخر یہ ہے کون؟...... کون ہے؟ سینگ بونا ساری بتیسی باہر نکالے بار بار پدما کے گھر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتا رہا۔ کچھ دیر کے

لئے شمبھو دیو ساکت وصامت کھڑے رہے۔

ہاں ... ہاں ... دھیرے دھیرے سب یاد آتا جا رہا ہے۔ ایک دو بار اس نے ایک لڑکی انھیں بلی شالہ (جہاں بلی دی جاتی ہے) کے آس پاس نظر آئی تھی۔ بس اتنا ہی ... مگر اس گدرائی جسم والی حسینہ کو تو اس نے آج ہی دیکھا ہے ... جیسے ایک نئی عورت نے جنم لیا ہو۔ بلی کے وقت چیخ کر رونے والی بچی کا اب رنگ روپ ... تعجب ہے ... سچ مچ حیرت

ہفتے بھر بعد پدما پھر کھرپی اور داؤ لے کر سینگ کے ساتھ پھول کی پود ڈھونڈنے نکل پڑی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب لوگ پان تمباکو لے کر ستانے بیٹھے ۔ ۔ ۔ ۔ تب سینگ کے ساتھ وہ ندی کی طرف جا رہی تھی۔ بھاگوتی نے نیند سے بھرے لہجے میں بیوی سے پوچھا۔ "وہ چلی گئی ہے کیا؟"

"سینگ کے ساتھ شاید سفید پھول کی تلاش میں گئی ہے۔"

"سفید پھول؟"

"ہاں دیکھ نہیں رہے، سارا باغیچہ سفید پھولوں سے بچ گیا ہے۔"

"سفید پھول؟"

حیرانی کی بات ہے کہ دوسری بار بھی پدما کو شمبھو دیو وہیں ندی کے کنارے ملے۔ بوری میں لائے بڑے بڑے مالٹے، وہ ایک ایک کر کے پانی میں بہاتے جا رہے تھے اور ایک ہی طرح سے ان کے دو ٹکڑوں کر رہے تھے۔ سینگ اور پدما بڑی تجسس سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

بھرے جسم والے شمبھو دیو کی رگ رگ جیسے پھڑک رہی تھی۔ جسم کی وجاہت میں جیسے مردانگی امنڈی پڑ رہی تھی۔ تنا ہوا شانہ، آہنی بازو بیوں کی Mussles میں چھلکتا خون جیسے دور سے ہی چمکتا تھا۔ اپنے تجسس کو روکنے میں ناکام پدما چلا اٹھی۔ "او بلی والے دیو! آپ کیا کر رہے ہیں؟"

شمبھو دیو پلٹے۔ ساتھ ہی کھڑگ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان کے ہونٹوں سے الفاظ خود بخود نکلتے رہے۔ "اوم اور اوم دیتہ یشمے اوم اوم دیتہ یشمے۔"

شمبھو تلن دار نے گرا ہوا کھڑگ اٹھا کر پوچھا۔ "اس بھری دوپہر میں اس خوفناک جنگل میں چلی آتی ہو؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیوں آتی ہو؟''

''بلی والے دیو یہ کیا تعلیم دے رہے ہیں؟''

گناہوں سے توبہ۔کل بھینسے کی بلی دیتے مجھے تین وار کرنے پڑے۔ پھر بھی ایسا رونما ہوا سی کی اپنے آپ مشق کر رہا ہوں۔'' تینوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔

'' دیوی پیٹھ کے اصولوں کے مطابق کفارہ ادا کرنے کے بعد میں پاک ہونا چاہتا ہوں۔ سبھی راستوں سے۔'' پتھر پر کھڈگ رکھ کر وہ پانی سے باہر نکل آئے۔ برہمپتر ندی سے آتی ہوا میں کچے گوشت کی سی مہک آئی۔ بیساکھ کا مہینہ...... کیا پتہ باڑھ کی وجہ سے پہاڑ کا کوئی حصہ شاید ندی میں ڈھے گیا ہو۔ کچی مٹی اور پیڑ کی جڑوں کی ملی مہک تو نہیں۔

سینگ کا کندھا پکڑ کر وہ گھٹنے ٹیک کر مٹی پر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی۔'' اب تک کتنے بھینسے قربان کر چکے ہیں۔'' کچھ دیر ایک ٹک اس کے چہرے کو دیکھنے کے بعد بولے۔'' تین ہزار بھینسے۔ ''

'' تین..... ہزار..... بھینسے.....؟'' یہ سن کر پدما پریادکھ سے چیخ اٹھی۔

'' آج صبح دشمن کے خوف سے کانپتے مہاجن نے جو بھینسا چڑھایا تھا، اسی کی قربانی میں تین وار کرنے پڑے۔''

گاروں، پہاڑوں کے گاؤں سے آئے آدمی صبح سے ہی سو بھاگ کنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھیں پہلے سے خبر مل گئی ہے۔ اپنے آپ سے بولتا ہوا وہ شیر جیسے تناور کندھوں والا آدمی اوپر آسمان کی طرف دیکھتا ہوا چیخ چیخ کر کہنے لگا۔'' میں نے تو بخش مان منتر کا جاپ کیا تھا۔'' وہ پھر سے جیسے اپنے من میں، اپنے دماغ میں بدبداتا ہوا وہی منتر دہرانے لگا۔

'...... ہے مہیش اتم جیسے گھوڑے سے حسد رکھتے ہو اور چنڈیکا کا وہن کرتے ہو ویسے ہی میرے دشمنوں کو برباد کرو، مجھے آشیرواد ہو..... اس طرح دشمنوں کی تباہی کی منت مانگ کر کے ہی سر کو جسم سے الگ کیا تھا۔ دشمن کے جان مال کی بلی کی گئی تھی۔ اوہ..... اوہ..... پھر بھی تین تین بار وار کرنا پڑا..... آہ دیوی..... آہ..... مہامایا.....!

'' گارو لوگ کاٹنے پیٹنے میں مصروف ہیں۔ جاؤ جا کر دیکھ آؤ۔ وٹ کے درخت کے نیچے کیسے دھوم دھام سے کاٹے ہوئے حصوں کی بٹائی چل رہی ہے۔''

کچھ دیر پدما اور سینگ خاموش کھڑے رہے۔ پھر پدما نے ہی خاموشی توڑ کر دھیرے سے پوچھا

''دیو! دیوی کیا سچ مچ کبھی انسانی قربانی کو قبول کرتی تھیں۔ انسان کا خون پیا کرتی تھیں؟''

''انسانی قربانی؟''

''شاستروں میں لکھا ہے۔ سب طرح کے اصول وقانون سے ایک انسان کی قربانی دینے پر دیوی سینکڑوں برسوں تک مطمئن ہو جاتی ہے۔ تین انسانوں کی قربانی سے لاکھ سال تک ...... انسانی گوشت سے تین سوصدی تک؟ اور سن، قربانی دینے والے کھڈگ کی پوجا کے صحیح منتروں کو پڑھنے کے لئے میں نے بہت برسوں تک کڑی سادھنا کی ہے۔'' بات ختم ہوتے ہی شمبھو دیو نے ایک اور مالٹا پانی میں پھینکا اور کھڈگ سے دو ٹکڑے کر ڈالا ...... یہ ہے بلی قربانی دینے کا مشق ...... اس مشق کو جاری رکھنے سے بلی رائیگاں نہیں ہوتے۔''

سینگ کا ہاتھ پکڑ کر وہ پگڈنڈی سے آگے بڑھ گئی۔ پہانونی، اُریام اور کچھ کٹیلے جھاڑوں کے نیچے سے جلتی ہوئی وہ بہت بڑے آنولے کے پیڑ کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ یہاں پر پیڑوں سے لپٹی جنگلی بیلیں اتنی نیچے تک لٹک رہی تھیں کہ اس کے جوڑے سے الجھی جارہی تھیں۔ ایک جگہ تو شہد کی مکھی کے چھتے سے شہد ہی پیشانی پر ٹپک پڑا۔ کسی جگہ پر کسی بھگت نے سیندور سے دیوی کے چرنوں کی آکرتی والی چٹان پر تلسی مالا ایسے سجادی تھی کہ اسے ٹاپ ٹاپ کر ہی پار کر پائی۔ کہیں کالا پہاڑ سے ٹکڑے ٹکڑے کی شکل میں آنے جانے والی دیوی کے جسم کے کسی حصے پر اس کا پاؤں پڑ گیا تو؟ دونوں آخر کار قدیم وٹ کے درخت کے نیچے پہنچے تو انھیں جیسے سانپ سونگھ گیا۔

...... گاروں گاؤں کے لوگ قربانی دئے گئے بھینسے کو کاٹ کوٹ کر کئی حصوں میں پوٹلی باندھ کر لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ آس پاس کی ساری گھاس پر خون کے چھینٹے ہیں ...... قریب ہی خون سے سنے بھینس کے کُھر ...... پدما کو یاد آ گیا۔ اودھ ای طرف سے تو اسے گھسیٹ کر کھینچ کر لے گئے تھے۔ سیڑھیوں سے چڑھنے میں اسے کتنی دقت ہو رہی تھی ...... کیسی خوف اور ڈر کی نظروں سے بے چارہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ہائے! اسی کے جسم کا گوشت کے ٹکڑے یہاں ...... اس کی آنکھوں کے سامنے ......

اوہ ...... اوہ ...... یہ کیا ہو رہا ہے اسے؟ گھٹنے ٹیک کر وہ وہیں بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سینگ کچھ سمجھ نہیں پایا اور بے یار و مددگار سا ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگا۔ شمبھو دیو بھی مالٹا کاٹ کر اپنے تجربے سے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

دو دن تک سفید پھولوں کی تلاش میں اوپر نہیں جا پائی ...... اسی اندھ کوپ میں دروازے

بند کر کے پڑی رہی۔ بیچ بیچ میں آئینے میں اپنی پیٹھ کے داغ کو دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس اندھیری کوٹھری کی دیوار پر لٹکے پرانے شیشے میں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن وہ تھی کہ کوشش کرتی رہتی تھی۔ شاید کچھ دکھائی دے جائے...... لیکن نہیں...... داغ تو ذرا بھی نہیں بڑھا...... نہ ہی کم ہوا ویسے کا ویسا ہی ہے۔ پھر بھی اور دنوں کی طرح پہلے وہ داغ کو سہلاتی۔ مسلتی رہی پھر کھروچنے لگی اور پھر درد کے مارے بچھونے پر جا پڑی۔

ہفتے بھر بعد لاں وڑ دو اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر نیچے آئی۔ ان دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر پدما کی ماں یشودا کو اچھا لگا۔ دو دن سے پدما کوٹھری میں ہی پڑی ہے۔ پنڈے کی دونوں چھوٹی لڑکیوں کو دیکھ کر اسے بھی اچھا لگے گا۔ ضرور اچھا لگے گا۔

''جاؤ، جاؤ، وہ اندر ہی ہیں۔'' یشودا نے کہا۔

لاں وڑ تو اندر چلی گئی۔ مگر چھوٹی دونوں لڑکیاں جھجکتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

''ارے! تم لوگ اندر کمرے میں کیوں نہیں جاتیں؟''

وہ نہ کچھ بولیں اور نہ ہی جگہ سے ہلیں۔ تب یشودا نے ڈپٹ کر کہا۔'' جاؤ، سنگی ساتھی ملنے پر وہ خوش ہوگی۔'' لڑکیوں کو پھر بھی ہچکچاتے دیکھ وہ گرج اٹھی۔ ''یہ چینٹ چھوریاں تماشا دیکھنے آئی ہیں یہاں، میری بٹی کو، شویتی (برص) ہوئی ہے یہ سوچ رہی ہونا! اسے جانور کی طرح یہاں پٹک گئے ہیں۔ یہی نا! چالاکی کر کے اسے ہی دیکھنے آئی ہونا، لو دیکھو...... اپنی خود کی آنکھوں سے دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرلو......''

یشودا باؤلی سی پھنکارتی ہوئی اندر گئی اور پدما کو کھینچ کر باہر لے آئی۔ چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ وہ داغ دکھانے کے لئے ایک جھٹکے سے پدما کا بلاؤز پیٹھ پر سے پھاڑنے ہی والی تھی کہ تجمانوں کو چھوڑ کر بھاگوتی ایک دو لمبے ڈگ بھرتے آپہنچے اور تھاپ مار کر اس کا ہاتھ پکڑا اور نہ اس دن تو......

لاں وڑ کے ساتھ آئی دونوں لڑکیاں تو پلک جھپکتے نو دو گیارہ...... بے چاری لاں وڑ وہاں بے جان سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی جی ہاہاکار کر اٹھا...... ہاں، یہی سچ ہے...... ایسی ہی تو بات ہے۔

ادھر رو رو کر بے حال ہوئی پدما پھر سے اسی اندھیری کوٹھری میں آکر چوکی پر گر پڑی ۔لاں وڑ نے اسے گلے لگا کر دلاسہ دینا چاہا...... مگر آج وہ خود ہی تھوڑی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ماں ایک

پیڑھے پر بیٹھی آنکھیں پونچھتی جارہی تھی اور بیچ بیچ میں شاستری کے خاندان کو گالی دیتی جارہی تھی۔

''مرو — مرو — تم سب کے سب مرجاؤ — تمھارا سب کچھ برباد ہو جائے — تمھاری نسل مٹ جائے ......''

بھاگوتی نے قریب آ کر گرج کر انھیں دھمکایا۔ ''مہمان بیٹھے ہیں، دکھائی نہیں دیتا؟ چپ! چپ رہ! زبان پر ذرا بھی لگام نہیں — بکتی جارہی ہے۔''

جاتے جاتے لاں وڑ اس کے کان میں دھیرے سے کہہ گئی۔ اس کی شادی میں اب صرف بیس دن رہ گئے ہیں۔ یاد رکھنا، صرف بیس دن! سنا ہے۔ کوچ بہار کے اس برہمن کی بیٹی کا ابھی تک کوئی بچہ وچہ نہیں ہوا ہے — دو سال تو نکل گئے۔ اس کا برتاؤ بھی بڑا چڑ چڑا پن سا بتاتے ہیں ...... ہاتھ پاؤں بھی بالکل پتلے پتلے سے ہیں۔ تیری جیسی سڈول نہیں۔ پدما جذبات سے عاری ہو کر کہیں دور نظر جمائے بیٹھی رہی۔ صبح ہوتے ہی پدما کو مے کھیلا اوجوا پتھ پر ہاتھی کے پیٹ جیسی کالی چٹان پر کھڑا سینگ دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گچھا سفید کند پھول تھے۔ اور وہ اس کی کوٹھری کی کھڑکی کی طرف ہی تاک رہا تھا۔ پھولوں کو دکھا کر وہ بتانا چاہ رہا تھا لیکن کیا؟ آخر کیوں؟

مے کھیلا اجوا پتھ پر کئی تیرتھ یاتری چڑھے جارہے تھے — چھوٹے لمبے موٹے یا دبلے، بچے بوڑھے اور جوان۔ قربانی کے لئے لے جاتے بکریوں کی میں میں دور تک گونج رہی تھی لیکن نہیں — آج تو لالچ کے مارے بونا سینگ ان کے پیچھے پیچھے نہیں جارہا — مگر کیوں؟۔ دوپہر میں بھی اسی کالی چٹان پر وہ پھول لئے ویسے ہی بیٹھا رہا تھا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے بعد برتن مانجھ دھو کر رسوئی گھر صاف کرنے کے بعد پدما نے یشودا سے کہا۔ ''میں پھول لینے جاؤں؟ دیوی کے سفید پھول چاہئے۔''

یشودا کچھ دیر تک بت بنی سی بیٹھی رہ گئی۔ پدما نے چٹان پر بیٹھے سینگ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اکیلی تھوڑے ہی جاؤں گی، وہ دیکھ سینگ بونا وہاں ہے، اسے بھی معلوم ہے سفید پھول کہاں پر ملتے ہیں۔''

ماں نے اوپر چٹان پر سینگ کو دیکھا تو مسکرا اٹھی۔ ''جا! جا! ہمیشہ اندھے کنویں میں کیوں پڑی رہتی ہے۔ جا! بیٹی!''

ہائے ہائے ندی کے اس پار آج کتنے جنگلی بطخ آ گئے ہیں۔ کیسے سندر اور خوبصورت لگ

رہے ہیں۔ ان کے پنجوں کی چھپ چھپ اور اترے آئی ناؤ کی چھپاک چھپاک یہاں تک سنائی دے رہی ہے۔

کٹیلے پیڑوں اور جرمن جھاڑوں سے گھری اس پگڈنڈی سے جب وہ ندی کے بالمقابل کنارے تک آئی تو اسے شمبھو دیو مشق کرتا نظر آیا۔

اچانک اس کا ہاتھ چھڑا کر سینگ ایک اجگر سا لپٹتا ہوا املی کے پیڑ پر جا چڑھا۔ اوپر سے اس نے شمبھو دیو کو ایک بیل کے نیچے کھڑے دیکھا تو یوں ہی ہنسنے لگا اور نیچے آکر چٹانوں پر کودتا پھاندتا اس طرف چل دیا۔

شمبھو دیو ایک پتھر پر گھس گھس کر کھڈگ کی دھار تیز کر رہا تھا۔ پیچھے سے چوپایوں کی طرح رینگ سرک کر پدما بھی وہیں آ پہنچیں۔ اس کی طرف مڑے بغیر شمبھو دیو خود کلامی کے انداز میں بولا ''یہ میرا اپنا کھڈگ ہے دیوی پیٹھ کا نہیں۔'' بلی (قربانی) دینے کے لئے سب سے اچھا ہتھیار ہے کھڈگ، تلوار، دھنس، اور آری سے بلی دینے کو شاستروں میں درمیانی اور استرے اور بھالے سے کاٹے گئے کو نچلے درجہ کا مانا جاتا ہے...... ان سب ہتھیاروں سے بلی کرنے پر بلی کرنے والے کی موت ہو جاتی ہے۔''

سینگ نے سان دیتے ہوئے کھڈگ کو چھوکر زوردار قہقہہ لگایا اور پھر جھوٹ موٹ بلی دینے کا ڈرامہ کرتے ہوئے شمبھو دیو کے سامنے پلٹی مار کر گر گیا۔

شمبھو دیو پدما کی طرف دیکھ کر مسکرائے، تبھی پدما گھلا لتر کے کچھ پتے توڑ کر اچانک پوچھ بیٹھی۔ ''دیو! میں اپنے جسم کا خون چڑھا کر دیوی کی پوجا کرنا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں دو ارمان ہیں......''

شمبھو دیو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کہنے لگے۔ ''شوکر، کرشن سار، شرب سنگھ، شودل، انسان اور خود کے خون سے چنڈیکا اور بھیروی کی پوجا کرنے کے تو اصول ہیں لیکن تم تو برہمنی ہو نا، تم اپنا خون دینے سے خودکشی کر کے گناہ کی حصہ دار بن جاؤ گی۔''

شمبھو دیو اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کے کلائی بندھ پر نظر ڈالی، کلائی اور مضبوط ! کل ہی اس مہینے پر تین بار وار کرنا پڑا۔ بے چارہ بلی دینے والا تو ادھ مرا ہو گیا ہے۔ اس نے دشمنوں کو مارنے کے لئے یہ بلی چڑھائی تھی۔ اچانک جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس طرح انھوں نے اپنے خون سے پوجا کرنے کی خواہش ظاہر کرنے والی اس لڑکی کو دیکھا۔

نورانی چہرہ جیسے چمک رہا تھا۔ گھٹنوں تک لہرانے بالوں کے گچھے جیسے دیوی کے بالوں کی یاد دلا رہی ہے..... اس کے پاؤں؟ ٹخنوں تک اونچی مونگا کی چوٹی سے جھانکتے دونوں پیر گائے کے دودھ جیسے جھک سفید اور سینے کا خون دیوی کو چڑھانے والی کا سینہ؟ اوہ..... آہ! ابھی ابھی جیسے برہمپتر میں نہا کر طلوع ہوئے ہیں دو دو سورج..... جگمگاتے ہوئے دو آفتاب جیسے پانی کے آنچل پر اپنی پہچان کراتے ہوئے سے.....

''بھاگوتی کی بیٹی پدما..... پدما ہو تم؟ سفید پھول ہی ڈھونڈنے آئی ہو نا، آؤ، میں تمھیں لے چلتا ہوں بتاتا ہوں کہاں ملیں گے سفید کند پھول..... دونوں چل پڑے۔ دونوں کے آگے آگے سینگ کودتا پھاندتا، ہوہو، ہی، ہی کرتا بڑھا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دور جانے پر انھوں نے دیکھا، سو یہ ہی بلی چڑھائے گئے بھینسے کے پرساد کو۔ گارو گاؤں کے لوگ، کاٹ کوٹ کر باندھ کر لے جانے کی تیاری میں ہیں۔ وہ اترنے لگے۔ ''ان کی ہے ہو'' آواز دور تک سنائی دیتی رہی۔ گھاس میں پڑے خون، چربی، کھر، پونچھ وغیرہ کی کھینچ تان کرتے وہ شور مچا رہے تھے۔

''یہیں پر کچھ صاف کیا تھا شاید..... ''خوشی کے لہجے میں شمبھودیو بتاتے گئے۔'' اس بھینسے کا ماتھا اتر کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اس لئے بلی دینے والی کی قسمت بلند ہے..... پرانے وقتوں میں شاستروں میں کہا گیا تھا۔ جانتی ہو؟ بھینس کے کٹے ہوئے ماتھے کی دونوں آنکھوں کے اگر آنسو گریں تو اسے بھی بلی دینے والے کی خوش بختی مانتے ہیں۔''

پھر دور سے ''ہے ہو، ہے ہو'' کی آواز سنائی پڑی۔ پھر پدما پر یا غمگین آہ کے ساتھ اٹھی، کٹے ہوئے ماتھے سے آنسو گرنے کے مطلب کو اذیت پانا نہیں ہوتا ہے کیا؟۔ ہائے! ہائے! اس بھینسے نے بھی کتنی اذیتیں اٹھائی ہوں گی۔''

شمبھودیو نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا..... خاموش۔

دیوی پیٹھ کے اس جگہ بڑا گھنا جنگل ہے املی، گھلا لتر، بھیلو، آنولی، پپا..... کیا نہیں ہے یہاں۔ سینگ اسے پکڑ کے سٹ کر تیز چلنے لگا۔ وہ بولی، میری پیدائش اسی جگہ پر ہوئی ہے مگر میں پہلے کبھی اس طرف آئی ہوں، ایسا یاد نہیں پڑتا۔''

''تم نہ سہی، تمھارے باپ ضرور آئے ہوں گے۔'' شمبھودیو بولے۔

''ایک بار دیوی آئے ہوئے ایک پروہت کو تمھارے باپ نے بیل کے پتوں کی ٹوپی اور گھنٹہ کرڑ کے مالا سے سجایا تھا۔ اس نے مندر کے پاس نہ رہ کر یہیں کیمپ ڈالا تھا۔ دوسرے

پروہتوں کی طرح پھل مول کھا کر تیاری نہیں ہوا تھا بلکہ اس کبوتر کا تازہ خون پیا تھا۔ اس نے اپنے جسم پر بینت مار مار کھال ادھیڑ ڈالی تھی۔ مجھے اب بھی اس لئے وہ واقعہ یاد رہ گیا ہے کیونکہ اس پروہت کے بھیروی کے سامنے تلوار پر ناچ کرتے کرتے پاؤں کٹ گئے تھے۔''

ہی، ہی۔ ہی! سینگ بونا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر بم بم بم بم ۔ کرتا ایک یاتری دَل منتروں کو پڑھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ تینوں آکر ایک گپھا کے سامنے ٹھہر گئے۔ اس طرف پیڑ لتر وغیرہ اتنے گھنے اور نیچے تھے کہ انھیں گھٹنے ٹیک کر آگے بڑھنا پڑا...... پھر دھیرے دھیرے بڑھتے رہے۔ اسی کے اندر کچھ دوری بڑے دو کند پھول......

''اس کے اندر؟''

''ہاں ہاں، اسی کے اندر یہیں''

سینگ بونا ڈر کے مارے چیخ پڑا۔ ''اس طرف تو اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''اندھیرا؟''

''ہاں ہاں بیل بوٹے جھاڑ اور کائی سے بھرے پتھروں کی وجہ سے اس طرف اندھیرا ہے مگر...... وہ کند پھول تو درگا چھند مستا کے سامنے جلتی دیئے کی لو کی طرح ہے جو اندھیری گپھا کو بھی روشن کر رہا ہے...... آؤ...... چلی آؤ، اندر چلی آؤ۔''

سینگ منمنانے لگا...... نہیں کسی شرط پر اندر نہیں جائے گا۔ وہ آگے ہی نہیں بڑھ پائے گا۔ اسے وہیں چھوڑ کر پدما پریا شمبھو دیو کے ساتھ سنہرے کند پھول اور اس کے پودے لانے کے لئے اندھیری گپھا میں داخل ہو گئے۔

پوئیں کی بیل یا باندر کے کووا کی، یہ کون سی بیل الجھ گئی سینگ کے بدن سے، سینگ بونا کھجاتا ہوا اچھل کود مچاتا ہوا باہر ہی رہ گیا۔ کٹیلے جھاڑ جنگلی پھول، تھے کے رام ہی پیڑ، بھیکوری کے پیڑ، بن چینی، ڈھیکیا اور گھلا لتا وغیرہ بیلوں سے گھرے گپھا میں اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کند پھول کی کھوج میں بڑھے جا رہے تھے۔ پدما پریا اور شمبھو دیو...... جنگل سے آتی مہک چاروں طرف پھیلی تھی۔ امبو واچی کی پا کی کے دن ایک سو آٹھ خوشبودار گھڑوں کے پانی سے جو مہک آتی ہے۔ ویسی ہی فضا معطر تھی۔ کہاں سے آ رہی ہے یہ مہک۔؟ دیوی کے پراسرار خون کی مہک...... آس پاس سے کسی جھرنے کی گل گل کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ یہاں سے لگ رہا تھا۔ جیسے برہمپتر کسی نئی دلہن کی سہاگ رات میں پہنی سکڑی سمٹی سی چادر میں پڑی ہے۔ ادھر باندر کے کووا کے لمس سے

مارے کھجلی کے سینگ بوناز مین پرلوٹ پوٹ ہوتا رہا۔

کند پھول کا ایک پودا ہاتھ میں لئے پدما پریا جب کھپا سے باہر آئی تو اس کے بال بکھر کر چہرے کو ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ تیز قدموں سے آ کر سینگ کے پاس کھڑی ہوئی۔ شمبھو دیو باہر نہیں نکلے لیکن ان کی سنجیدہ آواز سنائی پڑی۔

''یہاں پر سنہرے پھولوں کے پودے بھی ہیں۔ رتیوتا دیوی کے زیور جیسے سنہرے پھول — یہ جو باگھ کے ناخنوں جیسی کانٹوں والی لتا میں ہیں انھیں اپنی کھڈک سے کاٹ ڈالوں گا۔تم یہ راہ پہچان لوگی نا؟! یہ راہ ضرور پہچان پاؤں گی۔''

''یہ کس پھول کا پراگ لگ گیا اس کے بدن میں؟ کس کی مہک؟ رتیوتی دیوی کو نہلانے کے لئے گئے پانی کی سی مہک کیسی مہک؟ کس کی ہے یہ مہک؟ وسیع و عریض برہمپتر ندی کے سینے سے بہتی آتی تازہ خون جیسی یہ کس کی مہک ہے؟'' داہنے ہاتھ میں پھول کی پود اور بائیں ہاتھ میں کھجلی سے پریشان سینگ کو گھسیٹتی ہوئی پدما پریا تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑی۔

قربان گاہ لا کر چکلے گئے بھینس کے پیروں اور سینگوں میں رسی باندھ کر تیار کرنے والے لڑکوں کے چہرے کو اس نے دیکھا۔ ایک دل بھینسے کی گردن کی چمڑی کو نرم بنانے کے لئے گھڑے پر گھڑا پانی انڈیلے جا رہا ہے۔ اوہ، اوہ۔ بے چارے بے بسی سے چھٹپٹاتے بھینسوں کو سینگوں سے لے کر پاؤں تک رسی سے جکڑ رکھا ہے۔ کیسا بے بس اور لاچار ہے بے چارہ جانور۔

☆☆

وہ بھاگ کر شمبھو دیو پر ہی گری شمبھو دیو کے ہاتھوں سے کھڈگ چھٹک کر دور جا گرا۔ اس نے اپنے تیز ناخنوں سے شمبھو دیو کے سینے کو زخمی کر ڈالا ہائے ہائے! ایک بار بھی ایک لمحے کو کچھ سوچا نہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں شمبھو دیو کا خون

ہڑبڑا کر پدما پریا اٹھ بیٹھی کیا سپنا دیکھا! اے بھگوان اسے ایسا سپنا کیوں آیا؟ آدھی رات کو وہ ماں کے بچھونے کے پاس گئی اس کی مچھر دانی ہٹا کر ہلا ہلا کر جگایا۔ اور پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔ مچھر دانی ہٹا کر تیل دیے کی بتی کو تھوڑا اونچا کر کے یشودا بھی اٹھ بیٹھی اور ہائے ہائے کرنے لگی۔ ہائے۔ میری بچی کیوں رو رہی ہے۔ بول نا؟۔ کیوں؟ پیٹھ کا داغ بڑھ تو نہیں گیا؟ دیکھوں ذرا دیکھوں تو! اگر کچھ ہوا بھی ہے تو تجھے ہم شہر لے جائیں گے علاج کروائیں گے نا، رومت میری بچی،

ماں کا ہاتھ کس کر پکڑے ہوئے پدما پریا بولی۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے ماں، بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''اور مگر ڈر کیوں لگتا ہے بیٹی؟''

قریب والی کوٹھری سے بھاگوتی بھی اٹھ کر چلے آئے۔ ان کے کھڑاؤں کے کھٹ کھٹ کی آواز سن کر پدما یشودا کے گلے سے لپٹ گئی۔

بھگوتی نے ڈپٹ دیا۔ ''بٹیا، اندھیرے کمرے میں ڈرتی ہے تو تو کیوں نہیں سوتی اس کے پاس...... کیوں نہیں رہتی وہاں؟''

''نہیں نہیں مجھے ڈر نہیں لگتا، میں اکیلی ہی رہوں گی۔'' پدما پھر سسکنے لگی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر پڑ گئی۔ رات بھر ماں باپ زمین پر پڑے کیا کریں کیا نہ کریں سوچتے رہے۔ ایک بار بنارس میں سنسکرت پڑھ رہے بھائی چندر ناتھ کو بلانے کا خیال بھی آیا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا۔

☆☆☆

ڈھاں، ڈھاں .... بھینپو ...... بھینپو۔ بجاتا ہوا ایک دَل دیوی پیٹھ سے نیچے اتر رہا تھا۔ شنگا، گھنٹہ اور بھونپو کی آواز سے ہر سمت گونج اٹھی۔ کھلی جگہ کے سارے لوگ شور مچاتے ہوئے باہر نکل آئے ...... بھینپوں...... ڈھاں ڈھاں ڈھاں.. ہاتھ میں کُش اور تلسی مالا لئے نند کمار دولوئی ہتاتی خاندان بھر کے لوگوں کے ساتھ اتر رہے ہیں۔ اپنے آبا واجداد کے ساتھ مردوں کے شرادھ کا کام پورا کر کے وہ پنڈ دان کے لئے شو بھایاترا میں ندی کی طرف جائیں گے، قد آور صحت مند اور گورے صاحب سے..... نند دولوئی ...... آج کل تو اپنے نیچے والوں کو رشتہ دینے کا رواج چل پڑا ہے۔ ان کی یہ لڑکی بھانومتی دکن میں بھاری زمین جائداد والوں کے گھر بیاہی ہے۔

پنڈ دان دیکھنے کے لئے جمع ہوئی بھیڑ میں لوگوں کی کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ ''بڑی زور دار شادی ہو گی دیکھنا! آج صبح سے لوگ اوپر چڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ دیکھو کیسے چیونٹیوں کی اٹوٹ لائن کی طرح آتے جا رہے ہیں۔''

یشودا اب تک اوپر جا چکی تھی ۔نند ودلائی۔ کی بیوی کے ساتھ ان کا میل جول تھا۔ پدما بھی اپنے باپ کے ساتھ باہر نکلی۔ اچانک ایک چیخ کے ساتھ پدما گھر میں جا گھسی۔ بھاگوتی کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس نے بھونیشور کو دیکھ لیا۔ ہاں وہ بھونیشور ہی تو ہے اس جلوس کے ساتھ، ہاں ہاں وہی ہٹھا کٹھا چہرہ مہرہ، گھنے بال ۔ گھنی مونچھیں سب کچھ ویسا ہی۔ شانتی پوری دھوتی کی کناری کا رنگ

تک صاف دکھائی دے رہا ہے۔ کتنے شوق سے اسے داماد بنا کر لائے تھے۔ شاستری باتوں پر اس کے ساتھ کتنی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ گومید یعنی "پکال اتجصلک" کے بارے میں ہمیشہ بحث ہوتی تھی۔ مصیبت کے وقت حفاظت کے لئے اور حسد، غصے، اور نفرت کو دور کرنے میں مددگار گومید پہننا عورتوں کے لئے فائدہ مند رہتا ہے یا مرد کے، اس بات کو لے کر سسر داماد میں گرم بحثیں ہوتی تھیں! گائے کے گوشت کے سے رنگ کے اس پتھر کی انگوٹھی انھوں نے اسے دی تھی۔ شاید وہی چمک رہی ہے۔ جنم کنڈلی میں راہو دوش تھا۔ کرم ناش اوباش اوہ، ہو اوہو۔ سے ساری بات یکا یک یاد آ گئی۔ وہ دیکھو..... دیکھو اس طرف سے نظریں بچا رہا ہے۔ لوگوں سے بچ چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

'حرام زادہ..... حرام زادہ کتا کہیں کا تیرا الو تیرا خاندان برباد ہو۔ منہ پر آ رہی ہے؟ رام رام..... اس بڑھاپے میں زبان پر ایسی باتیں؟ چھی، چھی، چھی۔

گھنٹے کی دھن دھن نیچے تک بکھر گئی، شہد کی مکھی کی طرح گن گن کی طرح بھیڑ کی گنگناہٹ بھی دھیرے دھیرے نیچے کی طرف اتر گئی۔

بھاگوتی بڑے دکھ سے بولے۔" اے پدما! اس اندھیرے کنویں میں پڑی پڑی تو کنکال بن جائے گی۔ بس! وہ جب ادھر آیا ہی ہے تو موقع دیکھ کر بات چیت چلانی پڑے گی۔ بانو رہاٹ جیسے گاؤں میں برہمن سوامی کے یہاں دو دو تین تین بیویاں چین سے ایک ساتھ رہتی ہیں کہ نہیں؟ سب ساتھ مل کر سکھ چین سے زندگی بتاتی ہیں۔"

پدما پریا۔ سچ مچ شادی میں جانے کے لئے راضی ہو جائے گی۔ یہ بھاگوتی نے سوچا تک نہیں تھا۔

وہ، وہ یہیں دروازے پر کھڑی ہے۔ بھاگوتی کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اپنی شادی کا جوڑا، پاٹ کی میکھلا چادر آج اس پر کتنی سج رہی ہے اور سر پر یہ کیا ہے؟ وہ بشا دھاری ویشنوئی مرد کو موہنے والا جو منتر سکھائی گئی تھی۔ سیندور دے گئی تھی، وہی سیندور؟ شوہر کو بس میں کرنے کا گورو چند سیندور، اور کلیجے کے خون سے تیار کئے سیندور کی جگمگاتی بندی۔ یوں چامنڈا کے خون کے لال رنگ کی آنکھوں کی طرح چمکتی ہوئی بندی! ہاں ہاں! یقیناً کسی وشنوی کو بس میں کرنے کا نشان۔ کیسی چمک رہی ہے اس کے ماتھے کی بندیا۔

بھاگوتی لوٹنے کے انداز میں چلائے!" بٹیا، اری بٹیا! کیا تو سچ مچ وہاں جائے گی؟"

پھر آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔''میں تو تجھ سے مذاق کر رہا تھا۔— میں نے تو ایسے ہی ''

پدما سر جھکا کر باپ کی باتیں سنتی رہی مگر کوئی جواب نہیں دیا اور بات جیسے ہی ختم ہوئی، تیزی سے اوپر کی طرف چل دی۔ پچھلے دو سال میں اسے کسی نے اتنی تیزی سے چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پتھر کے بت کی طرح بھاگوتی وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

شادی کی جگہ پر قدم رکھتے ہی ساری کی ساری آنکھیں اسی کی طرف مڑ گئیں۔ پچھلے دو سالوں میں وہ کسی شادی بیاہ میں تو گئی بھی نہیں۔ آج وہ سماج جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شوہر کے چھوڑی ہوئی اس دیوی پیٹھ میں وہی پہلی لڑکی ہے...... صرف وہی...... اوہ! یہ کیسی نظریں گھور رہی ہیں اسے اس کے سارے کپڑے لئے اتار کر اسے سب کے سامنے ننگا کرنے کا ہی جشن لگ رہا ہے یہ۔

ٹھیک وقت پر لاں وڑ نے آکر اسے بچالیا۔'' آجا! تو چل، ادھر پان تمباکو کاٹنے والے کمرے میں چل کر بیٹھ، یہاں نہیں'' پان تمباکو کاٹ کر رکھنے کی جگہ ذرا الگ تھلگ سی تھی۔ برہمپتر سے پانی والے راستے کے قریب ہی تھی یہ کوٹھری۔ جس کے باہر پتھر کی سیڑھیاں بنی تھیں، یہاں سے کھانے پکانے والی عورتیں لگاتار آجا رہی تھیں۔ کھانے کے لئے مارے گئے بکروں کی کھال بھی کسی ادھر راستے میں ہی پھیلا رکھی تھی۔ گئو دھولی ہونے کو تھی۔ ڈھول تاشے بجانے والے اور دوسرے لوگوں کے شور شرابے میں کان بہرے ہو رہے تھے

دونوں سہیلیاں ٹاپ سیڑھیاں نیچے اترنے لگیں چاندنی رات تھی۔ برہمپتر سے نکلی کسی فوراً نہائی سولہ سال کی لڑکی کے روشن پستان سا آسمان کا پورا چاند اب بالکل نمایاں تھا۔

بھینیو، بھینیو، دور سے پھر آواز آئی۔ سیانی عورت کی طرح لاں وڑ نے دھیرے سے کان میں کہا۔'' صرف منھ سے نہیں، من سے تن سے ہر طرح بات کرنا۔ لڑکی جب اپنے عاشق سے اس طرح محبت کا اظہار کرتی ہے۔ بت گھمنڈ، ضد، غصہ، خودداری سب کچھ ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جاتا ہے۔ کبھی! ارے ایسے میں ایسے ایسے شیر تو چوہے بن جاتے ہیں۔'' پدما لا جواب ہو گئی۔ لاں وڑ بھونیشور کو لانے اوپر چلی گئی...... دیوی پیٹھ کے اوپر جیسے چاندی رات کی کوئی ایشوری لیلا پھیلی جا رہی ہے۔ پانی میں روپہلی بالو پھیلاتی کل کل آواز میں جیسے دیوی خود ناچ کر رہی ہیں۔ ان کے سینے پر بندھی ہے کند پھولوں کی چولی ...... اوہ...... کند پھول ...... ہاں یہ دیکھو چاروں طرف

چمکتے ہوئے سفید کند پھول ہی تو بکھرے پڑے ہیں۔ دیوی کے سینے پر بھی کسی ہوئی سفید کند پھولوں کی باندھنی۔

ڈھاں ڈھاں۔ بھیپو، بھیپو۔ ——— پنڈت پانی لے کر اوپر آ چکا تھا۔ جنگلی خطرناک جانوروں کے سے لپکتے ہوئے آ پہنچے لاں وزا اور بھونیشور ——— لاں وزا نے پان تمباکو کاٹنے کے لئے آئے نوکروں کو دروازے پر ہی اوپر جان کے لئے کہہ دیا۔

دونوں مونڈھے لے کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ——— نہیں۔ نہیں بھونیشور سر اٹھا کر نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ بس بے بسی میں کہے جا رہے ہے۔ ''کیوں لائی؟ یہاں کیوں لائی؟''

لاں وزا اس سے کچھ نہ کہہ کر پدما پریا سے بولی ''پدما سن! اس سے جی کھول کر سب کچھ کہنا، ساری باتیں صاف کر لینا، اور چاہے تو بھرپور طاقت سے گال پر ایسا چانٹا جڑنا کہ یاد رکھے۔''

بھونیشور جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ''لاں وزا! کیا کہا، کیا کہا تو نے'' کہتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔

مگر پدما؟ پدما یہ کیا کر بیٹھی؟ کیسے اتنی ہمت جٹا پائی؟ پلک جھپکتے ہی اس نے بھونیشور کے پاس جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پدما کے ہاتھ کے لمس سے اور اس کے اس غیر معمولی ہمت سے بھونیشور کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جاتا جاتا وہ پھر دھپ سے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اس گڑبڑی اور ہڑبڑی میں موقع پا کر لاں وزا وہاں سے کھسک لی۔

پدما پریا نے اب بھونیشور کے ایک ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر رو دھو کر اس کا سسکنا کم ہوا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ذرا دیکھو تو میری پیٹھ کا داغ، ذرا بھی بڑھا نہیں ہے، یہ دیکھو، دیکھو نا!''

''ارے ارے! وہ کیا کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی اپنا سینہ بند کھول دیا۔ اوہ! اوہ، یہ ہو کیا رہا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے اس کے سامنے، چاندنی اور مٹی کے دیئے کی روشنی میں اس کا گدرایا جسم سونے سی چمکتی ہوئی بھونیشور کی آنکھوں کو چکا چوند کرنے لگا ——— نہیں ——— نہیں۔

یہاں زیادہ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں ہوگا، ویسے بھی سب لوگ یہاں اس کو چھوڑ دے جانے کی بات جانتے ہی ہوں گے۔

ہاں ہاں! سبھی لوگ ——— سبھی لوگ جانتے ہیں

بھیپو بھیپو کرتے پھر لوگ پاک پانی لینے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو، وہ جنا میں روایت کے مطابق دولوئی سوامی کی موت کے بعد ان کی بیویاں جس چبوتروں سے ندی میں کودی تھیں وہ

چٹانیں اب بھی پانی سے اوپر نکلی جل بستیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ برہمپتر کی تیکھی لہریں، دوپہلی تلوار بن کر ان پر وار کرتی جا رہی ہیں۔

پدما پریا اور بھونیشور بھور ہونے تک یعنی دلہا دلہن کے گاجے باجے کے ساتھ نیچے چلے جانے تک اسی کمرے میں رہے۔

جس دن بھونیشور نے آکر بھاگوتی کے آنگن میں قدم رکھا یشودا اور کچھ یجمان آکر سامنے حیرت انگیز طور پر کھڑے رہے۔ صرف یشودا کیوں، اڑوس پڑوس کے جس نے سنا وہ مارے تجسس کے چوتال میں دوڑا چلا آیا۔ کسی یجمان نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بڑا پیڑھا لا کر بھونیشور کو بیٹھنے کو کہا۔

بھاگوتی اس وقت ناد کے کنارے ہاتھ پیر دھوکر پوجا کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ خبر پا کر وہ ننگے بدن ہی دوڑے چلے آئے۔ بھیڑ کو ڈھکیلتے ہوئے بھونیشور کے سامنے آ کھڑے ہوئے، غصے سے کانپتے ہوئے بولے۔ ''اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

بھونیشور کچھ نہیں بولا۔ نندو لوئی کی بیٹی کی شادی میں شاید دونوں بات کر چکے ہوں۔

''ہاں کر چکے ہیں۔''

''تب لینے کا فیصلہ کر کے ہی آئے ہوگے۔''

بھونیشور نے سر جھکا لیا۔ آس پاس اکٹھا ہوئے جوان بوڑھے سب کے منہ کھلے کے کھلے تھے اور کان کھڑے تھے کہ اب بھونیشور کچھ بولے۔ اب کچھ کہے تب کچھ کہے۔ اس نے جیب سے جوتے کا ایک جوڑا نکالا اور بھاگوتی کے پیروں کے پاس رکھ دیا۔ یشودا رو پڑی۔ ''یہ ٹھیک نہیں۔ یہ اچھا نہیں کر رہے ہو، ایک لڑکی کو آکر سامنے کے دروازے لے آئے ہو تو دوسری کو پچھواڑے دھکیل دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لڑکیاں کوئی بازار کی گائے بکری تو ہیں نہیں نا!''

بھیڑ میں سبھی نے سر ہلایا اور ایک واز ہو کر بولے۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا، گھورکل نیک ہے گھورکل نیک''

بھونیشور نے ہاتھ اونچا اٹھا کر سبھی کی منظوری لینے کے لہجے میں کہا۔ ''پدما پریا کو تو میں لے جاؤں گا مگر اس کے لئے مجھے تھوڑا وقت چاہئے۔ اصل میں پدما کے بعد میں بنگرا کی ایک لڑکی لے آیا تھا، اسے راضی کرنا پڑے گا... وہ راضی ہو جائے گی... بڑی سیدھی لڑکی ہے...''

بھیڑ میں پھر آہ! اوہ! ہائے! سنائی دینے لگا۔ جیسے سبھی کو یکبارگی اس نئی نویلی لڑکی کے

لئے ہمدردی محسوس ہو رہی ہو۔ بھونیشور کچھ دیر تک خاموش رہا۔

بھاگوتی نے بٹوے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔"اس میں کیا ہے؟"

"کچھ روپے ہیں اس کے خرچ کے لئے۔"

آس پاس کھڑے سب جوان بوڑھے زور سے ہنس پڑے۔ جیسے کہ رہے ہوں۔"دوسال بعد جا کر خرچ کی بات یاد آئی۔"

اس دن تو بھونیشور زیادہ دیر نہیں رکا۔ چائے، پان تمبا کو لے کر ہی واپس چلا گیا۔ جاتے وقت اسے پدما سے ملنے میں بھی جھجک ہوئی کیونکہ سارے کے سارے لوگ منھ پھاڑے وہیں کھڑے تھے۔ بعد میں بھونیشور اکثر آنے جانے لگا۔ پہلے پہل بیٹھک میں ہی بیٹھ کر بات کرتا تھا۔ بعد میں پدما کے کمرے میں بھی جانے لگا۔

آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آ گیا۔ کبھی کبھار بھونیشور کے ساتھ اس کے کچھ دوست بھی آنے لگے۔ جوان ویدھ مہیندر، ہاتی کا محلا دار دیا رام وغیرہ بھونیشور کے ساتھ ساتھ بھاگوتی کے گھر آیا کرتے تھے۔ چائے پانی پی کر پان تمبا کو کھا کر گپیں مارتے ہوئے کبھی کبھی آدھی رات کے بعد ہی لوٹ پاتے تھے..... پدما پریا بھی آہستہ آہستہ ان سے کافی کھل گئی۔

.....پھر بھاگوتی کے برآمدے میں ہی تاش کا اڈہ بھی جمنے لگا۔ اڑوس پڑوس کے دو ایک نوجوانوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ پدما پریا کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے میں انھیں جیسے شراب کے نشے جیسا ذائقہ ملتا تھا۔ وہ بھی کلکتے کی راس بہاری لین یا مرزا پور اسٹریٹ کے بنگالی بابو کی طرح کندھے پر شال ڈال کر، بیچ کی مانگ نکال کر"بابو" بن کر آنے لگے۔ اتنے دنوں شمشان سے خاموش گھر میں پھر سے جیسے سورج کی نئی کرن آ پڑی۔ موقع پا کر بھونیشور بھی اب بغیر کسی رکاوٹ کے پدما پریا کے کمرے میں چلا آتا تھا۔

کارتک مہینے کے شکل پچھ کی چاندنی میں بیٹھک میں بھونیشور وغیرہ تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھول کر پدما بھاگتی سی پچھواڑے کی طرف جانے لگی۔ مگر بیچ میں ہی وہ آنگن میں بیٹھ گئی۔ اور قے پر قے کرنے لگی۔

"ہائے ہائے، کیا ہو گیا میری بچی کو؟" کہ کر یشودا اسے کھینچ کر کنویں کے قریب لے گئی۔

لوگ باگ تاش کھیلنا بند کر کے ایک دوسرے کا منھ تاکنے لگے..... پھر سب کی نظر ایک ساتھ بھونیشور..... وہ پیر پٹکتا ہوا بھاگوتی کے کمرے میں چلا گیا۔ اس دن پھر تاش کا کھیل نہیں جم

پایا۔ سب کو لگا بات سنجیدہ ہے۔ ہاں! بات تو سنجیدہ ہی تھی۔

سو بھاگیہ لکشمی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھونیشور نے سارے بزرگوں کے سامنے یہ بات قبول کی کہ پدماپریا کے رحم میں اس کی اولاد ہے۔ بڑے بوڑھوں کو ہاتھ جوڑ کر سلام کر کے اس نے اپنا الزام قبول کیا۔ اس کے بعد ایک کالے بکرے کی بلی دے کر دیوی درشن کر کے وہ نیچے اتر گیا۔

بے حد خوشی خوشی وہ نیچے آیا تھا۔

فکر مند بھاگوتی دھیرے دھیرے اتر رہے تھے۔ ان کی صحت کافی گر گئی تھی۔ وہ سوچ میں ڈوبے تھے۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ سچ مچ سارے مسئلے کا اتنا آسان حل ہو سکتا ہے کیا؟ اتنا سنجیدہ مسئلہ جو دو برسوں سے انھیں اندر اندر ہی کھائے جا رہا تھا! یہ کیسا یگ ہے؟ کیسی باتیں ہیں؟ ہے مہامایا..... یہ کیا دیکھ رہا ہوں میں؟

یشودا نے بلی کا پرساد پکا کر سب کو دیا... پھر سارے کپڑے لتے بکسے وغیرہ لا کر اس نے باہر برآمدے میں رکھے..... پھر چوپال ایک بار بھیڑ سے بھر گیا۔

کچھ دیر بعد پدماپریا نے ماں کو پکارا۔ ''ماں، انھیں ذرا یہاں بلانا تو!''

''ارے جانے کے وقت اب کیا کام آ پڑا؟''

''اوہو کہہ رہی ہوں نا، بلا، جلدی بلا.....''

بھاگوتی کے کمرے میں مہمانوں سے باتیں کر رہے بھونیشورر کو یشودا نے آنکھ کے اشارے سے باہر آنے کو کہا۔ وہ باہر آیا تو دھیرے سے بولی۔ ''وہ کچھ کہنا چاہتی ہے''

''اب کیا کہنا ہے؟''

''میں کیا جانوں، اسے جاتے جاتے کیا یاد آ گیا۔''

خیر بھونشیور اس کی کوٹھری میں گیا۔ دیکھا..... وہ پہن اوڑھ کر تیار ہو گئی تھی۔ ماتھے پر لال سیندور کی بندیا جگ مگ کر رہی تھی۔ لال..... بالکل بلی کے تازے خون سے لال.....

''کیا بات ہے؟''

''ایک بات کہنی ہے، پہلے دروازہ بند کرو''

دیوی پیٹھ سے ڈھول تاشے کی تیز آواز ساری فضا میں گونج رہی تھی۔ ہاں..... ہاں۔ بھینسے کی بلی دی جا رہی ہوگی..... لوگ بھینسے کی گردن پر گھڑوں پانی ڈالے جا رہے ہوں گے۔ .....شاید۔

''ارے بتاتی کیوں نہیں کیا کہنا ہے؟''

بھونیشور سے کچھ دور جا کر وہ دیوار سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔ جوڑا کھول کر سارے بال منھ کندھوں اور پیٹھ پر بکھیر لئے۔ اس کی دو کجراری آنکھیں حیرت سے پھیل کر اور بھی بڑی بڑی تکنے لگیں سینہ چڑھنے اترنے لگا۔ وہ ہانپنے لگی

ایک ایک کر کئی دیویوں کے چہرے بھونیشور کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے کالی، تارا، مہاودیا، بھونیشوری

وہ بولی۔ ''اچھا تو آپ اولاد کو اپنی بتاتے پھر رہے ہیں۔''

''ہاں کہہ رہا ہوں اور کہوں گا بھی دو منھوں سے ''

''یہ اولاد آپ کی نہیں ہے۔''

''کیا ؟''

''یہ اولاد آپ کی نہیں ہے!''

''میری نہیں؟''

جھپٹ کر وہ قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پاگل کی طرح پوچھنے لگا۔

''کون ہے؟ بول وہ کون ہے؟ کس کی اولاد ہے یہ؟''

''یہ اولاد بلی دینے والے شمبھو دیو کی ہے۔''

ش م، بھو د۔ یو ''دروازے پر لڑھک گیا بھونیشور۔

☆☆☆

اندرا گوسوامی کی پیدائش کامروپ، گوہاٹی (آسام) میں ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ نیل کانتی برج'' اہیرن سنسکار دے بھانر چڑتز' وغیرہ ناول۔ آدھا لکھا دستاویز، خود نوشت۔ 'جرے ایک ندی نامز' کہانی کا مجموعہ۔ وغیرہ ۲۷ کتابیں۔ ساہتیہ اکیڈمی انعام اور دوسرے کئی بڑے انعامات۔

آئینہ فروشِ شہر کوراں
قرۃ العین حیدر

میں تسبیح پڑھتا ہوں اس کی کہ جو بادشاہ اور عالم ملکوت کا صاحب ہے۔ اس بادشاہ کی جو نہیں سوتا اور اور نہیں مرتا ہے وہ بہت طاہر اور بہت پاک اور فرشتوں اور ارواحوں کا پروردگار ہے۔

اور ثریٰ ایک سبز پتھر کا نام ہے اور نیچے ثریٰ کے دوزخ کو بنایا۔ اور اس میں ایک سردار کہ مالک اس کو کہتے ہیں۔

اور اسی وقت ایک زلزلہ زمین ار پہاڑوں پر آیا اور حضرت جبرئیل نے کہا سات ہزار برس کے آگے سے آدم کے ایک پتھر ستر ہزار من کا کنارے پر دوزخ کے پڑا تھا۔ وہ پتھر پندرہ ہزار برس سے نیچے کی طرف لڑھکتا چلا جاتا تھا ابھی قعر حطمہ میں پہنچا تھا۔ اسی کی آواز تھی اور وہ جگہ منافقوں کی ہے۔

اور جب آدم بہشت سے نکلے صرف ایک ٹکڑا لکڑی کا مسواک کے واسطے لیا۔ جس جس طرح لوگ کہتیں "اوور نائٹ" جانے کے لئے ٹوتھ برش اپنے بیگ میں ڈال لیتے ہیں۔ اور زمین پر آکر جب آدم نے ہل جوتا اور بیل کج چلنے لگا تو حضرت نے اس پر لکڑی ماری اور بیل نے کہا "اے آدم تو مجھے کیوں مارتا ہے۔ اگر تجھ میں عقل ہوتی اس دنیا میں نہ پھنستا۔"

الغیاث۔ الغیاث۔ مہلا ئیل بن شیث بن آدم کے انتقال کے بعد لوگ ان کی زیارت کے لئے آتے رہے۔ فرزندان مہلا ئیل نے ابلیس کے کہنے پر اپنے والد کا بت بنا کر برقعہ اس پر ڈالا اور لوگ اس کی زیارت کرنے لگے اور عالم میں بت پرستی پھیلی پھر اس قوم میں ادریس پیدا ہوئے پڑھانے کی کثرت سے لقب ان کا ادریس ہوا۔ علم نجوم ان کے معجزات میں سے ہے۔ اور آپ درزی کا کام کرتے تھے۔ قوم ان کی پھر بت پرستی پر راغب ہوئی۔ بعد چار سو سال کے نوح آئے۔ کہ اپنی قوم کی حالت پر نوحہ بہت کرتے تھے اور جب بڑھیا کے تنور سے گرم پانی نکلا اور طوفان۔

اور قوم عاد اور ہود پیغمبر۔ اور ساتویں زمین پر ایک ہوا ہے نام اس کا ریح العقیم ہے۔ ستر ہزار زنجیروں سے اس کو باندھ رکھا گیا۔ اور ستر ہزار فرشتے اس پر محافظ ہیں۔ جب روز قیامت وہ ہوا

چھوڑی جاوے گی پہاڑوں کو مانند ریزہ ابریشم کے اڑادے گی۔ اسی ہوا نے ظالم قوم عاد کو برباد کیا۔

بعدہ صالح پیغمبر کو قوم ثمود پر --- بعد اس کے فرشتوں نے شہر شہرستان لوط کا قصد کیا۔ حضرت ابراہیم نے کہا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ مت آیئے۔ ہم اس شہر کے لوگوں کو ہلاک کرنے جاتے ہیں۔ عذاب کو دیکھنے کی تم میں طاقت نہ ہوگی۔

اور ان شہروں کی شاہراہوں پر مرد و زن کے گروہ علاحدہ علاحدہ پرچم بلند کئے نعرہ زن چلے جاتے تھے ان تختیوں اور پرچموں پر ایک اجنبی زبان میں Gay Lib مرقوم تھا اور قوم موسیٰ اور قوم عیسیٰ کے فقیہ اور مدرس اپنے کتب خانوں اور چھاپے خانوں میں اس اس اصطلاح کی تاویل، تفسیر و دفاع میں مشغول تھے۔ فرشتے اس منظر کی تاب نہ لاکر الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

الامان۔ الامان۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو مقام کریم فرمایا تھا اور تم نے اسے مقام عذاب میں بدل دیا۔ اور صبح سے شام تک سب دیوار کو آکر چاٹتے ہیں مگر اس کو توڑ نہیں پاتے۔

سکندر ذوالقرنین قاف سے قاف تک گیا پر کوئی معاملہ درست نہ کر سکا۔ دو آدمی دو دو کے تھے۔ بے حد۔ بے شمار ان کی قوم کو یاجوج ماجوج --- اولاد یاجوج ایک پہاڑ پر رہتی ہے اور اپنی مردم شماری نہیں کرواتی اور عدد ان کا سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اور سب زرد رو اور پست قد۔ اولاد ماجوج دوسرے پہاڑ پر۔ سفید فام اور سرو قامت و قوی ہیکل۔ دونوں اقوام کوئی دین و مذہب نہیں رکھتے اور خدا کو نہیں جانتے اور اب کچھ عرصے سے ایک دوسرے سے بھی برگشتہ ہیں۔ اور تب کھڑی ہوئی درمیان یاجوج ماجوج کے دیوار موٹی۔ اور بہت سوں نے ان کو بہت سوں سے بچا پایا۔

خبر میں آیا کہ لقمان حکیم بن باعور نے وصیت کی اپنے بیٹے کو کہ قائم کر نماز اور لوگوں کی طرف غرور سے نہ دیکھ اور نرم کر اپنی آواز کہ بہ تحقیق ناپسندیدہ آواز گدھے کی ہے۔

اور سلیمان بن داؤد کے بیٹے بطشا بن حنا کے بطن سے، ایک دن مع اپنے وزیر آصف (جس کے نام پر بعد میں شاہان عالم اسلام نے اپنے وزیروں کو آصف الدولہ اور آصف جاہ پکارا اور نام جنرل موشے دیان کے فرزند کا بھی یہی ہے) تخت پر بیٹھے ہوا میں جاتے تھے۔ وزیر اعظم آصف دیو بھی ساتھ تھا اور سب دیو پری جنات گرد بہ گرد تخت کے مودب کھڑے تھے اور پرندوں کے جھنڈ ان کے سر پر اپنے پروں سے سایہ ڈالے تھے اور ہوا نے تخت کو اس زمین پر سے جا گزرا جہاں چیونٹیوں کی بستی تھی۔ کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو.......... گھس جاؤ اپنے گھروں میں نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اس کا لشکر۔ اور ان کو خبر نہ ہو۔ پس مسکرائے سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی

بات سے اور شاہ مور کو پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پوچھا اے شاہ مور تم نے اپنے لشکر کو کیوں کہا کہ سلیمان آتا ہے اپنے غاروں میں گھس جاؤ۔۔۔۔۔۔ پھر حضرت نے پوچھا سلطنت تمہاری بہتر ہے یا میری؟ چیونٹی نے کہا۔ میری بادشاہی بہتر ہے یا تمہاری ہے۔ کیونکہ ہوا اٹھاتی ہے تمہارے تخت اور بساط کو اور تخت اٹھاتا ہے تم کو۔ اوس پر تم بیٹھتے ہو۔ یہ اتنا تکلف ہے تمہاری بادشاہی میں، سلیمان نے ہنس کر پوچھا تم کس طرح یہ جانتے ہو۔ شاہ مور نے جواب دیا، اے سلیمان اللہ نے صرف عقل تم کو نہیں دی۔ ہم ناتوانوں کو بھی کچھ عنایت کی ہے۔

اور یعقوب نبی کہ راتوں رات اپنے بھائی عیص کے ڈر سے شام کی طرف نکل گئے تھے اس لئے نام ان کا اسرائیل ہوا اور یعقوب بہ سبب عقب ہونے عیص کے یہ حال سب توریت میں بھی مرقوم ہے۔

اور زکریا پیغمبر کہ خدا کا ہر وقت ذکر کرتے تھے اور بیٹے ان یحیٰی جن کو اہل فرنگ John بولتے ہیں، پہاڑوں پر روتے چلاتے پھرتے تھے۔ خدا کی محبت اور دوزخ کے خوف سے۔ اور بہت وحشت میں پڑے تھے عمر اس وقت ان کی سات برس کی تھی مسجد میں جا کے گوشہ اختیار کیا اور قوم بنی اسرائیل نے فساد بپا کیا اور بے شرع چلنے لگے۔ اور جرجیس نبی کہ مشرک ان کو جارج (George) پکارتے ہیں اور حنہ کہ فرنگستان پہنچ کر یہ نام Anne ہوا اور حنہ کی بیٹی مریم عذرا۔

خبر میں آیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اپنی ماں کو لے کر بیت المقدس سے شام جاتے تھے راہ میں بی بی مریم پڑیں چونکہ وے سوائے بیخ گیاہ کے اور کچھ استعمال نہ فرماتی تھیں۔ عیسٰی سے بولیں اے بیٹے مجھ کو وہی لا دے۔ وہ اپنی ماں کو اس جگہ چھوڑ کر اس جڑ کو لینے گئے۔ بی بی مریم نے اس میدان میں وفات پائی۔ اور خدا کے حکم سے بہشت کی حوروں نے آن کر ان کو غسل دیا اور بہشت کے کپڑے سے کفنایا اور اسی جگہ دفن کر کے چلی گئیں۔ اور بعد اس کے عیسٰی نے آن کر اپنی والدہ کو دو دفعہ پکارا۔ کہیں سے جواب نہ ملا۔ تیسری پکار میں جواب دیا۔ لبیک اے بیٹا کیوں بلاتے ہو مجھے، حضرت عیسٰی نے کہا اے امی جان۔ تین دفعہ پکارا آپ کہاں تھیں؟ جواب آیا۔ بیٹے پہلی پکار میں میں فردوس اعلیٰ میں تھی دوسری پکار میں سدرۃ المنتہٰی میں۔ اور تیسری پکار آسمان اول سے آ کے میں نے جواب دیا۔

اور قصہ وقیانوس شاہ روم اور اصحاب کہف کا۔ ایک جنگ میں اپنا دشمن بادشاہ قتل کر کے اس کے لڑکوں کو قید کیا۔ اور ان سے اپنا ہاتھ رومال صاف کرواتا تھا۔ اور خود کو سجدہ کرواتا تھا۔ ان

پانچوں شہزادوں نے آپس میں صلاح مشورہ کی کہ ہم پر واجب ہے کہ اس کی خدمت سے باز رہیں۔ وہ جب وہ ملعون چوگان کھیلنے جائے گا البتہ ہم کو بھی لے جائے گا۔ میں چوگان میدان سے باہر پھینکوں گا تم سب ہمارے پیچھے بہانا چوگان میدان سے نکل چلیو۔ بس اس طرح سے وے اس میدان سے نکل بھاگے۔ صبح کو گھوڑوں کو چھوڑ کر ایک شہر کے کنارے پہنچے وہاں چند گڈریے تھے۔ وے بولے۔ اے عزیزو تم کہاں جاتے ہو۔ انہوں نے کہا خالق ارض وسما کی طلب کو جاتے ہیں۔ گڈریوں نے بھی صحبت شاہ زادوں کی اختیار کی۔ اور گڈریوں کا کتا بھی ہم راہ ہو لیا۔ شہزادے بولے اس کتے کو ہنکار دو تو بہتر ہے ورنہ یہ بھونکنے لگے گا اور لوگ آ کر ہمیں پکڑ لیں گے۔ تب بکریوں کے گلہ بانوں نے کتے کو مارا پیٹا وہ لہولہان ہو گیا مگر اس نے ساتھ نہ چھوڑا۔ اللہ نے اس کو زبان دی۔ اس نے کہا اے یارو مجھے مت مارو۔ تم جس کے بندے ہو میں بھی اس کا تابع دار ہوں۔ پس وہ کتے کو باری باری اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے چلے۔ تمام رات چلا کیے۔ جب روز روشن ہوا سب جا کر ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہو گئے اور نام ان کے یہ ہیں مکسملیان۔ املیخا۔ مرکوش۔ ا۔ نوازنسش۔ سالینوس۔ سالینوس۔ اریطانس۔ نفسطوطس۔ خصسطوطس۔ کشفوطط۔ یارطوس اور کشفوطط کا نام کشف طیط بھی آیا ہے اور کتے کا نام قطمیر تھا۔ قاموس میں یہی لکھا ہے۔

اور نینوا کے پیغمبر یونس کہ نسل ہود سے تھے وہاں قوم ثمود کی تھی۔ سب نافرمان تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے یونس کو مچھلی کے پیٹ میں گرفتار کیا وے پکارے لا الٰہ الا انت سبحنک انی کنت من الظالمین۔ پس پکار اٹھے اندھیروں کے کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے۔ تو بے عیب ہے۔ بیشک میں تھا ظالموں میں۔

اور میں کشفطیط ۔۔۔۔ جب میں جاگا، میں نے دیکھا کہ میں ایک مہیب عظیم الجثہ قوادی مچھلی کے پیٹ میں ہوں اور وہ آسمانوں پر اڑی چلی جاتی ہے اس کے پیٹ میں میں تنہا نہیں ہوں، اقوام عالم کے مرد و زن اس میں موجود مصروف اکل و شرب ہیں اور کوہ قاف کی پریاں تمام مردوں کو بلوریں جام مے اور فواکہات پیش کرنے میں مشغول ہیں۔ اور سامنے مچھلی کے جبڑے کے نزدیک ایک پردہ سیمیں پر متحرک تصاویر دکھائی دیں۔ اور نام اس تماشے کا THROAT DEEP تھا۔

میں نے آنکھیں مل کر اپنے برابر بیٹھے شخص سے پوچھا اے برادر کیا تم میرے ساتھی

سلطبوطس ہو؟ اور وہ ہمارا کتا قطمیر کہاں ہے؟

وہ بولا۔ نہیں میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھے پھر اس نے اپنا نام بتایا اور اپنے گہرے زخم دکھلائے اور خاموش ہو گیا۔ اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

کیا تم بھی دقیانوس کے ظلم کا شکار ہو؟ میں نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ وہ بولا میں دقیانوسی تصورات و تعصبات و نظیرات کے جور و ستم کا شکار ہوں۔

اس کی یہ تقریر میں سمجھ نہ سکا۔ وہ بولتا رہا۔ میں ایک شہر سے کہ جس کا نام قدیم لکھشمن ٹیلہ ہے، اپنی جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ میری قوم پر خدا نے عذاب الیم نازل کیا ہے کہ وہ قوم مجنون و مخبوط الحواس ہو چکی ہے اور لکھشمن ٹیلہ کی گلیوں میں ایک دوسرے کا خون بہا کر ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے اور دنیا کو اپنا عبرت ناک تماشا دکھا رہی ہے اور قسم ہے نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ اور یونسؑ کے خدا کی کہ میری قوم اپنے آپ کو بڑے ہی شدید عذاب میں مبتلا کر چکی ہے۔ میرا گھر بار مال اسباب تباہ ہوا میرے ہم مذہبوں کے ہاتھوں جورو بچے ہلاک ہوئے، میں تن واحد بھاگ کر ملک روم جاتا ہوں کہ وہاں محنت و مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال سکوں اور سر پر خاک ڈال کر گریہ وزاری کروں۔

میرے بائیں جانب ایک اور نحیف و نزار لاغر بندہ خدا بیٹھا اخبار پڑھتا تھا۔ اس سے پوچھا اے عزیز کیا تم میرے بھائی اریطاس ہو؟ بولا۔ نہیں میں پورب کے اس ملک سے آتا ہوں جہاں خدا نے اپنا قہر نازل کیا تھا وہاں بھی میرے اہل قوم نے ایک دوسرے کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اب میں محنت مزدوری کرنے ملک المانیہ جاتا ہوں۔

تیسرے نے کہا۔ میں قوم گوسالہ پرست کا ایک فرد ہوں میرے ملک میں آج کل میرے ہم وطن اور ہم مذہب اور ہم قوم ایک دسرے کو کھائے جا رہے ہیں۔ کہیں چین و امن نہیں میں بھی ملک فرنگ بھاگ رہا ہوں۔

تب مجھ کشفطیط کو یاد آیا قصہ عامیل مقتول کا کہ بعد قتل عامیل کے جب قبیلے کے لوگ تہمت ایک دوسرے پر دینے لگے کہ اس نے مارا ہوگا اس نے مارا ہوگا۔ موسیٰ کے پاس آ کر انہوں نے کہا یا رسول اللہ آپ دعا فرمائیے کہ اللہ قاتل کو خبر دے۔ موسیٰ نے دعا کی۔ جبرئیل نے موسیٰ سے کہا حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ غماز کو ہم دشمن جانتے ہیں۔ غمازی کیوں کر کریں ان کو کہہ دے کہ ایک گائے کی زبان لے مقتول پر ماردیں تب وہ جی اٹھے گا اور خود بول دے گا جس نے مارا۔ حق تعالیٰ

نے ان کو فرمایا گائے کی بابت کیوں کہ وہ قوم سنہرے بچھڑے کو پوجتی تھی۔

موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ کا حکم سنایا وے بولے ''پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کرے وہ گائے کیسی ہے۔'' موسیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے نہ بوڑھی نہ بچہ نہ جوان بیچ میں ان کے ہے وہ ایک گائے ہے خوب زرد رنگ اس کا۔ خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو۔ بدن سے پوری تندرست ہے۔ داغ اس میں کچھ نہیں۔۔۔۔۔قصہ گائے یوں ہے کہ ایک شخص بنی اسرائیل میں تھا۔ مرد صالح نیک بخت اور ایک گائے اس کی تھی۔ اس نے گائے کو جنگل میں خدا پہ سونپا اور وہ گائے جب بڑی ہوئی جنگل میں کوئی اسے پکڑ نہ سکتا تھا۔

معاملہ اس گائے کا بہت طویل و پیچیدہ تھا میں اسے ذہن سے ہٹا کر سامنے پردہ سیمیں کی طرف دیکھنے لگا جہاں مناظر عجیب و غریب دکھائی دیتے کہ جن کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اور میں نے سوچا کہ اب عذاب الٰہی آیا ہی چاہتا ہے۔ پھر میں نے ڈر کر چاروں طرف دیکھا سب مرد و زن مشغول اکل و شرب کمال اطمینان و فرط انبساط سے وہ شیطانی تماشا دیکھنے میں محو تھے اور میرے پیچھے اور آگے ایک گروہ کثیر مسکین صورت بندگان خدا کا بیٹھا تھا میں نے ان سے سوال کیا بھائیو تم کہاں کا قصد رکھتے ہو۔ وے بولے ہم جاتے ہیں ان صحراؤں کی طرف برائے کسب زر کثیر جہاں قدموں تلے سیاہ سیال طلائی بیش بہا کے چشمے جاری ہیں اور شکر ہے اس رب ذوالجلال کا جس نے ہمارے دن بھی پھیرے۔

تب مجھ کشفطیط کہ جو اصحاب کہف میں سے جاگا ہوں یاد آیا کہ موسیٰ کلیم اللہ کو خدا کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ فرعون کو راہ راست پر لانے کے لئے اس سے نرم نرم بات کیجیو۔

اور میں کشفطیط۔ میں نے بھی اپنے وقت کے فرعونوں اور شدادوں اور قارونوں اور ہامانوں سے نرم نرم بات کی مگر وہ میرے مزاج کی نرمی کو کمزوری سمجھے اور مجھے مزید ایذا ئیں دیں اور میرے دن نہ پھرے۔

اور قصہ بادشاہ قارون کا جو موسیٰ کا جدی چچیرا بھائی تھا بیٹا صافن کا، اور صافن بیٹا فاہش کا اور فاہش یعقوب علیہ السلام کا۔

عین اس وقت جب کہ میں ان ہیبت ناک امور پر غور کر رہا تھا پردہ سیمیں پر سے تماشا گر فاجرہ عورت کی تصویر معدوم ہوئی اور اس کے عقب سے سات عدد نقاب پوش نمودار ہوئے۔ ہاتھوں میں ان کے آتشیں گولے تھے اور دیگر اسلحہ جات۔

اور انہوں نے پکارا۔ ہم لوگ تم لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں گے بیچ آسمان وزمین کے ورنہ لے چلو ہم کو اس شہر کی سمت جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اطالوی قارون جو اس وقت اس جگہ موجود ہے کرے حوالے کنجیاں اپنے خزانے کی وگرنہ مار ڈالیں گے اس کو جان سے اور پکڑ لیں گے تم سب کو بطور یرغمال اور اگر نہ مانا تم نے حکم ہمارا تم سب کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ بلا تامل۔ کہ تم نے قائم کیا ہے فساد بیچ زمین کے۔

اور جواب دیا ایک شخص نے بآواز بلند کہ البتہ تم ہو ذریاب ابلیس لعین کے کہ ہلاک کرنا چاہتے ہو ان بے گناہوں کو جنہوں نے نہیں بگاڑا کچھ تمہارا۔

عین اس لمحے مچھلی کے پیٹ میں کڑک دار گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس نے فضائے تاریک میں غوطہ مارا اترنے لگی بسرعت طرف کرۂ زمین کے اور عزرائیل علیہ السلام کی صورت سب کے سامنے نمودار ہوئی اور ہم سب اس مہیب فولادی مچھلی کے پیٹ میں محبوس قعر حطمہ کی جانب اترتے جارہے ہیں اور وہ ریح العقیم جسے ستر ہزار زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا تھا آزاد ہو چکی ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

بے شک میں تھا گنہگاروں میں

بے شک میں تھا گنہگاروں میں

بے شک میں تھا گنہگاروں میں

اور اس راقم الحروف آئینہ فروش شہر کوراں نے یہ حکایت بیان کی اور پہاڑ کی کھوہ سے برآمد ہو کر اصحاب کہف کا کتا قطمیر آسمان کی طرف منہ اٹھائے روئے چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

قرۃ العین حیدر کی پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے افسانوں کا کلیات اور ناولٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے کئی جلدوں میں شائع کیا ہے۔ انھوں نے کئی ناول اور رپوتاژ لکھے۔ ان کو ۱۹۶۷ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور ۱۹۸۹ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء کو نوئیڈا میں ہوا۔

پھیرا

دیو پرساد داس

بھیڑ سے بھری سڑک پر دوڑتا ہوا ہجوم ۔یہ اس کی جانی پہچانی سڑک ہے۔ گذشتہ بارہ برسوں اس سڑک کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہے۔ روز اسی سڑک سے وہ گھر سے دفتر آتی ہے۔ پھر لوٹتی ہے۔

رخسانہ جلدی جلدی دفتر سے نکل کر سامنے والی سڑک کو دیکھنے لگی۔ پھر آسمان، پھر افق ۔آہستہ آہستہ نظر گھما کر اس نے بھیڑ پر نگاہ ڈالی۔ کسی کو پہچاننا ممکن نہیں تھا۔

آسمان کو چیرتی ہوئی اوپر اٹھی ہوئی ملیشن کاٹن مل کی بند پڑی چمنی، سڑک کے ایک طرف والا رنگین ہورڈنگ، موڑ کی بائیں طرف لوکل اسٹیشن کی چھت پر چہچہاتے پرندوں اور سڑک پر تیزی سے دوڑتی ہوئی بھیڑ...... کچھ بھی، اسے کوئی بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر وہ محسوس کرتی ہے کہ دنیا ٹھیک اسی طرح ہے، جیسے کہ کل تھی، پرسوں تھی اور اس سے پہلے والے دن تھی، مگر آج وہ کسی کو بھی پہچان نہیں پا رہی ہے۔

اس نے چہرے سے نقاب ہٹالیا۔ وہ اندر سے بالکل پریشان ہو چکی تھی۔ ایک طرح سے سانس رک جانے والا تجربہ۔ روز دفتر سے گھر وہ ذرا دیر سے لوٹتی ہے مگر آج وقت سے پہلے لوٹ رہی ہے۔ پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہے۔ رخسانہ کو تجربہ ہوا، دفتر سے گھر تک پہنچنے کی اس کی یہ کوشش زندگی کا سب سے بڑا سفر جیسا ہے۔

اس نے گلے میں لٹکے تعویذ کو ہاتھ سے پکڑ کر دونوں آنکھوں اور پیشانی تک لے گئی۔ جس تعویذ کو وہ آج تک بیکار چیز سمجھتی آئی تھی، ایک عقیدے میں بدل گئی۔

ایک دن امی نے اس کی حفاظت کے لئے یہ تعویذ دیا تھا۔ رخسانہ کو ان سب چیزوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ تعویذ ویسے ہی پڑھنے والی میز کی دراز میں پڑا رہا۔ امی نے کتنی بار منتیں کی تھیں، اپنے لئے نہ صحیح کم سے کم میرے لئے پہن لے۔ ماں کی ضد کے سامنے رخسانہ کی ایک نہ چلی۔ آج اچانک اسی تعویذ کی موجودگی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ شاید اعتماد اور عقیدہ یہی ہے۔ اچانک خود کو

ظاہر کر دیتا ہے۔

وہ تیزی سے چلنے لگی۔ آج کچھ زیادہ ہی بھیڑ ہے، دوسرے دنوں کے مقابلے۔

اس بھیڑ میں سے کوئی زور سے چلایا۔ ''انھیں لوگوں نے کیا ہے یہ سب، یہ ہی ہیں بدمعاش......'' رخسانہ چونک گئی۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بھیڑ کی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ بھیڑ کی کوئی خاص آواز نہیں ہوتی۔ اس طرح کی باتیں سننا عام تھا۔ وہ لوگ تو ہمیشہ شک کے گھیرے میں رہتے ہیں۔ پھر سے اسی موبائل میسج کی یاد آ گئی۔ بامب بلاسٹ ان داشی۔ شہر میں دھماکا۔

اس کے اپنے شہر میں پھر ایک دھماکا۔ بے نیاز بھیڑ پھر اچانک رخ بدل سکتی ہے۔ شک کی چنگاری پھر سے آگ لگا سکتی ہے۔ پچھلی بار تو ایسا ہی ہوا تھا۔ بے اعتمادی اور نفرت نے برسوں کے رشتوں اور بھائی چارے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

خون کی پیاسی بھیڑ بغیر کچھ سمجھے سب کچھ برباد کر دینے پر تلی تھی۔

پورا علاقہ آگ کی لپٹوں میں آ گیا۔ جانے پہچانے لوگ بے گانے لگتے تھے۔ رخسانہ نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہی جلتے گھر کو دیکھا تھا۔ باہر کی دنیا گھر سے زیادہ محفوظ بن سکتی ہے۔ کیا؟۔ وہ لوگ پھر لوٹ آئے تھے، لیکن تب ان کے ماضی کا جیسے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

گھر کی یادیں بچپن اور رشتے سب جل چکے تھے۔ پھر سب ہنسنا بھول گئے تھے۔ زندگی پھر اپنی رفتار میں آ گئی لیکن سینے میں، یادوں میں، دل میں کبھی نہ مٹنے والے داغ اور درد اب بھی انھیں ڈراتے ہیں۔ کیسے بدل گئی یہ دنیا؟ کچھ خاموشیوں کو گونج لوٹا کر لے آتی ہے، جہاں کاغذ کا پرزہ اڑتا ہے تو طوفان سا سنائی پڑتا ہے۔

بھیڑ کا نشانہ وہ بھی ہو سکتی ہے، وہ اور اس کے جیسے کئی لوگ شک کے گھیرے میں ہیں۔ سچائی کو ڈھونڈھا جا سکتا ہے، تھوڑے ہی لوگوں کے لئے پوری قوم کو موردالزام بنا کر سوال پوچھے جا سکتے ہیں۔

بغل میں ایک تنگ گلی، اندھیارے اور اجیارے کا لکا چھپی کا کھیل! یہ جگہ صحیح ثابت ہو سکتی ہے۔ بڑے ہی احتیاط سے گلی میں جا کر اس نے برقعے کو نکال کر بیگ میں رکھ لیا۔

پھر وہ سڑک پر چلی آئی، سامنے لوگوں کا سیلاب! اس نے اس بھیڑ میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ اتنا بڑا شہر جو رات میں کبھی نہیں سوتا ہے حالانکہ آج جیسے دنوں میں بند کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ٹھہر جانا چاہتا ہے۔ کچھ خاموشیوں کو سڑک اور بازاروں کی طرف پھینک کر ایسی

راتیں دل میں خوف پیدا کرتی ہیں، اندیشے جگاتی ہیں، سانس کی آواز بھی دل دہلا دیتی ہے، کچھ پھس پھساہٹ اور کچھ رکی رکی سانسوں کے اندر ہی رات لمبی ہو جاتی ہے۔

بھیڑ کی دوڑ اپنے اپنے گھر کی طرف۔۔ اندر ہی اندر ڈھیروں سوال۔۔ کہاں ہوا ہے دھماکا، کتنے لوگوں کی موت ہوئی ہے، شہر میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں۔؟ سارے سوالات، ساری دلیلوں کا ایک ہی مطلب ہے، وہ مطلب اچانک طوفان پیدا کر سکتا ہے، رخسانہ تیز قدموں سے چلنے لگی، اسے جلدی سے جلدی گھر پہنچنا ہے۔

خوف اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ شام خوفناک سیاہ رات بن جائے، اسے پہنچنا ہوگا، وہ ٹیکسی بھی لے سکتی ہے!

''ٹیکسی، محبوب نگر چلنا ہے؟''

وہ جواب کا انتظار کئے بغیر پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ ڈرائیور 40-35 کی عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی، سستے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ ذرا سا سکون محسوس ہوا، سڑک پر ویسی ہی بھگدڑ مچی تھی، کم سے کم اب وہ ذرا جلدی گھر پہنچ جائے گی۔

مہانگر میں رات نہیں ہوتی، پھر بھی کسی واردات کے اندیشے سے دوکانوں کے شٹر گرنے شروع ہو گئے تھے۔۔ اس شہر کی تاریخ میں ایسی ہی کتنی راتوں نے لوگوں کی زندگی بدل دی ہے، گھر اجڑ گیا، خاندان چھوٹ گیا، کام دھندا چوپٹ ہو گیا، محنت مزدوری چلی گئی، خواب بکھر گئے۔ جینے کی خواہش تو نہیں بلکہ کچھ لوگ صرف وقت گذارنے کی کوشش کرتے آئے ہیں، شہر کی لوکل ٹرینوں کی طرح، وہ لوگ روز ٹھیک وقت پر آتے ہیں، جاتے ہیں، پیٹھ پر لاد کر لے جاتے ہیں کچھ کھونے کا درد۔

ٹیکسی کے دونوں طرف بھیڑ، بے چین اور پریشان، اچانک ایک آدمی ہاتھ میں ڈنڈا لئے بھیڑ کو کھدیڑتا ہوا آ گیا۔ رخسانہ چونک گئی۔ شہر میں دنگا شروع ہو گیا کیا؟ وہ آدمی ٹیکسی مالک کے قریب تھا۔ رخسانہ نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔ سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح کتنے لمحے بیت گئے۔ آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ آدمی ہوا میں کھو گیا کہیں ،شاید تیز رفتار بھیڑ کے اندر۔

اچانک موبائل بجنے لگا۔ اس کی آواز بھی اسے چونکانے کے لئے کافی تھی۔ امی کا فون، اسے تھوڑی راحت ملی، ماں کی باتیں سن کر اسے یقین نہیں ہوا، جو تعویذ انہوں نے ضد کر کے پہنا

یا تھا، آج اسے نکال کر بیگ میں رکھنے کے لئے بڑے ہی خوفزدہ ڈھنگ سے بول رہی تھی، لیکن کیوں؟ تعویذ کیا اس کی حفاظت کے لئے نہیں ہے؟ نا، نا، تعویذ سے وہ پہچانی جائے گی۔ اس اپنے شہر میں آج رات کے لئے بے گانہ بن جانا ہی اچھا ہے۔ وہ صرف بھیڑ کا ایک حصہ ہے، اس کی اپنی کوئی خاص پہچان نہیں ہے، کوئی ماضی نہیں ہے، کوئی مذہب، کوئی گھر خاندان نہیں ہے، وہ اس بھیڑ میں ایک انجان ایک اجنبی ہے بس۔

تعویذ کو گلے سے نکال کر کچھ لمحے ہاتھ میں رکھنے کے بعد پھر اس نے بیگ میں رکھ دیا۔
تو کیا اس نے اپنی پہچان کو مٹا دیا؟ خوف شک میں بدل گیا اور اس نے رخسانہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بھیڑ کو چیرتی ہوئی ٹیکسی آگے بڑھ رہی تھی۔ رخسانہ یہ جان گئی کہ وہ ٹیکسی سے زیادہ دور تک نہیں جا پائے گی۔ اچانک کہیں پر یہ بھیڑ دیوار بن جائے گی اور اسے ٹیکسی کی پرواہ کئے بغیر اس دیوار میں سے راستہ نکالنا ہوگا۔

یہ شہر پھر کون جانے کتنے دنوں تک شک اور اندیشے کے گھیرے میں رہے گا؟ پھر کتنے دنوں تک لوگ گھر سے باہر نکلنے سے ڈریں گے؟ دنیا میں کہیں بھی کچھ ہوتا ہے تو پہلے اس کے شہر میں بے اعتمادی کا دھواں بھر جاتا ہے۔ برسوں سے ساتھ رہنے والے پڑوسی رہ چکے لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا ہے لیکن دوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔

ٹیکسی کے ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی۔ رخسانہ آگے کی طرف پھسلی، پھر سنبھل گئی۔ کچھ لوگ ان کے سامنے سے دوڑتے بھاگتے چلے گئے۔ ڈرائیور دل ہی دل میں ناراضگی میں کچھ بڑبڑایا۔

''آج سارے لوگ جلدی میں ہیں، ہوا کیا ہے، دیدی؟''

ٹیکسی ڈرائیور کے اس معصوم سوال نے رخسانہ کو جیسے لمحے بھر کے لئے خاموش کر دیا۔

اسے اب تک خبر بھی نہیں ہے کہ شہر میں کیا ہوا ہے؟

سچ میں درائیور کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ اس نے کہا ''تب تو زیادہ دور تک آپ کو لے جانا ممکن نہیں ہے۔''

زیادہ دور تک وہ ٹیکسی میں جا نہیں سکے گی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا اس لئے ڈرائیور کی بات پر اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔

ٹیکسی اب موڑ مڑتی ہوئی ایک اندھیری تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ چہرے سے وہ آدمی جانا پہچانا سا لگتا تھا، پھر بھی وہ ایسے راستے کی طرف کیوں آیا؟

''ہوسکتا ہے ہم ادھر سے گھنٹہ گھر تک پہنچ جائیں'' ڈرائیور بھی دل کی بات پڑھتا ہوا بولا۔ چاروں طرف دیکھتا ہوا وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ کے دونوں طرف کے شیشے اوپر اٹھانے کے لئے رخسانہ سے کہا۔

اچانک کچھ ہی دوری پر آگ کا گولہ دکھائی دیا۔ ٹیکسی روک کر ڈرائیور نے لائٹ بجھادی۔ ایک طرف گاڑی کو اندھیرے میں ہی گم ہو جانے دیا۔ گاڑی اور گاڑی کے اندر جیسے کوئی ہو ہی نہیں۔ کچھ لوگ قریب سے بھاگ دوڑ کے چلے گئے۔ لمحے بھر کے بعد سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

ڈرائیور تیز رفتار سے گاڑی چلانے لگا جیسے اس کے اوپر کوئی ذمہ داری لاد دی گئی ہو اور اسے وہ بخوبی نبھانے چلا ہو۔ گھنٹہ گھر اب نزدیک تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اب مین روڈ پر ہی گاڑی روک دی۔ رخسانہ کے اترنے سے پہلے کچھ لوگ گاڑی کے اوپر جیسے کود پڑے۔ انھیں قدم رسول تک جانا ہے۔ ڈرائیور نے پختہ لہجے میں منع کر دیا۔ وہ لوگ چلے گئے۔ سامنے لوگوں کا ہجوم۔۔۔۔

رخسانہ ڈرائیور سے ناراض ہوئی۔ ''ایسے وقت پر لوگوں کی مدد کرنی چاہئے، مشکل میں پھنسے لوگوں کو منع کرتے ہیں!''

''ادھر خطرہ ہے۔'' بہت ہی ٹھنڈے لہجے میں ڈرائیور بولا۔ اس کی آواز میں موت کی سی سرد مہری تھی۔ اچانک رخسانہ نے غور کیا کہ ڈرائیور کے گلے میں درگا ماں کا ایک لاکٹ ہے۔

اب تک وہ جسے مسلمان سمجھتی آئی تھی، وہ ہندو ہے اور اسی کی طرح دہشت زدہ ہے۔

اس شہر میں ہندو مسلمان کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس ایک ہی سچائی ہے۔ سب کے سب انسان ہیں اور سب ڈرے ہوئے ہیں۔ صرف مایوس لوگوں کا شہر۔ محنتی اور معصوم، عام لوگوں کے لئے تو زندہ رہنا ہی ایک ایمان ہے۔ وہ چھوٹا یا بڑا نہیں سمجھتا، بھید بھاؤ نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو شہر نے دہشت دی ہے۔

پھر رخسانہ بھیڑ میں کھو گئی۔ گھر پہنچ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کر دے گی۔ اپنی ماں کے دوپٹے میں اپنے آپ کو چھپا لے گی۔ اپنے سب سے بھروسے والی پناہ گاہ میں۔

وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شہر کبھی تھکتا نہیں ہے لیکن آج

جیسا اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ گھبرائے ہوئے چہرے، کالے بادل سی گھری آنکھیں، پریشانی میں ڈوبے سر، سب کے سب خاموش۔۔۔۔۔

اتنے بڑے ہجوم کو کسی نے شاید جادوٹونے سے چپ کرادیا ہو۔ چاروں طرف اپنی تیز نظروں سے دیکھتی رخسانہ آگے بڑھ رہی تھی۔ براوقت کب آجائے، کون کہہ سکتا ہے۔؟

سائرن بجاتی ہوئی دو ایمبولینس انھیں اچانک پار کر گئیں۔ ایسے حالات میں ایمبولینس یا دمکل کی آوازیں عام ہو جاتی ہیں اور دہشت پھیلاتی ہیں۔ بڑا ہی درناک اور ڈراؤنی لگتی ہیں۔ سائرن کی آواز، بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک ہلکے سے شوروغل نے خاموشی کی جگہ لے لی۔

کسی نے کہا'' دوسو کی موتیں ہوئی ہیں۔''

رخسانہ کے قدم تیز ہو گئے، بارود نے آگ پکڑ لی، کبھی بھی دھماکہ ہو سکتا ہے۔ اس شہر میں ڈھیروں لوگ ہیں اور دکھ بھی، چاہے دھماکہ ہو یا دنگا، کچھ مر جاتے ہیں تو حساب میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جو کسی کو کھو دیتا ہے، صرف وہی زندگی بھر غم اٹھاتا ہے، دوسرے بھول جاتے ہیں، زندگی کو سمیٹ لیتے ہیں، ڈر کا کوئی دوسرا لمحہ آنے تک..........

سامنے چرچ ہے، وہیں سے وہ مین روڈ چھوڑ کر اندر مڑے گی۔ اب اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ امی کو فون سے خبر کر دیں کیا۔؟ لیکن موبائل کام نہیں کر رہا ہے، ایسے دنوں میں رشتے کتنی دور نکل جاتے ہیں؟ سب کچھ قریب ہونے پر دور لگتا ہے، دور، بہت دور..........

رخسانہ مڑ گئی۔ پیچھے ہجوم کے ساتھ آہستہ آہستہ شور بڑھ رہا ہے۔ رخسانہ تیز قدموں سے چلنے لگی۔ گلی کے ایک سرے پر ایک پولس کی گاڑی اور دو کانسٹبل۔ وہ اسی طرح چپ چاپ چلتی رہی، اسے جلدی گھر پہنچنا ہوگا۔

گلی سے گلی.........موڑ پر موڑ.........رخسانہ چل رہی تھی، پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ۔

دھیرے مگر نمایاں ....ضرور کوئی آرہا ہے، چاروں جانب اندھیرا، سنسان سڑک، بڑی بڑی عمارتوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہو چکے ہیں۔ یہ قدم ضرور اس کا پیچھا کر رہے ہیں، جس خطرے سے وہ اب تک خود کو بچاتی آئی ہے، کیا وہ اتنے قریب ہے؟ وہ تو اس علاقے سے واقف ہے۔ کسی ظالم، بے رحم دہشت پھیلانے والے کے لئے کیا وہ خود کو قربان کر دے گی؟

رخسانہ خوف سے کانپنے لگی، اس کی سانس رکنے لگی، پاؤں میں جان نہیں رہی۔

اتنے قریب پھراتنی دور۔ اس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ایک لڑکی ہے۔۔ عمر میں اس سے کچھ چھوٹی ہوگی۔ دبے پیر آکر وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔

''مجھے گرانڈ روڈ تک جانا ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے!'' وہ خوف بھری آواز میں بول رہی تھی۔

''کیا تم مسلمان ہو؟''

''نہیں، میں ہندو ہوں''

شہر کے سارے لوگ آج خوف زدہ ہیں، زندگی ہے اس لئے موت سے ڈر لگتا ہے۔ موت قریب آسکتی ہے، اس لئے زندگی کا ڈر رہتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں کو انسانوں سے ڈر ہے۔ عقیدت، اعتماد اور محبت کی غیر موجودگی میں صرف خوف ہی خوف۔ رخسانہ سوچنے لگی کہ وہ کس سے ڈر رہی تھی؟ ایک جانی پہچانی قربت سے؟۔۔۔۔ اندھیرے سے؟۔۔۔ وہ ساتھ ساتھ چلنے لگیں،۔ دوسری طرف موت کی سی خاموشی تھی۔ خاموشی ہی سوال ہے، خاموشی ہی جواب ہے، خاموشی ہی صداقت اور حسن ہے۔ خاموشی میں ہی وہ دونوں اپنے اپنے وجود کو محسوس کرنے لگیں۔

دل روشن ہوا تھا، رخسانہ نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ دونوں اسی طرح آگے کی جانب چلنے لگیں، رکنے پر ڈر لگتا ہے، آگے بڑھنے پر ڈر کہاں؟

☆☆☆

اڑیا افسانہ نگار دیو پرساد داس کی پیدائش ۱۹۶۶ء میں بھونیشور میں ہوئی۔ چار افسانوں کے مجموعے اور مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

پرتی ترپتی

نین تارا سہگل

دوا کی دکان میں داخل ہوتے ہی میری ملاقات کملا سے ہوگئی۔ اپنے مخدوش پرانے جوتوں کو گھسیٹتی ہوئی وہ دکان سے باہر آرہی تھی۔ اس کی ساڑی پر دھبے تھے اور اس کے سفید بالوں میں کچھ پیلا پن جھلکنے لگا تھا۔ وہ مسکرائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا آگے کا ایک دانت بھی غائب تھا۔ برسوں بعد لکھنؤ آنے کی وجہ سے میں اس کے چہرے مہرے میں کچھ تبدیلی دیکھنے کے لیے تیار تھی لیکن اس کی اس قدر غریبی نے تو مجھے حیران ہی کر دیا تھا۔ مجھے دکھ ہوا اسے اس حالت میں دیکھ کر۔

حیرت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ بول پڑی۔ ''ہر آدمی وقت کے ساتھ بڑا ہوتا ہے۔ تم اس طرح گھبراؤ نہیں''

لیکن یہ تو بڑا ہونے سے بھی بڑھ کر تھا۔ برسوں سے ہم ایک دوسرے سے نہیں مل پائے تھے۔ ابھی تک وہ مجھے ایک خوش خرم اور خوش مزاج لڑکی کے روپ میں یاد ہے۔ وہ دور دراز کی رشتہ دار ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہی بڑی ہوئی تھی اور میر پاپا تو اسے خاص کر پیار کرتے تھے۔ انھوں نے کملا کے بلند ذہنی معیار کو پہچان لیا تھا۔ پھر پاپا نے اسے اسکول میں بھی بھیجا جبکہ ہم لوگوں کو ایسی کوئی سہولت نہیں ملی تھی۔ ہماری پڑھائی گھر پر ہی ہوئی تھی اور اپنے استاد کی باتوں کو سننے کی بجائے اگر ہم آپس میں دنیا جہاں کی باتیں کرتے یا اپنی کاپیوں پر ڈرائنگ کے نام پر ادھر ادھر کی تصویریں بناتے رہتے تب بھی پاپا کو کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی کہتے رہتے۔ تم سب تو اپنی شادیوں کے بعد صرف اپنے گھر بساؤ گی لیکن کملا تم سب سے الگ نکلے گی۔ آخر پاپا کی ان امیدوں کا کیا ہوا؟

کل چائے کے لئے ضرور آنا۔ وہ بولی اور مجھے اپنا نیا پتہ دیتے ہوئے اس نے کہا۔'' میں نے اپنا پچھلا مکان چھوڑ دیا ہے۔ دوسرے دن اس کے یہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے چھوٹے سے بنگلے میں رہ رہی تھی جسے دیوار کا ایک حصہ راستے سے الگ کرتا تھا۔ باغیچے کی زمین جنگلی گھاس سے بھری ہوئی تھی اور ٹیڑھی میڑھی لتاؤں نے جیسے اس سارے مکان کو پوری

طرح چھپالیا تھا۔ ہم ایک دیوان پر بیٹھ گئے اور کملا نے نوکر کو چائے لانے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور آدمی ہم لوگوں کے درمیان آکر بیٹھ گئے۔

''تمھیں موہن لال کی یاد ہے نا؟'' کملا اس کا تعارف کراتی ہوئی بولی۔ ''جب ہمارے ساتھ یہ پرانے والے مکان میں رہتے تھے تب تمھاری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب ہمارے ساتھ یہ بھی وہاں سے چلے آئے ہیں۔''

بیچ میں ہی موہن لال بول اٹھے۔ ''اصل میں کملا کے بنائے کھانے کا میں اس قدر عادی ہوگیا تھا کہ کسی دوسرے کے ساتھ رہنا ہی میرے لئے ممکن نہ تھا۔''

لمبے عرصے کی رفاقت نے انھیں ایک دوسرے جیسا ہی بنادیا تھا۔ موہن لال بھی اب کافی بڑے لگنے لگے تھے۔ اپنے کچھ زیادہ بڑھے ہوئے سفید بالوں اور آگے سے ٹوٹے ایک دانت کے ساتھ اس کا حلیہ کملا سے ملتا جلتا ہوگیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں بھائی بہن ہوں۔ ہم کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اس کے بعد میں نے موہن لال سے ان کے مضامین اور لیکچرز کے بارے میں پوچھ تاچھ کی اور جاننا چاہا کہ اب تک وہ زیادہ گھوم پھر کر کیوں نہیں پاتے ہیں؟

''یہ سمجھنا بھول ہے کہ چھوٹے شہر غیر جاذب نظر اور بے کار ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہاں بھی بہت کچھ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔'' انھوں نے کہا ''لیکن آپ کسی دوسری جگہ ہوتے تو اور بھی ترقی کے مواقع مل سکتے تھے، آپ کی شہرت بھی تب شاید آج سے کئی گنا بڑھ چکی ہوتی۔''

یہ تو آدمی آدمی کے نظریے پر منحصر ہے۔ میری بات پوری طرح سنے بغیر وہ بول اٹھے تھے۔ ہم باتیں کررہے تھے اور نوکر چائے بنا رہا تھا۔ اچانک مجھے چینی کراکری کا وہ خوبصورت سیٹ یاد آگیا جسے پاپا نے کملا کے لئے دیا تھا۔ یقیناً وہ بھی مکان کے ساتھ بیچ دیا گیا ہوگا۔ میں نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد کملا کے شوہر نواب صاحب بھی وہاں آگئے۔ نواب صاحب نہ ان کا نام تھا اور نہ سچ مچ کہیں کے نواب تھے۔ وہ ان کی چست درست زندگی، ادب وآداب سے بھرے رہن سہن، صاف شفاف لباس اور لکھنوی نزاکت سے بھرپور اداؤں کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں نے انھیں اس نام سے پکارنا شروع کردیا تھا۔ اور بعد میں وہ ان کے ساتھ پوری طرح چسپاں ہوکر رہ گیا تھا۔

نواب صاحب سچ مچ پورے شائستہ مزاج انسان تھے۔ گزرے زمانے میں یقیناً لوگ انھیں ایک نوبل مین کی شکل میں مخاطب کرتے۔ ان کے کپڑے کملا اور موہن لال کی بکھری اور بے ترتیب رنگ ڈھنگ، لباس، وضع قطع کے مقابلے کہیں زیادہ اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ ان کی

رنگت ٹیسو پیپر کی طرح شفاف تھی اور ان کا چہرہ پتلا اور جبڑے ذرا اٹھے ہوئے تھے۔ اپنے لمبے اور پتلے جسم میں وہ کچھ جھک کر چلتے ہوئے سے معلوم پڑ رہے تھے۔

کملا نے انھیں آرام سے بٹھانے کی نیت سے موہن لال کو آرام کرسی چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ موہن لال دوسری کرسی لانے اندر چلے گئے۔ نواب صاحب آرام سے کرسی پر بیٹھے ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ میرے سلام کے جواب میں وہ ہلکے سے مسکرا دیے۔ جیسے میری موجودگی سے انھیں کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ پر سکون اور مطمئن بیٹھے رہے۔ ہماری بات چیت پھر شروع ہوگئی بیچ میں نواب صاحب نے کملا سے اپنا سگار مانگا جسے اس نے لا کر دے دیا۔

''تمھاری ہرے نگینے والی انگوٹھی کہاں ہے؟'' تھوڑی دیر بعد وہ اچانک کملا سے پوچھ بیٹھے تھے۔ ایسا لگا جیسے ہماری بات چیت ان تک پہنچ ہی نہ پا رہی ہو۔

''یہاں ہے''۔ کملا نے اپنی ساڑی کے کنارے سے بندھی ہوئی انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔ ''جب کھانا بنانے لگی تھی تب اسے اتار دیا تھا'' وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔ ''اسے تمھیں ہمیشہ پہنے رہنا چاہیے۔''

پھر چائے آئی اور سب سے پہلے نواب صاحب کو پیش کی گئی۔ جب تک اس کا ایک گھونٹ پی کر انھوں نے کملا سے یہ نہیں کہا کہ چائے ان کی پسند کے مطابق بنی ہے، کملا ایسی ہی بیٹھی رہی۔ اس کے بعد مجھے اور پھر موہن لال کو چائے دی گئی۔ مجھے حیرت ہوئی یہ سوچ کر کہ کیا کملا کو اس دن کی یاد نہیں ہے جب اس کے پچھلے گھر میں انڈے کی شکل کے شاندار ڈائننگ روم میں جس کی کھڑکیوں سے اس کا رنگ برنگا باغیچہ دکھائی دیتا تھا، ہم لوگوں نے چائے پی تھی۔ کوٹ اور پگڑی سے چست درست ایک نوکر ہمارے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کملا کے تین بیٹے، تینوں بالکل اپنے باپ جیسے ہی دبلے پتلے تھے، وہاں آ گئے۔ انھوں نے نواب صاحب کو مودبانہ سلام عرض کیا اور پھر موہن لال کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں گم ہوگئے۔ تبھی شام کو اخبار آیا اور وہ نواب صاحب کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ لیکن نواب صاحب نے اپنی جگہ سے تھوڑا اٹھتے ہوئے اس اخبار کو موہن لال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے یہی کہہ رہا تھا کہ پہلے وہ اس اخبار کو پڑھے۔ آخر میں نواب صاحب نے فیصلہ کیا کہ چونکہ موہن لال گھر میں مہمان کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ اس لئے پہلے اخبار پڑھنے کا حق انھیں کو ہے۔ مجھے ان کی یہ بات سچ مچ ہی کچھ عجیب سی لگی کیونکہ جب چائے انھیں دی گئی تھی تو

انھوں نے اسے لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔

کملا کے یہاں سے میں تینوں آدمیوں کی مختلف النوع شخصی تصویریں اپنے دل و دماغ میں اتار کر واپس لوٹی۔ کملا اور اس کے ساتھ خاندان کو میں نے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کرنے کی بھی کوشش کی لیکن کملا نے اسے نامنظور کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم مجھے غلط نہیں سمجھنا، لیکن میں باہر بہت ہی کم نکلتی ہوں۔ آج کل تو بالکل نہیں''

ہمارے جس گھر میں کملا پلی بڑھی تھی، بڑی ہوئی تھی وہاں آنے پر اسے یقینی طور پر اپنی باتیں یاد آ جاتی ہوں گی۔ ایسا میں سمجھتی تھی۔ کتنی ہی بار کملا یہاں اسی میز پر بیٹھ کر ہم سب کو اپنے میٹھے رویوں اور ہنس مکھ برتاؤ سے بری طرح متاثر کر چکی تھی۔ پاپا اگر کبھی ذہنی دباؤ میں مبتلا نظر آتے تھے تو کملا ہی ان کو اس سے آزادی دلانے میں کامیاب ہو پاتی تھی۔ جب ہم دوسری لڑکیاں پاپا کے ڈر سے شور نہ مچا کر چپ چاپ بیٹھنے کی تکلیف جھیلتی تھیں تو کملا ہی ہوتی تھی جو اپنی پر تکلف باتوں سے اس خاموشی بھرے ماحول کو پوری طرح ہلکا پھلکا کر دیا کرتی تھی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہا کرتی تھی کہ گھر میں خاموشی اور غمگینی کی پرچھائیں بھی نہ پڑ پائے اور اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے وہ ہم سب کی محبوبہ بن سکی تھی۔

ان ہنستے کھیلتے دنوں کی یاد کر کے مجھے کملا کی آج کی حالت پر یقیناً ہی بے حد دکھ ہوا اور خاص طور پر اس لئے مجھے اور بھی زیادہ افسوس ہوا کہ اپنی اس حالت کی وہ مسکراتے ہوئے قبول کر رہی ہے۔ کیا سچ مچ اسے پرانے دنوں کی یاد نہیں آتی؟ کیا سچ مچ وہ ان دنوں کو یاد کر کے ان کے لئے تڑپن محسوس نہیں کرتی؟ کیا اسے نواب صاحب کے ساتھ بغیر سوچے سمجھے کی گئی شادی کا سچ مچ کوئی دکھ نہیں ہے؟

کملا کو ایک مرد کا دماغ ملا ہے۔ یہ بات پاپا نے بڑے فخر سے کہی تھی اور ماں نے مایوسی سے۔ ماں گہری سانس لے کر کہا کرتی تھی۔ ''کملا میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بے حد آزاد خیال اور پارہ صفت مزاج کی ہے۔ اس لئے یہ بالکل ممکن تھا کہ جب دوسری لڑکیوں کی شادیاں ان کے ماں باپ طے کرتے تھے، کملا خود کسی سے محبت کر بیٹھی۔ وہ نوجوان حالانکہ کئی بار ہمارے گھر آ چکا تھا پھر بھی ہمارے شہر کے لئے وہ بالکل نیا تھا اور یہاں کوئی بھی اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پاپا کملا کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے مان لیا کرتے تھے لیکن اس بات میں اس کی حمایت نہیں لے سکے۔

لیکن آپ کیا اس بات کو نہیں مانتے ہیں کہ وہ ایک شریف، تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان ہے؟ کملا سوال کرتی۔

نوجوان اپنے رہن سہن، چال ڈھال سے بڑا جاذب نظر اور ہینڈسم تھا۔ اسے اردو زبان اور ادب میں خاص دلچسپی تھی اور کبھی کبھی ہمیں اس کی کچھ چیزیں سناتا بھی رہتا تھا۔ اس کا پر خلوص اور نرم رویہ اسے با آسانی ہی دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اونچا اٹھا دیتا تھا۔ ہم لوگوں نے خود اپنی طرف سے اسے نواب صاحب کہنا شروع کر دیا تھا اور یہ تخاطب اس کی شخصیت پر جچتا بھی خوب تھا۔ ہمارے لئے اس وقت وہ سچ ہی کام دیو کا اوتار جیسا ہی معلوم ہوتا تھا اور ہمیں اس بات کا پورا بھروسہ تھا کہ کملا کے لئے پاپا اسے ضرور پسند کر لیں گے۔

تمھیں پہلے اپنی پڑھائی کی طرف دھیان لگانا چاہئے اور اس کے بعد ہی ان باتوں کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ پاپا نے کملا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

لیکن وہ سب تو میں بعد میں بھی پورا کر سکتی ہوں۔ آپ اس بات کو آخر سمجھتے کیوں نہیں؟ کملا نے جواب دیا تھا۔ اس کی بے صبری اپنی حد پر تھی۔ اسی بے صبری میں وہ یہاں تک کہہ بیٹھی۔ آپ دیکھتے نہیں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں؟ پھر وہ بہت دنوں تک تو یہاں رکے گا بھی نہیں۔ اور پھر کسی دوسری لڑکی کے ساتھ اس جیسے خوبصورت نوجوان کی شادی ہو جائے گی۔

پاپا نے اپنی آخری کوشش کرتے ہوئے کملا سے کہا تھا۔ ''مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے جانے کی کوئی جلدی ہے اور پھر اس مسئلے پر تھوڑی بہت تاخیر تصویر کو اور صاف کر دے گی۔

لیکن آخر میں ان کو کملا کی بات ماننی ہی پڑ گئی۔ انھوں نے اپنے من کو یہ سمجھانے کا فیصلہ کیا کہ ایک نہ ایک دن تو کملا کی شادی کرنی ہی ہے اور اگر اسے اپنی پسند کا شوہر مل گیا تو پھر دیر کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب بھلے ہی زیادہ پیسے والے نہ ہوں لیکن ان کا خاندان ایک جانے مانے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور پاپا نے کملا کے ساتھ ان کی سگائی کر دی۔

کملا نے اندر دل سے نواب صاحب کو پیار کرنا شروع کر دیا تھا اور ان کی شادی میں کسی طرح کی کوئی دیر ہو یہ بات اسے گوارا نہ تھی۔ ماں کو اس کی یہ جلد بازی تہذیب کے خلاف لگتی تھی لیکن ہم جیسے لوگ جو عمر کے جوشیلے پن کی شدت کے احساس کرنے کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا تھا کملا سے رشک کرنے لگ گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہم سے اوپر رہی تھی۔ ہم سب سے الگ ایک نرالی شخصیت

کی مالکن۔اس کی اس پیار بھری شادی نے تو اسے اچانک ہی ہم سب کی ہیروئین بنادیا تھا۔

کملا کے ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہونے پر جو اپنی عادتوں اور برتاؤ میں کملا کے ساتھ قطعی میل نہ کھاتا ہو، ہمیں حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہی نہیں تھے جو ہو بہو کملا کی طرح ہو۔ پاپا سے ملنے جلنے والے لوگ، وہ لوگ جن سے ہم پارٹیوں وغیرہ میں ملا کرتے تھے۔ بالکل الگ طور طریقے کے شریف آدمی ہوا کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنی باتوں کو لفظوں کی جگہ پر اشاروں کے ذریعہ بیان کرنے کے عادی تھے۔ الفاظ سے عاری آنکھوں کی زبان بولنے کی ان کی عادت تھی۔ ایسے لوگ ناراض اور غصہ ہونے پر بھی اسے صاف طور پر ظاہر کرنے کے بجائے اپنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

ایک دوسرے کو سر اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے۔ کسی لڑکی کے روبرو اپنی محبت کا مظاہرہ کرتے وقت وہ لوگ بہت سوچ سمجھ کر گنے چنے لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے ہم برابر ہی اپنے ڈرائنگ روم یا گارڈن پارٹیوں میں ملا کرتے اور ان کے ہاؤ بھاؤ، چال ڈھال سے انھیں پرکھنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح کے ماحول میں اپنے کو قابو میں نہ رکھنے کا گناہ ناقابل معافی مانا جاتا ہے اور گناہ گاروں کو فوراً ہی غیر مہذب اور بدتہذیب لوگوں کی صف میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ہم خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ کملا جیسے جیسے بڑی ہوتی جائے گی وہ خود بھی اس طرح کے خاندان کو بالکل بے غرض اور کھوکھلا سمجھنے لگے گی۔

کملا اور نواب صاحب کو شادی کے پہلے حالانکہ بہت کم کھل کر ملنے کا موقع ملا تھا لیکن جب کبھی دونوں میں ملاقات ہوتی تھی تو کملا کی آنکھوں سے مسرت کی لہر اپنے آپ جھلکنے لگتی تھی۔ ویسے ان ملاقاتوں کا خود نواب صاحب پر کبھی زیادہ اثر نہیں پڑ پایا کیونکہ وہ روابط میں آنے والے ہر آدمی سے اس طرح کی تحسین حاصل کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

شادی کے دن کملا میں خود بخود ایک شرم کی ادا پیدا ہوگئی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمکنے لگی تھیں۔ دولہے کے لباس میں حالانکہ نواب صاحب ساری رات کے جاگنے کے باعث بہت زیادہ تھکے دکھائی دے رہے تھے لیکن تب بھی ان کا چہرہ پوری طرح پرسکون اور مطمئن تھا۔ پھولوں سے سجے سجائے اس کمرے میں جہاں انھیں اپنی شادی کی پہلی رات گزارنی تھی۔ انھوں نے اپنے سلیپر اتارنے کے بعد ایک لمبی جماہی لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اتنے پھولوں کی آخر کیا ضرورت تھی؟ ان کی خوشبو کتنی زیادہ تیکھی ہے۔''

کمرے کا فرش اور بستر سب پھولوں سے پوری طرح بھرے ہوئے تھے۔ ہر جگہ چنبیلی اور گلاب کے پھول بکھرے دکھائی پڑ رہے تھے۔ باغیچے والی کھڑکی کھلی ہوتے ہوئے بھی کمرہ خوشبوؤں سے بھرا تھا، نواب صاحب نے اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تھوڑی ہی دیر بعد کہا تھا۔ اور شراب؟''

کملا نے پھولوں کی لڑیوں کو اٹھا کر غسل خانے میں رکھ دیا تھا، بستر اور فرش پر بکھری پنکھڑیوں کو جمع کر اس نے کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ اس کام میں اسے مشکل سے دس پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔ کام ختم کرنے پر جب وہ نواب صاحب کے پاس پہنچی تو وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے سونے کی کوشش کرنے میں لگے تھے۔ کملا نے انھیں دھیرے سے اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی وہ پوری طرح سو گئے۔ کملا کچھ دیر تک اپنے آنسو بہاتی رہی لیکن چونکہ وہ بھی دن بھر کی تھکی ماندی تھی، اس لئے اسے بھی جلدی ہی نیند آ گئی۔

شادی کے بعد ہم لوگوں نے کملا میں ایک عجیب سی تبدیلی پائی۔ اپنی عادت کے برخلاف وہ پوری طرح خاموش سی ہوگئی تھی۔ ماں کو اس کی اس تبدیلی پر بہت اطمینان ہوا لیکن ہم جیسے لوگ اس کی اس خاموشی سے حیران ہو اٹھے تھے۔

''کیا بات ہے کملا؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تم اس سے پیار کرتی ہو نا؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں؟'' کملا نے جواب دیا تھا۔

نواب صاحب کے تئیں اپنے پیار کو پالنے اسے بڑھاوا دینے اور سمجھنے میں ہی کملا کا پورا وقت لگ جاتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہو پایا کہ کتنے دنوں تک وہ اپنے کو اس کام میں لگائے رہی تھی۔ تبھی اس کی ملاقات موہن لال سے ہوئی۔

موہن لال یونیورسٹی میں استاد تھے۔ ان سے ملنے کے بعد کملا کو محسوس ہوا کہ شادی سے پہلے والی اس کی زندگی، جب وہ اپنی پڑھائی لکھائی میں مشغول رہا کرتی تھی، کتنی معنی خیز اور رومان پرور تھی۔ اس میں آج جیسی بے گانگی، خالی پن کہاں تھی۔ گھر کا سارا کام نوکروں کے ذمہ ہونے کی وجہ سے کملا نے اپنی اس پڑھائی کو پھر سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہفتہ میں ایک دو دن موہن لال اسے پڑھانے کے لئے آنے لگے، اپنے پڑھنے کے شوق اور ہر بات کو جاننے کی للک کی وجہ سے کملا ہر چیز کو آسانی سے دل میں بٹھا لیتی تھی۔ پھر موہن لال کا اس کے یہاں آنا جانا بڑھتا گیا اور ایک دن انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کملا کو پیار کرنے لگے ہیں۔

کملا حالانکہ خاص طور سے خوبصورت نہیں کہی جا سکتی تھی لیکن ہر پل علم و آگہی میں

ڈوبے رہنے والے موہن لال کے لئے وہ ایک ایسی کشش کی مرکز کی شکل میں نمودار ہوئی تھی جو کشش انھوں نے کسی بھی دوسری عورت میں نہیں پایا تھا۔ عرفان وآگہی کے تئیں اس کی پوری تلاش وجستجو اور موہن لال سے معاملات کرنے والی اس کی ذہانت...... اس کی یہ خوبیاں موہن لال کو کملا کی طرف مائل کرنے میں اور مددگار ثابت ہوئیں۔ کملا کی موجودگی ان میں ایک عجیب سا جذباتی ہیجان پیدا کردیتی اور جس خاموش اور پرسکون ماحول میں ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں وہ آگ میں گھی کا کام کرتی تھیں۔ موہن لال کے آنے کے وقت عام طور پر نواب صاحب گھر کے باہر ہوا کرتے تھے۔ اپنی شامیں ان کو اپنے دوست واحباب کے ساتھ شراب اور شاعری کے ماحول میں گزارنے کا شوق تھا۔ کملا کے جمع شدہ روپے پیسوں سے انھیں پہننے کے لئے شاندار کپڑے اور پینے کے لئے خوشبودار سگار مل ہی جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے ہر محفل میں نواب صاحب معروف ہوتے گئے اور ان کی موجودگی ہر بیٹھک کی شان سمجھی جانے لگی۔

کملا اس بات کو بالکل نہیں جان پائی کہ موہن لال کو اس سے اس قدر پیار ہے۔ موہن لال اس کے لئے صرف ایک دوست ایک استاد تھے۔ لیکن ایک دن کسی کڑے موضوع کو سمجھاتے ہوئے موہن لال نے ایک ایسی مثال کا استعمال کیا کہ خود اسے بھی ہنسی آگئی۔ شروع میں وہ اپنا منھ بند کرکے ہنستی رہی لیکن دھیرے دھیرے اس کی وہ ہنسی قہقہے میں بدل گئی۔ وہ اتنا ہنسی کہ اس کے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ اس دن اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ شادی کے بعد پہلی بار وہ اپنی پرانی طرز کی ہنسی ہنسی تھی لیکن اس احساس نے کملا کو خوش کرنے کے ساتھ ہی کچھ ڈرا بھی دیا۔

جولائی کی ایک گرم رات کو کھانے کے بعد جب وہ لوگ باہر لان میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے جارہے تھے تبھی اچانک اس کا بلب فیوز ہوگیا۔ کملا نے کہا۔ ''میرے پاس ایک اور بلب ہے، میں اسے لے آتی ہوں۔''

جب وہ اندر جانے لگی تو موہن لال نے اسے آواز دے کر بلایا۔ اندھیرے میں وہ کچھ مڑی ہی تھی کہ اس نے دیکھا موہن لال اس سے لگ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کملا اپنا کوئی ردعمل ظاہر کرتی، موہن لال نے اپنے ہاتھ کملا کی کمر میں ڈال کر اس کا بوسہ لے لیا۔ موہن لال کے اس جسمانی لمس سے وہ بہت زیادہ جذباتی ہوا ٹھی تھی اور نتیجتاً اس نے خود اپنے کو ان سے چمٹا لیا۔ اسی وقت انھوں نے کسی تانگے کے آنے کی آواز سنی۔

تانگہ گھر کے باہر آکر رکا اور تانگے والے نے آواز لگائی۔ ''گھر میں کوئی ہے؟'' بھرپور

کوششوں کے بعد اپنے کو موہن لال سے الگ کرتی ہوئی کملا باہر نکلی ۔ تانگے والے کے کندھے پر اپنا سر رکھے ہوئے نواب صاحب بے ہوش ملے ۔ کملا نے تانگے سے انھیں اٹھا کر موہن لال کی مدد سے سونے کے کمرے میں پہنچایا ۔ کچھ ہی دیر بعد نواب صاحب کو کچھ ہوش آیا ۔ نیند بھرے لہجے میں انھوں نے موہن لال کا شکریہ ادا کیا اور پھر پوری طرح سو گئے ۔ موہن لال کو وہیں چھوڑ کر کملا تانگے کا کرایہ دینے چلی گئی تھی اور جب تک تانگہ چلا نہیں گیا وہ وہیں کھڑی رہی تھی ۔

لوٹنے کے بعد جب اس نے نواب صاحب کے کمرے کی روشنی بجھی دیکھی تو اس نے سمجھا کہ موہن لال شاید اسے بتانے کے بعد واپس چلے گئے ہیں لیکن پھر جب باہر کے اندھیرے میں اس نے موہن لال کو کھڑا پایا تو اس کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی ۔ وہ اس کے پاس پہنچ گئی اور پھر اس طرح کہ نواب صاحب کے کمرے تک ان کی آواز نہ پہنچنے پائے دونوں محبت کی سرشاری کے ساتھ محو گفتگو ہو گئے ۔ گرمی کی وجہ سے ان کے جسم پسینے سے تر بتر ہو رہے تھے اور ان کے کپڑے پوری طرح سے گیلے ہو کر بدن سے چپکے جا رہے تھے ۔

اسی رات کملا کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ موہن لال کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی ۔ پھر ایک ہفتہ کے اندر ہی اپنا یونیورسٹی والا ٹھکانہ چھوڑ دیا اور کملا کے یہاں Paying guest بن کر آ گئے ۔ تب سے آج تک اسی کے پاس رہ رہے ہیں ۔

نواب صاحب کملا کے روزمرہ کے کاموں کی مشغولیت سے ہمیشہ ہی بے نیاز رہتے آئے تھے ۔ اس بات پر بھی انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا ۔ paying guest کا مطلب تھا پیسوں کی آمدنی ۔ اور انھیں اندازہ تھا کہ کملا کے ذریعہ لایا ہوا اور جمع شدہ پیسہ زیادہ دنوں تک نہیں چلنے والا ہے ۔ اسی کو دیکھتے ہوئے اس انتظام سے انھیں خوشی ہوئی تھی ۔ کملا کے ساتھ اکیلی زندگی گزارنا ان کے لئے ایک امتحان کی طرح مشکل ہوتا جا رہا تھا اور کملا بھی اپنی شخصیت کو پوری طرح بھلا کر عام عورتوں کی طرح اپنے وجود کو مسمار نہیں کر پائی تھی ۔

شام ہوتے ہی نواب صاحب سج دھج کر اپنے دوستوں کے یہاں چل دیتے ۔ تب کملا اور موہن لال کو آزادی کے ساتھ ملنے کا موقع ملتا ۔ کملا کے تئیں اپنے پیار کے جوش میں موہن لال نے یہ سمجھا کہ اس سے دور رہ پانا اب ان کے لئے قطعی ممکن نہیں رہ گیا ہے ۔ دوسری طرف کملا نے بھی جو ہمیشہ پیار کی پیاسی رہی تھی ، موہن لال کے ذریعہ اپنی امنگوں کی تکمیل کا ایک مناسب ذریعہ پا لیا تھا ۔ میں نے اس کے پہلے اسے کبھی اتنا کھلا ، اتنا خوش نہیں دیکھا تھا ۔

موہن لال جس بے پناہ سرتوں کے ساتھ ہنستا تھا اسی گہرائی کے ساتھ وہ پیار بھی کرتا تھا۔ کملا کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے موہن لال کے آنے سے پہلے اس کی زندگی پوری طرح بستر مرگ پر تھی۔ ابھی تک وہ اندھیرے میں رہتی آئی تھی، موہن لال کے ذریعہ سے سورج کی روشنی ملی تھی۔ سورج کی اس چمکتی روشنی میں اس کا اصلی رنگ روپ پوری طرح کھل اٹھا۔

نواب صاحب نے کملا کے اندر ہونے والی ان تبدیلیوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ دوسری طرف کملا نے بھی نواب صاحب کے تئیں اپنے روزمرہ کے برتاؤ میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ نواب صاحب کو وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لئے بھی وہ کملا پر پوری طرف منحصر تھے۔ اور ان کی یہ عادت آسانی سے ختم ہونے والی نہیں تھی۔ کملا کو یہ بھی معلوم تھا کہ شروع سے ہی وہ کبھی اس کی طرف زیادہ راغب نہیں رہے اور نہ کبھی انھوں نے اس کی کوئی اداکاری کی۔ ان کے ساتھ کملا کا ایک طرفہ پیار ہی رہا تھا، اس لئے وہ انھیں چھوڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

دھیرے دھیرے موہن لال بھی خاندان کے اصولوں کے مطابق چلنے لگے۔ نواب صاحب کو اگر کبھی اس بات کا خیال بھی آتا کہ موہن لال اور کملا ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے ہیں تو انھوں نے اسے واہیات مان کر اڑا دیا ہوتا۔ آخر کملا میں ایسا ہی کیا جو کسی مرد کو اپنی طرف مبذول کر سکے؟ نواب صاحب کے مطابق نہ تو اس میں کوئی حسن تھا اور نہ کوئی عورت پن کی خوبی۔ اس کی خاص خصوصیت اس کی صحت تھی اور ہر بات کو جاننے کی اس کی لگاتار للک ،ان باتوں کا کسی عورت میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

وہ دونوں زیادہ وقت ایک ساتھ بھی نہیں رہتے تھے۔ نواب صاحب کو ایسی سیلونوں میں جانا پسند تھا جہاں مرد اور عورتیں صرف ساتھ ساتھ ناچنے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر وہ کملا کو اپنے ساتھ کبھی نہیں لے گئے۔ پاس پڑوس میں ان کے ان رویوں کا کبھی کوئی ذکر ہی نہیں ہوا۔ سبھی لوگوں کو اس بات کی جانکاری تھی کہ پڑھنے پڑھانے کی وجہ سے کملا کے لئے کسی سماجی پروگرام میں حصہ لینا آسان نہیں۔

اس کے بعد کملا نے تین لڑکوں کو جنم دیا۔ اسے خود بھی اس بات کا یقین نہ ہو سکا کہ وہ لڑکے نواب صاحب کے تھے یا موہن لال کے۔ ان کے چہروں سے بھی ایسی کسی بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نواب صاحب اس سے اور بھی دور رہنے لگے۔

موہن لال اور کملا اپنے نظریاتی ہم آہنگی کے باعث ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم

لگنے لگے تھے۔ نواب صاحب لگتا تھا جیسے ان کے سامنے بالکل پرائے مہمان ہوں۔ دنوں دن دبلے ہونے کے بعد بھی اپنے رہن سہن اور پوشاک کے تئیں وہ پوری طرح حاضر دماغ رہتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے افراد کے مقابلے وہ سبھوں سے مختلف تھے۔ اگر انھوں نے کبھی دیکھا بھی کہ ان کے رہنے کے ڈھنگ میں بدلاؤ آتا جا رہا ہے یا کملا نوکروں کی تعداد دن بدن کم کرتی جا رہی ہے یا گھر کا خرچہ چلانے کے لئے اسے اپنے زیورات بیچنے پڑ رہے ہیں تب بھی وہ کچھ نہیں بولے۔ کملا کو کسی طرح گھر چلانا ہی تھا اور اپنے اس فرض کے تئیں وہ پوری طرح مستعد تھی۔ موہن لال کی تنخواہ ان کے ذریعہ لکھے گئے مضامین کے محنتانے اور کملا کی اپنی جمع کئے ہوئے پیسوں کے ذریعہ تینوں لوگوں کا خرچ چل رہا تھا۔ اسے کسی دوسرے کی مدد لینے کی عادت بھی نہیں تھی۔ اسی سے جب اس نے اپنا پرانا مکان بیچنے کا ارادہ کیا تو نواب صاحب نے بھی سوچا کہ اتنے بڑے مکان کی ضرورت آخر کیا ہے؟

لکھنؤ چھوڑنے سے پہلے جب میں آخری بار کملا کے یہاں گئی تو اس نے بتایا کہ نواب صاحب غسل کر رہے ہیں۔ موہن لال کے ساتھ میں نے اس کی چائے میں شرکت کی۔

''کیا وہ اب بھی ہر شام باہر جاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہاں!'' کملا نے بتایا تھا۔ وہ شام کو گھر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ گھر میں رہنے سے ان کی اداسی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی باہر گھومنے پھرنے سے ان کی تندرستی ٹھیک رہتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ تم نے اپنی پڑھائی کیوں بند کر دی؟ تمھیں تو اب تک اونچی ڈگری مل جانی چاہیے تھی۔''

کملا گزری ہوئی باتوں کو یاد کر کے مسکرائی، بولی۔ ''تم بھی کیا سوچتی ہو؟ میں نے ڈگری لی ہے، وہ بھی آنرز۔ موہن لال کو میرے ساتھ بہت محنت کرنی پڑی۔ کاش! آج پاپا زندہ ہوتے تو انھیں کتنا اچھا لگتا۔''

میں سوچ رہی تھی کہ یہ اچھا ہی ہوا جو کملا کو اس حالت میں دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہیں رہے۔ اس حالت میں اپنی پیاری بیٹی کو دیکھ کر کیا انھیں گہرا دکھ پہنچتا؟

تبھی نواب صاحب غسل کر کے باہر نکلے۔ بالکل صاف، سنورے اور چست درست! انھوں نے ٹاٹا کے لہجے میں اپنا ہاتھ ہلایا اور بتایا کہ کسی ضروری کام سے انھیں فوراً ہی کہیں جانا ہے۔ مہنگے پاؤڈر کلون کی خوشبو ہوا میں پھیلاتے ہوئے وہ گھاس بھرے راستے سے باہر نکل

رہے تھے۔ لکھنؤ میں پرانے سیلن اب قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ شعر، شاعری اور ناچ گانا اب بھی شام کو تفریح کا ذریعہ تھے۔ لیکن بہت ہی کم لوگ اس طرف توجہ دے پاتے تھے۔ نواب صاحب ایسے ہی گنے چنے لوگوں میں تھے۔

مجھے لگا کہ مجھے کملا کی کوئی مدد کرنی چاہئے۔ پاپا میرے لئے کافی کچھ چھوڑ گئے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ کملا ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ اسی لئے میں نے کملا سے یہ کہنا چاہا کہ میرے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کا بھی حق ہے۔ جانے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا کوئی ایسی بات ہے جو میں تمہارے لئے کرسکوں؟ اب میں تمہارے پاس جلدی جلدی آتی رہوں گی۔''

کملا میری بات سن کر اچانک مغموم ہو اٹھی۔ لگتا تھا، اس کے منہ سے لفظ ہی نہیں نکل پائیں گے۔ تبھی بے حد شرماتی ہوئی سی وہ بولی: ''ایک کام ضرور بتا سکتی ہوں۔ نواب صاحب جس طرح کے سگریٹ پسند ہیں ان کو خرید پانا میرے لئے ممکن نہیں لگتا۔ ان کے دام بھی یکایک ہی چوگنا ہو گئے ہیں۔ اگر تم کبھی بھیج سکو تو

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' میں نے جواب دیا تھا۔ پھر بولی تھی۔ ''لیکن کملا میں تو کچھ اور ہی دینا چاہتی تھی۔ کیا تمہیں اپنے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں؟''

اپنی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک لاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''پگلی میرے پاس تو سب کچھ ہے۔''

میں ہاتھ ہلا کر اس سے رخصت ہوئی۔ نوکر رسوئی گھر کے باہر چائے کے برتن صاف کر رہا تھا اور شام کے اخبار کے صفحے آرام کرسی سے اڑ کر گھاس پر بکھر رہے تھے۔ کملا موہن لال کو ساتھ لے کر اندر جا چکی تھی۔

☆☆☆

نین تارا سہگل کی پیدائش ۱۰ مئی ۱۹۲۷ء کو الہ آباد میں ہوئی۔ تعلیم ویلیزلی کالج، میساچوسیٹس، امریکہ سے تاریخ میں بی اے اور لیڈز یونیورسٹی، یوکے سے ادب میں ڈاکٹر کی ڈگری لی۔ بیس سے زیادہ کتابیں شائع شدہ۔ جن میں پریزن اینڈ چاکلیٹ کیک، فرام فیر سیٹ فری (خودنوشت)، اے ٹائم ٹو بی ہیپی، اے سچوئیشن ان نیو دہلی، رچ لائک اس، پلانز فار ڈیپارچر، مسٹکن آئیڈنٹی، لیسر بریڈس (ناول)، ریلیشن شپ (خطوط کا مجموعہ) اور فریڈم موومنٹ ان انڈیا (سیاسی تبصرے) خاص ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، سنکلیر، کامن ویلتھ اور یوریشیا کتھا انعامات سے اعزاز یافتہ۔ ملک، غیر ملک کے اہم جریدوں میں کالم نویسی۔

بنگالی کہانی

کیرتی ناشا کے دو کنارے

سنیل گنگو پادھیائے

دوپہر تک آندھی پانی کا کوئی گمان بھی نہیں تھا۔ دور نیلے آسمان میں سیاہ نقطے جیسا منڈلاتا چیلوں کا غول۔ نیچے کی طرف اڑتے بگلوں کا جھنڈ۔ پھاگن کا مہینہ اپنے اختتام پر تھا۔ اتر کی سرد ہوا کے جھونکے تو نہیں تھے لیکن گرمی کی تپش کی شروعات بھی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

آگے پیچھے بھالا لئے ہوئے چھ پہرہ داروں اور ایک بندوق بردار سپاہی کے ساتھ شری پور سے ایک پالکی روانہ ہوئی اس کو تال ہری گاؤں جانا تھا جہاں کی مسافت ڈھائی تین گھنٹے میں طے ہوتی تھی۔ پالکی کے دونوں طرف موٹے موٹے پردے پڑے تھے۔

انھوں نے آدھا راستہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورا کیا۔ ویسے کوئی رکاوٹ آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان دنوں بنگال میں لٹیروں یا ڈاکوؤں کا تشدد عروج پر تھا لیکن سات ہتھیار بند محافظ اور ان میں سے ایک تو بندوق بردار تھا جسے دیکھ کر لٹیروں یا ڈاکوؤں کا گروہ کی ان پر حملہ کرنے کی ہمت جواب دے دیتی۔

کہار دوڑے دوڑے چلتے ہیں۔ وہ اسی طرح چلنے کے عادی ہیں۔ پورا ایک پہر وہ اسی طرح راستہ طے کر سکتے ہیں لیکن ان ساتھ چلتے پا پیادہ پہریدار اس طرح نہیں چل پاتے، وہ ہانپ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو بیچ بیچ میں رک کر آرام کرنا پڑ رہا تھا۔

ادھر کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ تھوڑی دوری پر پدما ندی تھی۔ کچھ کھنڈر نما گھر، آنگن کو دیکھ کر اندازہ لگتا ہے کہ کبھی یہاں بھی گھنی آبادی تھی۔ شاید کسی مہاماری میں اجڑ گئی ہے۔ ندی کے کنارے بسے ہوئے گاؤں میں فرنگی سمندری لٹیرے آکر خوب تباہی مچاتے تھے۔ ویسے ان دنوں یہاں کی بستی اجڑ جانے کی وجہ سے وہ جزیرہ کی طرف چلے گئے تھے۔

کھلے میدان میں شاخ درشاخ پھیلا پیپل کا ایک تناور پیڑ تھا۔ اس کے بالکل قریب تاڑ کے تین پیڑ تھے۔ وہیں پر کہاروں نے پالکی اتاری۔ کہار اپنی کمر میں کسے ہوئے انگوچھے کو کھول کر پسینہ پونچھنے لگے۔ کچھ قریب کے تالاب میں اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر پانی پینے گئے۔

پالکی میں دو خاتون تھیں۔ ایک اونچے خاندان کی باوقار جوان خاتون اور دوسری ان کی درمیانی عمر کی کنیز۔ وہ خاتون سفید لباس میں تھی۔ جسم پر ایک بھی زیور نہیں تھا۔ ان کی مانگ بھی سیندور سے خالی تھی۔ ان کا رنگ تپتے کندن جیسا تھا۔ اس لئے پیدا ہوتے ہی ان کا نام سورن مئی رکھا گیا تھا۔ وہ ایک بے حد پردہ نشیں خاتون تھیں۔ ان کے لئے ایک کلش میں پینے کا پانی اور کچھ پھل وغیرہ لایا گیا تھا۔ آرام کے وقت انھوں نے صرف پانی پیا۔ پھر کنیز کے بار بار کہنے پر ایک پیٹھی کھائی۔

اچانک ہی بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑی۔ آسمان میں کب بادل گھر آئے کسی کو احساس ہی نہیں ہوا۔ جہاں تک نظریں دوڑتی دور افق کے اس پار تک بادل ہی بادل چھائے تھے۔ ان کی گڑگڑاہٹ سے دل کانپ اٹھتا۔

وہ بندوق بردار اس قافلے کا سربراہ تھا جس کا نام ولبھ رام تھا۔ وہ کھڑا ہوکر سمت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ علاقہ نہ صرف سنسان تھا بلکہ یہاں پیڑ بھی کم تھے۔ کچھ دور پر مندر کا گنبد نظر آرہا تھا۔ ولبھ رام کو پتہ تھا کہ وہ مندر بھی اب کھنڈر بن چکا ہے۔ ویسے اس کے پاس سے اگر نکل لیا جائے تو کچھ ہی دوری پر تال مچھری گاؤں جانے کا راستہ مل جائے گا لیکن آسمان میں سیاہ بادل چھائے تھے۔ ایسے بادل چھانے پر گھنگھور بارش ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بجلی بھی گرتی ہے اس لئے ابھی تو پیڑ کے نیچے انتظار کرنا ہی بہتر ہوگا۔

کچھ دیر تک ماحول میں ایک عجیب سا سناٹا چھایا رہا۔ نہ بجلی کڑکی، نہ پتے ہلے، قدرت جیسے خاموش کھڑی تھی۔ پھر افق کے اس پار سے جیسے ایک ٹھنڈا جھونکا سا آیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے طوفان میں بدل گئے اور اس کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ کچھ دیر پہلے کہیں ہوا کا نام ونشان بھی نہیں ہے اور اتنی تیز ہوا چل رہی تھی کہ لگ رہا تھا کھڑے رہنا دوبھر ہے کہ کہیں ہوا اڑا کر نہ لے جائے۔ اب وہ طوفانی ہوا پیڑ کی موٹی موٹی شاخیں توڑنے لگی۔ اتنی تیز بارش تھی کہ مندر کا گنبد بھی اب صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ زوروں کی بجلی کڑک رہی تھی تبھی پیپل کے پیڑ کی ایک بڑی سی شاخ چرمرا کر گر پڑی۔ فوراً اس پالکی کو کھلے آسمان کے نیچے لاکر رکھا گیا۔ اس بیچ بڑی بڑی بوندوں کے

ساتھ والے بھی بڑھنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کسی کی دردناک چیخ سنائی پڑی۔

پہلے اس زوردار بارش میں کوئی سمجھ نہیں پایا کہ یہ چیخ کہاں سے آئی! پھر اس بارش میں نظریں دوڑا کر دو تین لوگ ایک ساتھ چلا پڑے۔ ''بجلی گری ہے، بجلی گری ہے، ملک چند ختم ہو گیا''۔ ملک چند نام کا پہرہ دار پانی سے سر چھپانے کے لئے ایک تاڑ کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ہی بجلی گری تھی۔ وہ زمین پر گر گیا تھا۔ اس کا مردہ جسم بری جھلسا ہوا تھا۔ سبھی تھوڑی دوری بنائے اس کی نعش کو گھیرے کھڑے تھے۔ اس کی لاش سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

بجلی کیسے گرتی ہے اس کی وجہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھی۔ کیا آسمان سے آگ کا گولہ گرتا ہے؟ خیر ملک چند کی لاش کو اسی طرح چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ یہی تو اس قسمت میں تھا، قسمت سے بڑا تو کچھ بھی نہیں ہے! لیکن اس وقت یہاں کھڑے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے، کھلا میدان ہو یا پیڑ کی چھاؤں۔ بجلی کہیں بھی کسی وقت گر سکتی ہے۔ ایسے موسم میں ہر بار کچھ لوگ بجلی گرنے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی کہار اور پہرہ دار اس پالکی کو وہیں چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے کے لئے بے تحاشا بھاگنے لگے۔ ان میں ولبھ رام ہی ذمہ دار شخص تھا اس لئے وہ بھاگ نہیں سکا۔ اس نے ایک بھاگتے کہار کی گردن دبوچ کر کہا۔ ''سور! رانی دیدی کو چھوڑ کر کہاں بھاگا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تیری گردن صحیح سلامت رہے گی؟''

ولبھ رام اور اس کہار نے مل کر وہ پالکی اٹھائی پھر وہ دونوں اس کھنڈر نما مندر کی طرف دوڑے۔ بندوق ولبھ رام کے پاس تو تھی لیکن اس کے کارتوس بارش میں بھیگ کر بیکار ہو گئے تھے۔ اس دھواں دھار بارش اور طوفان کو کاٹتے ہوئے مشکل سے پالکی کو لے کر دونوں اس ٹوٹے پھوٹے مندر کے اندر آئے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ دوسرے کہار اور پہرہ داروں نے بھی الٹے پاؤں لوٹ کر اس مندر کے اندر پناہ لی۔۔

کبھی یہ ایک شوالہ ہوا کرتا تھا۔ ابھی اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے نہیں بلکہ انسان کے ہاتھوں ہی اس کی ایسی بربادی ہوئی ہوگی۔ مندر سے شولنگ بھی موجود نہیں تھا۔ کہتے ہے کہ کالا پہاڑ نام کے کسی ظالم سیناپتی نے اس علاقے کے بہت سارے مندروں کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ پالکی میں بیٹھی دونوں عورتوں میں ذرہ برابر بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ان کو یقین تھا کہ ساتھ میں آئے ہوئے کہار اور پہرہ دار اپنی اپنی ذمہ داری نبھائیں گے۔ کیونکہ فرض نبھانے میں غفلت ان کی جان لینے کے لئے کافی ہے۔ کچھ ہی دیر میں طوفان تھم گیا۔ دھیرے دھیرے بارش رک گئی

۔اس کے بعد اس اندھیرے مندر میں سورج کی کرنوں کی روشنی آتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ آسمان اب صاف ہو چکا تھا۔ اس بیچ کبھی بھاگے ہوئے کہار اور پہرہ دار اپنی اپنی جان کی امان کی خاطر لوٹ آئے تھے۔ اب ولبھ رام کے حکم پر وہ پالکی اٹھا کر باہر آ گئے۔ اتنی تیز بارش کے بعد ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ ایک ساتھ انگنت چڑیا چہچہا رہی تھیں۔ شاید مصیبت ٹلنے کی خوشی میں۔ اس خاص شوالے کے آس پاس اور کئی کمرے بنے تھے۔ ان کی حالت بھی ویسی ہی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ ان میں سے ایک کمرے کے سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ شاید ان لوگوں نے بھی اس موسلا دھار بارش سے بچنے کے لئے یہاں پناہ لی تھی۔ ان میں سے ایک نے ولبھ رام کی طرف دیکھ کر کہا۔' کس طرف جایئے گا حضور؟ اف، کیسی مصیبت آئی تھی، باپ رے باپ''

انجان لوگوں سے اپنی منزل کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے ولبھ رام نے رعب دار آواز میں کہا۔'' ہم پچھم کی طرف جائیں گے۔'' اس شخص نے کہا۔'' ہم بھی تو ادھر ہی جائیں گے، چلئے ایک ساتھ چلتے ہیں، زمانہ اچھا نہیں ہے۔''

ولبھ رام نے ان دیہاتیوں کو اپنے منھ لگانے کے قابل نہیں سمجھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔'' ہم راجہ کے سپاہی ہیں، ہمیں ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی راہ ناپو۔''

قریب ہی پیڑ سے ایک گھوڑا بندھا تھا۔ اس کے پیر کے دونوں طرف دو صندوق لٹک رہے تھے۔ وہ آدمی ایک ہی چھلانگ میں اس گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔ پھر ادھر آ کر کہنے لگا'' آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں حضور؟ میں تو بھلے کے لئے کہہ رہا تھا۔ سب ساتھ چلنے سے اپنی طاقت بڑھتی ہے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے گابائیا کے میدان میں ڈکیتی ہوئی۔''

گھوڑ سوار اور پیدل کے رتبے میں ایک بڑا فرق رہتا ہے۔ پیدل آدمی کو نظریں اٹھا کر بات کرنی پڑتی ہے، جس سے ولبھ رام خود کو کمتر محسوس کر رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس کی خواہش تھی کہ راجہ کے گھوڑ سواروں میں اس کا بھی نام آئے مگر نہ جانے کون اس کو پیچھے سے لنگڑی مار رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس پر چھوٹے کمار کی خاص نیک نظریں نہیں ہیں۔ بغیر کوئی جواب دیئے اس نے بندوق کے ٹریگر پر اپنی انگلی رکھی۔ کسی بھی ڈاکو کے گروہ کے پاس ایسا جدید اسلحہ نہیں تھا۔

اس کا اشارہ سمجھ کر وہ گھوڑ سوار ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا۔' سپاہی جی! اس بارش میں آپ تو پوری طرح بھیگ چکے ہیں۔ آپ کے پاس کارتوس تو صحیح سلامت ہے نا؟ ان کو تو آپ نے سنبھال کر رکھا ہوگا۔ ارے، اس ڈال پر دو پرندے بیٹھے ہیں۔ ذرا آزما کر دیکھ لیجئے، نشانہ صحیح لگتا بھی ہے یا نہیں!''

اس کے اس باتونی پن کو نظر انداز کرتے ہوئے ولبھ رام نے اسی رعب کے ساتھ کہا۔'' سامنے سے ہٹ جا ہمیں جانا ہے۔''

اس نے کہاروں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔'' تم لوگ منہ اٹھائے کیا دیکھے جا رہے ہے؟ چل، چل دن ڈھلنے کو آیا۔''

اس گھوڑسوار نے کہا۔'' ٹھہریے، ٹھہریے، جناب۔ اتنی جلدی بھی کس بات کی؟ آپ تو باعزت آدمی معلوم ہوتے ہیں، کسی رشتہ دار کے یہاں جا رہے ہیں کیا؟ ساتھ میں مٹھائی پکوان تو ضرور ہوں گے۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔''

ولبھ رام نے کہا۔'' نہیں، ساتھ میں وہ سب کچھ نہیں ہے۔ تیری ہمت تو کچھ زیادہ ہی ہے، تو ہمیں دیر کروا رہا ہے۔''

اس گھوڑسوار نے بناوٹی رونی آواز میں کہا۔'' بہت بھوک جو لگی ہے، کچھ دیجیے تو سہی۔''

تبھی پالکی پر پڑے پردے ذرا کھلے، وہاں سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور اس گھوڑسوار کی طرف کیلوں کا ایک گچھا پھینکا۔ وہ آدمی دوبارہ ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا۔'' کیلا؟ ہمیں کیا بندر سمجھ رکھا ہے؟ '' اس کے دوسرے ساتھی بھی اس بیچ اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس آدمی نے کہا۔'' ابے دیکھ، اس پالکی میں کیا ہے؟''

ولبھ رام نے کہا۔'' اے، بے ادب! ہوشیار!''

ان لٹیروں نے ولبھ رام کی کوئی پرواہ ہی نہیں کی۔ ان میں سے دو پالکی کی طرف بڑھے۔ اب پالکی کے ساتھ آئے ہوئے چھ بھالا دھاری پہرے دار تن کر کھڑے ہو گئے۔

اُدھر گھوڑے کے دونوں طرف جو صندوقیں لٹک رہی تھیں، دوسرے لٹیروں نے ان صندوقوں کو کھول کر خنجر، چاقو اور دو تلواریں نکالیں۔ ایک تلوار اس گھڑسوار نے اٹھایا، ولبھ رام کے پاس بندوق کے ہوتے ہوئے بھی وہ اسے کام میں نہ لا سکا۔ کارتوس بھیگ کر کاغذ بن چکے تھے۔ ان حالات میں گھڑسوار آسانی سے ولبھ رام کو قتل کر سکتا تھا، لیکن اس کے بدلے وہ ولبھ رام کے چاروں طرف چکر کاٹ کاٹ کر تلوار کی نوک سے اس کی گردن، کمر اور سینے کو چھو رہا تھا۔ اور قہقہے لگائے جا رہا تھا، اس کے بعد اس نے پالکی کے ساتھ آئے ہوئے ان بھالا دھاری پہرہ داروں سے کہا۔'' ابے! بغیر بندوق کے سپاہی کے بھائیو! اگر اپنی بیویوں کو بیوہ نہیں کرنا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ کر ایک کنارے کھڑے ہو جاؤ۔''

پہرہ داروں میں ایک شخص اس دھمکی سے نہیں ڈرا۔ وہ پالکی کی حفاظت کے لئے اکیلا وہیں جما رہا۔ ایک لٹیرا کے قریب آتے ہی، اس نے اس لٹیرے کی جانگھ میں بھالے کی نوک چبھودی۔ اس گھڑسوار نے اس کے نزدیک آکر ڈراونی آواز میں کہا۔ ''ارے تو کس مائی کا لال! ذرا دیکھوں تو تیری گردن میں کتنی طاقت ہے؟'' اس نے تلوار سے اس پہرہ دار کی گردن پر ایک وار کیا! اس نے پوری طرح اسے مارا نہیں، صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ اب کوئی ان کو روکنے والا نہیں رہا۔ دو لٹیروں نے ایک ہی جھٹکے میں پالکی پر پڑے پردے ہٹا دیے، ان لوگوں کا اندازہ صحیح تھا۔ پالکی میں ان دو عورتوں کے علاوہ کچھ مٹی کے گھڑوں میں عمدہ پکوان مٹھائیاں، ارواچاول، دو نئی دھوتی، پھل وغیرہ تھے۔ یہ دونوں کسی پرسے کے لئے جارہی تھیں۔ وہاں یہ ساری چیزیں لے جانے کا ہی رواج تھا۔

لٹیرے ان پکوانوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لوگ گھڑوں کا ڈھکن کھول کھول بھکڑوں کی طرح کھانے لگے۔ اس گھڑسوار نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔ ''اب دیکھ، ان کے پاس کتنے گہنے ہیں؟ دونوں عورتوں کو کھینچ کر باہر نکال۔''

اب دلبھ رام ہاتھ جوڑ کر کانپتی آواز میں کہا۔ ''بھائی، سامان جو لینا ہو لے لو، مہربانی کر کے ہماری رانی دیدی کو ہاتھ مت لگاؤ، میں تمہارے پیر پڑتا ہوں، ان کی عزت پر ہاتھ مت ڈالو، بس اتنا سا رحم کرو۔''

اس گھوڑسوار نے بھنویں سکوڑ کر دلبھ رام کی منتیں سنیں، پھر اپنے گروہ کے لٹیروں سے بولا۔ ''نکال، نکال باہر اسے''

ایک لٹیرے نے جیسے ہی سورن مئی کا ہاتھ پکڑا۔ اس کی کنیز دھاڑیں مار کر رونے لگی ''ان کو مت پکڑیئے، مت چھوئیے ان کو، ہمارے ساتھ اور کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس لٹیرے نے اس کنیز کی آنسو بھری التجا کو نظر انداز کر کے سورن مئی کو باہر نکالنے کے لئے زور سے کھینچا۔ ''اتنا دیکھتے ہی دلبھ رام نے دوڑتے ہوئے آکر اس لٹیرے کو کس کر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑ، چھوڑ، کیا تجھے دین دھرم کا بھی خوف نہیں ہے؟ ایک بیوہ کے جسم پر ہاتھ لگاتا ہے۔'' اس لٹیرے نے مڑ کر دلبھ رام کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا، دلبھ رام زمین پر گر پڑا۔

دو لٹیروں نے سورن مئی کو پالکی سے باہر نکال کر اس گھوڑسوار کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس بیچ انھوں نے گھونگھٹ میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ ایک بھی لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلا تھا۔

چنتا داسی چیختے جا رہی تھی، اس گھوڑ سوار نے کہا۔"ارے ذرا کوئی گھونگھٹ تو ہٹا، اس کا چاند سا چہرہ تو دیکھوں ذرا۔"

سورن مئی پتھر کی بت بنی کھڑی رہی۔ ان کے چہرے پر پڑا گھونگھٹ ہٹ گیا۔

وہ گھوڑ سوار آنکھیں پھاڑے اس کے بے مثال حسن کو دیکھتا رہا۔

پھر اس نے بے حد جوشیلے انداز میں چلا کر کہا۔"تو چاند سے بھی خوبصورت ہے، آج صبح صبح بھگوان کو پوجا چڑھا کر آیا ہوں، ان کی کرپا ہے، ایسی بیش قیمتی رتن مل جائے تو اور سب کچھ بے کار ہے۔" چنتا داسی اپنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔" ہے بھگوان ہماری رکشا کرو، ہماری عزت بچا لو، ان پاپیوں کو تم سزا دو، ہے بھگوان۔۔۔۔"

روتے روتے اس کی آواز رندھ گئی۔

لٹنے والے اور لوٹنے جانے والے دونوں بھگوان کو یاد کر رہے تھے۔

اب گھوڑ سوار نے کہا۔"اے دانو، اے پھاگو، اس عورت کو میرے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھا دے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے، باقی کا سارا مال آپس میں بانٹ لے۔"

سورن مئی نے اس بار بھی اپنے بچاؤ میں کچھ نہیں کیا۔ ان کی دونوں آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ چنتا داسی ان کو کس کر پکڑے تھی۔ دونوں لٹیرے ان کو کھینچ رہے تھے۔

مورتی کے بغیر ایک کھنڈر نما مندر۔ سنسان وسیع میدان، کچھ دور پر گھنے پیڑوں کا سلسلہ، اتنی گھنگھور بارش کے بعد ماحول میں خاموشی چھائی تھی، اب لگتا تھا کہ اس دنیا میں کہیں کوئی دکھ مصیبت نہیں ہے۔ ان دور کھڑے پیڑوں کے جھرمٹ سے دو گھوڑ سوار نکل کر ادھر ہی آ رہے تھے، دونوں جوان تھے، اچھے خاصے پہناوے میں سجے دھجے تھے، ان میں ایک ذرا موٹے سے گنجے، دوسرا نوجوان چھریرا، مضبوط جیسے فولاد سے بنا ہو، دونوں کے چہروں پر کالی، گھنی قرینے سے بنی داڑھی تھی، آہستہ آہستہ گھوڑا کو آگے بڑھاتے ہوئے دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے، یہ دونوں مندر کی جانب نہیں بلکہ اس کی مخالف سمت کو بڑھ رہے تھے کہ تبھی کچھ لوگوں کی بات چیت اور خاص کر ایک عورت کے رونے کی آواز سنائی دی، اس موٹے گھوڑ سوار کا نام داؤد تھا اور دوسرے کا نام عیسیٰ تھا، داؤد نے کہا۔"وہاں کیا گڑ بڑ ہو رہا ہے، اس مندر میں تو کوئی پوجا وجا کرنے نہیں آتا، یا کچھ چڑھانے کو نہیں آتا۔"

عیسیٰ نے کہا۔"میں اس راستے سے اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ آج تک وہاں کوئی انسان

نہیں دیکھا۔''

داؤد نے کہا'' چلو ایک بار چل کر دیکھ لیں''

عیسیٰ نے کہا'' ضرورت کیا ہے۔ مجھے جلد سے جلد گوجھاباڑی پہنچنا ہے'' تبھی دور سے آتی ہوئی رونے کی وہ آواز اور تیز ہوگئی تو داؤد سے رہا نہ گیا۔'' نہیں چلو ایک بار چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں۔''

اس بیچ دو لٹیرے چھنا داسی کو زمین پر گرا کر سورن مئی کو گھوڑے پر چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ گھوڑ سوار اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر سورن مئی کو اوپر کھینچ رہا تھا۔

وہاں قریب پہنچ کر دونوں گھڑ سوار سمجھ گئے کہ آخر یہاں کیا ماجرا ہے۔ داؤد نے گرج کر کہا۔'' اے، رک، رک اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو۔۔۔۔۔''

وہ گھوڑ سوار لٹیرا سورن مئی کو پانے کی لالچ میں پاگل ہوا جا رہا تھا، اس نے داؤد کی للکار کو سنجیدگی سے نہیں لیا، وہ اس عورت کو گھوڑے پر چڑھانے میں لگا ہوا تھا، چھنا داسی کو ایک لٹیرے نے اپنے پیروں تلے دبا رکھا تھا، وہ اس حالت میں بھی ان دو اجنبی گھڑ سواروں کو دیکھ کر پھپھک پڑی۔'' بچا لیجئے، ہماری رکشا کیجئے۔'' داؤد اور عیسیٰ نے اپنی اپنی میان سے تلواریں نکالیں۔ اب جنگ چھڑ گئی۔

ان لٹیروں میں گھوڑ سوار کو تلوار بازی آتی تھی لیکن عیسیٰ کی چابک دستی کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ تھوڑی ہی دیر میں عیسیٰ نے اس کے تلوار پکڑے ہاتھ پر ایسا وار کیا کہ اس کی دو انگلیاں کٹ گئیں اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ داؤد دوسرے لٹیروں کا سامنا کر رہا تھا، یکا یک ان لٹیروں میں سے ایک لٹیرا عیسیٰ کو پہچان کر چیخ پڑا۔'' ارے باپ رے، کس سے پالا پڑا ہے، اے پون، یہ تو کوئی ملک الموت ہے، بھاگ، بھاگ۔۔۔'' فوراً ہی وہ لٹیرے بغیر کچھ کہے بے تحاشا بھاگنے لگے۔

داؤد اور عیسیٰ اپنے اپنے گھوڑوں پر سے زمین پر اترے، اس قافلے میں ان لٹیروں کے ہاتھوں کسی کی جان نہیں گئی تھی، ہاں دو گھائل ضرور ہو گئے تھے، جو صحیح سلامت لیکن خوف کے مارے سہمے ہوئے تھے، وہ اب آگے بڑھ کر ان دو اجنبیوں کو گھیرے ان کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ داؤد اور عیسیٰ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے، داؤد نے کہا۔'' کائر کہیں کے، ان کو اور سزا ملنی چاہئے تھی، تمہاری شکل دیکھتے ہی ڈر کے مارے سب بھاگ گئے۔''

سورن مئی ساکت کھڑی تھیں، چھنا داسی نے اٹھ کر آگے آ کر کہا۔'' آپ دونوں کو اوپر والے نے بھیجا ہے، میری دعا ضائع نہیں گئی، آپ فرشتے ہیں، خدا کی مہربانی سے آپ دونوں کو دین دنیا کی دولت خوب ملے۔''

کوروؤں کی سبھا میں دروپدی کے دستر ہرن کے وقت کرشن نے آکر اس کی عزت بچائی تھی، شاید یہی سوچ کر چنتا داسی نے اب کہا تھا حالانکہ اس بار کرشن کے روپ میں دو مسلمان آئے تھے، ان تعریفوں اور قصیدہ گوئی کو درکنار کر کے عیسیٰ نے پوچھا،'' آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟ اور کہاں جارہے ہیں؟''

ولبھ رام اپنے زخم کی تکلیف کو برداشت کرتا ہوا ان دونوں کے پاس آیا اور کہا۔'' حضور! ہم شری پور کے راج محل سے آرہے ہیں، یہ خاتون راجہ چاندرائے کی صاحبزادی ہیں، کم سنی میں بیوہ ہوگئیں، ان کو ہم ان کے سسرال لے جارہے تھے، ان کے سسر کا حال ہی میں انتقال ہوگیا ہے، بہت دھوم دھام سے ان کا شرادھ سنسکار ہورہا ہے، وہاں شامل ہو کر دس دنوں کے بعد لوٹنا ہے، ایسی بارش نہ ہوئی ہوتی تو ڈکیتوں کا گروہ ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں پاتا۔''

چنتا داسی، سورن مئی کی بکھری ہوئی ساڑی کو سمیٹ کر اس کے چہرے پر گھونگھٹ کاڑھ رہی تھی تبھی عیسیٰ کی نظر اس خاتون پر پڑی، اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، نہ ہی شکریہ ادا کیا تھا، لیکن ان کی خاموش نگاہوں میں بہت سی باتیں چھپی تھیں، ان باتوں میں بہت جادو تھا، اور اس جادو میں بھی گھنے جنگل کا راز چھپا تھا۔

عیسیٰ نے ایک بار سوچا کہ اگر وہ خود کچھ کہے پھر بھی کیا یہ خاتون کوئی جواب نہیں دے گی؟ اس نے کہا۔'' اب آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پالکی میں آکر بیٹھئے''۔ اس بار بھی اس خاتون نے ایک بھی لفظ نہیں کہا۔ ولبھ رام بہت مشکل سے سیدھے ہو کر پوچھا۔'' حضور، آپ لوگ کون ہیں؟ ایسے بہادر شخص کا تعارف حاصل ہوسکتا ہے؟''

داؤد نے کہا۔'' ہم کوئی خاص آدمی نہیں ہیں یوں ہی راہ چلتے گھوڑ سوار ہیں، اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ، تم پیدل چلو گے کیسے؟ وہ لٹیرے اپنا گھوڑا چھوڑ گئے ہیں تم کسی طرح اس پر سوار ہو جاؤ۔''

ولبھ رام نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔'' میری گزارش ہے، ہماری رانی دیدی اونچے خاندان کی ہندو بیوہ ہیں، ہندو بیوہ کو اگر کوئی غیر مرد چھوتا ہے تو اس کی جان چلی جاتی ہے، اگر آج کے واقعے کے متعلق کسی کو بھنک بھی مل گئی، اب میں آپ دونوں سے کیا کہوں۔۔۔۔۔۔۔''

عیسیٰ نے کہا۔'' میں سمجھ گیا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا تم لوگ بے فکر رہو۔''

اب داؤد اور عیسیٰ نے بغیر وقت ضائع کئے اپنی راہ پکڑی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد

عیسیٰ نے کہا۔ ''داؤد! میں نے سنا تھا، ہندو عورت کے بیوہ ہونے پر سسرال سے اس کے سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں، یہ اپنی سسرال کیوں جا رہی ہے؟'' داؤد نے کہا۔ ''کیا پتہ، ہندوؤں کے رسم و رواج کی ہمیں زیادہ جانکاری نہیں ہے۔'' پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دوست! تم نے اس عورت کا جو چہرہ دیکھا وہ چہرہ اگر دل میں بس جائے تو تمہارا سارا چین وامن چھن جائے گا، جتنی جلدی ممکن ہو بھول جاؤ، ہمارے سامنے ڈھیروں کام پڑے ہیں۔''

گوڑ بنگ میں ہندو سلطنت کے زوال کے بعد لمبے عرصے سے پٹھان سلطان حکومت کرتے آئے تھے، اس کے بعد مغلوں نے اپنی حکومت قائم کرنی چاہی۔ پٹھان اور مغلوں کی لمبی جنگ چلی،۔ ہمایوں بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کا اکبر نام کا کم عمر بیٹا دلی کے تخت پر بیٹھا، اس کے زمانے میں ہی پورے ہندوستان میں مغل سلطنت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ بنگال میں مغلوں کیلئے حکومت قائم کرنا آسان نہیں تھا۔ مغلوں کی فوج بہت زیادہ طاقت ور تھی لیکن جنگ پر جنگ ہار کر بھی پٹھانوں نے اپنی ہار پوری طرح نہیں قبولی تھی۔ وہ اڑیسہ اور بنگال کی طرف بھاگ کر پہاڑی جنگلوں میں چھپ جاتے پھر یکایک مغل فوج پر چور حملہ بول دیتے حالانکہ مغلوں نے قلعے تو بنوائے تھے لیکن وہ اس ندی نالوں کے دیش کے مزاج سے ناواقف تھے۔ یہاں کی ندیوں کا جغرافیہ بے حد پیچیدہ ہے۔ گرمی میں تو یہ اس قدر سوکھی پڑی رہتی ہیں کہ پیدل ہی آر پار کیا جاسکتا ہے۔ ادھر برسات کے موسم میں وہی سوکھی ندیاں ایسی خوفناک شکل اختیار کر کے تباہی مچاتی ہیں کہ مغل فوجوں کو بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہاں کے راجہ، نواب بحری فوج کے ذریعہ دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں جبکہ مغل گھوڑسوار ان کا پیچھا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں، ان لگاتار چلتی ہوئی لوٹ پاٹ، جنگ، دغابازی، بے وجہ کئے گئے بے رحم اجتماعی قتل سے پانی، پھل پھول سے ہری بھری اس زمین پر تشدد چھایا تھا۔ عام آدمی کی زندگی اور جائداد کی کوئی حفاظت نہیں تھی، چاروں طرف تشدد کا ماحول تھا۔

مغلوں اور پٹھانوں میں ادھر ادھر جنگ تو ہوتی رہتی تھی اس کے علاوہ یہاں اور بھی دیگر ہنگامے شروع ہو گئے تھے، دور سمندر پار کر کے۔۔۔ اور فرنگی چاٹگام میں اپنا ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے، وہ بھی بنگال کے گاؤں کو تباہ کرنے پر تلے تھے، آراکان کا راجہ تو تھا بودھ لیکن بنگال کے کچھ حصوں پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے وہ اپنی فوج کے ساتھ اکثر گوڑ بنگال پر دھاوا بولتا تھا، یہ تو بودھ دھرم کے نام پر کلنک تھے، دشمنوں کی فوج کی بلی چڑھا کر یہ ان کا گوشت کھاتے تھے، برہمن کے علاوہ ان کے

پاس کسی کے لئے رعایت نہیں تھی۔

اب شدت کا فائدہ اٹھا کر اس راج کے مختلف علاقوں کے کچھ زمیندار بھی اپنا سر اٹھانے لگے تھے۔ اپنی زمینداری اور اپنی رعایا کے جان، مال کی حفاظت کی خاطر ان لوگوں نے اپنا گڑھ بنایا تھا۔ اپنی فوج کی طاقت بڑھانے میں لگے تھے۔ مغل اور پٹھانوں کے مقابلے میں ان زمینداروں کی فوج میں زیادہ بنگالی تھے۔ ان میں سے زیادہ تر بحری جنگ میں ان کے مقابلے زیادہ ہوشیار۔ یہ چھوٹے چھوٹے سمندری بیڑے بنا کر پرتگالیوں کے سمندری بیڑے سے بھی ٹکر لے لیتے۔ ان زمینداروں کا مشہور نام ہے۔ "بارہ بھویاں" "بھویاں یعنی کہ زمیندار۔۔۔۔ ان کی تعداد ہمیشہ بارہ رہی ہو ایسی بات نہیں ہے کبھی کم تو کبھی زیادہ، ان میں سے کوئی ہندو تھا تو کوئی مسلمان۔ پہلے یہ اپنے حاکموں کو ٹیکس اور نذرانہ پیش کرتے تھے، آہستہ آہستہ ان راجاؤں اور نوابوں کی حکومت کی پکڑ ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے ان لوگوں نے ٹیکس نہ دینے کا فیصلہ کیا اور آزاد ہو گئے۔ اپنی اس حاصل کی ہوئی آزادی کو بنائے رکھنے کے لئے ان کو لگاتار جنگ بھی کرنی پڑی تھی حالانکہ ان کے نزدیک آزادی کا مطلب صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھنا تھا۔ یہ اپنے کو راجہ کہتے تھے۔ بارہ بھویاں لوگوں کی آپس میں بھی یکجہتی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی زمینداری پر قبضہ کرنے کے لئے نہ جانے کتنی بار ایک دوسرے سے جنگ کی تھی۔ جنگ میں ہار کر معاہدہ کرنے کے بعد اس معاہدہ کی شرطوں کو توڑنے میں بھی دیر نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ اکبر کی حکومت کے دوران بنگال کے بھومیں ہر میں تین قابل ذکر ہیں۔ یشور یا جیسور علاقے کے پرتاپ ادھت، سونار گاؤں اور بھاٹی علاقے کے عیسیٰ خان، اور وکرم پور کے باپ بیٹے چاند رائے اور کیدار رائے، پرتاپ ادھت کی زمینداری اور ان کی فوج بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ طاقتور تو تھی لیکن ان کے بے حد ظالمانہ مزاج، مغرور اور تلخ زبانی کی وجہ سے دوسرے بھومیں ہر ان سے الگ رہنا پسند کرتے تھے۔ ادھر عیسیٰ خان کے بے حد معمولی حالات سے تیزی سے دور دور تک اپنا قبضہ اور دبدبہ پھیلانے کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ چاند رائے کی راجدھانی وکرم پور ایک خوشحال نگر تھا۔ وہاں کے عمدہ کپاس کے کپڑے (مسلن) چین میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ شری پور کے لوہار بڑے بڑے توپ بنا سکتے تھے۔ ان توپوں سے چاند رائے نے کئی جنگوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔

اب چاند رائے بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی اکلوتی پیاری بیٹی سورن مئی کا اونچے کائستھ گھرانے میں مالکھانے مشہور بسو خاندان میں شادی ہوئی تھی، محض چھ مہینے کے اندر ان کے شوہر کی

سانپ کے کاٹنے سے موت ہوگئی۔ نو سال کی عمر میں بیوہ ہو کر سورن مئی اپنے میکے لوٹ آئیں۔ اپنی معصوم بیٹی کی بیوگی دیکھ کر راجہ چاند رائے صدمے سے بے ہوش ہو کر زمیں پر گر گئے تھے۔ اس کے بعد سے ان کی حالت پوری طرح سے نہیں سدھری تھی زیادہ تر بستر پر وہ بیمار پڑے رہتے تھے۔

وہیں سورن مئی اپنی عمر کے شباب پر پہنچ رہی تھی۔ بڑے ہی پاکیزگی اور پردہ داری میں وہ زنان خانے میں ہی رہتی تھی۔ اپنے باپ کی خدمت کرتی تھی۔ ہندو بیواؤں کے اصولوں کے مطابق وہ دن بھر میں اجالا رہتے بس ایک ہی بار کھانا کھاتی تھی اور ہر رات کو فاقہ کرتی تھی۔ بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر جہاں باپ کا دل بھر آتا وہیں سماجی اصولوں اور رواجوں کو اپناتی ہوئی دیکھ کر انھیں کافی حد تک اطمینان ہوتا تھا۔ رات کو انھوں نے بھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔

فی الحال حکومت کی باگ ڈور ان کے لائق بیٹے کیدار رائے پر تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے دراصل وہی راجہ کے عہدہ پر تھے مگر باپ کے زندہ رہنے کی وجہ سے رعایا ان کو کمار کہتی تھی۔ گٹھیلے قد کاٹھی کے خوبصورت کیدار رائے جنگی فن میں شہرت رکھتے تھے۔ لوگ عیسیٰ خان سے ان کی برابری کرتے تھے۔ عیسیٰ خان کیدار رائے کے ہم عمر تھے۔ کیدار رائے کی طرح ان کی شخصیت بھی پرکشش تھی اور گٹھیلی قد کاٹھی تھی لیکن تلوار بازی میں ان کی مہارت کہیں زیادہ تھی۔ یہاں کا کوئی بھی شخص ان کے سامنے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار یہی عیسیٰ خان نے اکبر سیناپتی مان سنگھ کو تلوار بازی کے مقابلے میں مات دی تھی۔

اس زمانے کا یہ واقعہ آج بھی لوگوں کو زبان زد ہے۔ دونوں طرف سے ہونے والی جنگ کے بیچ عیسیٰ نے مان سنگھ کو مقابلے کے لئے للکارا۔ مغل سیناپتی مان سنگھ بھلا راضی کیوں نہ ہو؟ گھوڑے پر سوار دونوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مان سنگھ کے ہاتھ سے تلوار گر گئی وہاں موجود ناظرین ڈر کے مارے ہائے ہائے کر اٹھے۔ مقابلے میں ہارنے کا مطلب ہے کہ فاتح کے ہاتھوں اپنی جان کو گنوانا لیکن عیسیٰ خان نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی تلوار کو مان سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مہاراج! اسے پکڑیئے، میں اپنے لئے دوسری لانے کو کہتا ہوں۔ مقابلہ پھر سے شروع ہوگا۔'' اس پیشکش کو سن کر مان سنگھ بے حد متاثر ہوا۔ مان سنگھ اپنے گھوڑے سے اتر کر عیسیٰ خان کو اپنے گلے لگا لیا۔ دونوں فریق کے بیچ معاہدہ کرنے کی پیشکش رکھ کر وہ شہنشاہ اکبر سے اس بہادر نوجوان کو ملوانے لے گئے۔ بادشاہ اکبر نے بھی آگرے میں اس کی خوب خاطر داری کر کے ان کو بہت سے تحفے تحائف نذر کئے۔

اس واقعے کو گزرے ہوئے کئی برس بیت گئے، اب اس معاہدہ نامہ کے چیتھڑے ہو چکے تھے، احسان، انسانیت جیسی باتوں کو شہنشاہ کو یاد رکھنا زیب نہیں دیتا، دوسری بار اکبر بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور باغی زمینداروں کو شکست دے کر اپنا غلام بنانے کے لئے صوبہ بنگال بھیجا، مان سنگھ اس بار بارہ بھوئیں ہروں کو سبق سکھانے آئے تھے جن میں عیسیٰ خان بھی تھے۔

عیسیٰ خان اور کیدار رائے کے علاقے متصل تھے، حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان دنوں پڑوسی راجاؤں میں جنگیں ہونے پر بھی ان دو پڑوسی راجاؤں میں کسی قسم کی دشمنی کا رشتہ نہیں تھا۔ آراکان راجہ کے مخالف کیدار اور عیسیٰ نے کندھے سے کندھا ملا کر جنگ کی تھی۔ جنگ کے علاوہ بھی دونوں دوستوں میں بیچ بیچ میں میل ملاپ اور ہنسی مذاق چلتا رہا۔

ان دنوں جھنڈ کے جھنڈ ہندو اپنا مذہب تبدیل کر رہے تھے۔ کچھ ظلم اور ڈر سے، کچھ مسلمان حاکموں کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے، کچھ اپنے مذہب کے ٹھیکیداروں کے ظلم اور ان کی ذات پات اور چھوا چھوت سے تنگ آ کر مسلمان بن رہے تھے۔ گوڑ بنگ میں جس وقت پٹھانوں نے قبضہ کرنا شروع کیا اس وقت اس جنگ میں مٹھی بھر مسلمان تھے بعد میں ان کی تعداد سو گنا بڑھ چکی تھی۔ جو ہندو اپنا مذہب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے وہ ڈرے سہمے اپنے دن گزار رہے تھے۔ ہندو راجہ آہستہ آہستہ اپنا اثر کھوتے جا رہے تھے اور ان کی رعایا کا مذہب بھی اب محفوظ نہیں تھا۔

مگر وکرم پور اور سونار پور گاؤں کا ماحول بالکل الگ تھا، حکمرانوں کے برتاؤ کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ دونوں کے علاقے کے راجہ ہندو اور مسلمان الگ الگ مذہب کے ہونے پر بھی ان دونوں میں محبت اور بھائی چارے کا رشتہ دیکھ کر رعایا میں بھی ایک دوسرے کے مذہب کے لئے نفرت نہیں تھی۔ یہاں مندر، مسجد، ٹول مدرسہ ایک ساتھ بغیر کسی جھمیلے کے چلتے تھے۔ اگر کوئی اپنا مذہب بدلنا چاہے تو اس میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی حالانکہ تبدیلی، مذہب ایک طرفہ تھی، ہندو سے مسلمان بننے کا۔ کیونکہ اگر کوئی مسلم چاہے تو وہ ہندو نہیں بن سکتا۔ ہندو معاشرہ اسے اس کا حق تو دینے والا تھا نہیں۔ مذہب سے ذرا بھی چوک ہندو مبلغوں سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ فوراً اس چوک کرنے والے انسان کو اپنے مذہب اور ذات سے باہر کر دیتے۔ کچھ مٹھی بھر با اثر اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے لئے ہندو معاشرہ اب ٹوٹنے کے کگار پر تھا، خیر۔ سارے ملک کے سامنے سونار گاؤں اور وکرم پور مثال تھے لیکن کب تک؟

سندیپ کے جزیرے پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے نہ جانے کتنے مختلف فریقوں نے حملے کئے تھے۔ کبھی اس جزیرے پر کیدار رائے کا اثر ورسوخ رہا، کبھی پرتگالیوں کا، کبھی آراکان راجہ کا۔ آراکان کی فوج کے سامنے پرتگالی فوج نہیں ٹھہر پا رہی تھی۔ آخر کار پرتگالی سپہ سالار کاربالو پچھ جنگی سامان لے کر چاندرائے کی فوج میں شامل ہو گئے۔ عیسیٰ خان اور کیدار رائے دونوں آراکان راجہ کے مخالف تھے۔ آراکان راج کی للچائی نگاہیں جزیرے کے بعد اب گوڑ بنگال کی طرف پڑی تھیں۔ ادھر تری پورہ اور کوچ بہار کے راجہ بھی آراکان راج کے خلاف تھے۔ ان آراکان باشندوں کو بنگال کے 'مگ' کہا جاتا تھا، کہیں بنگال بھومی پر ان بے رحم مگوں کا راج نہ قائم ہو جائے اس لئے عیسیٰ خان اور کیدار رائے نے یکجا ہو کر سپہ سالار کاربالو کی رہنمائی میں آراکان فوج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں ہی راجاؤں کی فوج کے لڑاکے بنگالی تھے۔ یہ بری اور بحری جنگ میں ماہر تھے۔ جہاں یہ تلوار، لاٹھی چلانے میں مہارت رکھتے تھے وہیں توپ اور بحری کشتی چلانے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بنگالی فوج کی جنگی مہارت کے سامنے مگ فوج ٹک نہیں پائی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

عیسیٰ خان خوشی خوشی کیدار رائے کے ذاتی بحری جہاز میں آکر ان کے پانا ہار جشن میں شامل ہو گئے۔ دوسرے جہازوں پر بھی جیت کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ اس جہاز میں مانجھی ملاح اور خانساماں اور دوسرے خدمت گاروں کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ اس جہاز میں دو خوبصورت سجے ہوئے آرام گاہ اور ایک وسیع وعریض بیٹھک خانہ تھا۔ بیٹھک کے فرش پر مخملی قالین بچھی تھی جس پر کئی تکیے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں طرف کے دریچے سے ندی کے دونوں کناروں کے منظر دکھائی دے رہے تھے۔

ان کی فتح کی کہانی پھیلتے ہی دور دور سے لوگ ان دو بہادر بنگالی راجہ کے نام کی جے جے کار لگانے چلے آئے تھے۔ ویسے سپہ سالار کاربالو بغیر وقت گنوائے شراب سے اپنی پیاس بجھانے بیٹھ گئے۔

عیسیٰ خان پکے مسلمان تھے اور وہ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ کیدار رائے بھی تیوہار وغیرہ کے موقع پر تھوڑا بہت پی لیتے تھے لیکن ان کو شراب کی لت نہیں تھی۔ اس وقت دونوں چاندی کے گلاس میں بادام پستے سے بنی ٹھنڈائی پی رہے تھے۔ اس وقت دونوں راجہ مان سنگھ کا ذکر لے کر بیٹھے تھے۔ اس بار مان سنگھ کس مقصد سے بنگال آئے ہیں یہ ان دونوں کو پتہ تھا۔ اس بار ان کا لشکر تو بڑا تھا ساتھ ہی جنگی بیڑے بھی ان کے ہمراہ تھے یعنی مغل فوج اس بار بحری جنگ کے لئے

تیار تھی۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس بار مغل سپہ سالار اپنا مقصد پورا کئے بغیر لوٹنے والے نہیں۔

سیدھے سیدھے جنگ کے میدان میں مان سنگھ کو شکست دینا مشکل کام ہے، اس بات کا علم دونوں کو تھا۔ اس بیچ بارہ بھوئیں ہروں کے کچھ راجاؤں نے جنگ کئے بغیر ہی اپنی شکست مان لی۔ راجہ پرتاپ ادت بھی اپنی عزت کے بدلے مغلوں سے دوستی کرنے میں ہی عافیت سمجھ رہے تھے۔ وکرم پور اور سونار گاؤں ہی اب مان سنگھ کا سر درد تھا۔

عیسیٰ خان اور کیدار رائے دونوں نے ہی کئی برسوں تک آزادی کا ذائقہ لیا تھا۔ نہ کسی کو ٹیکس دیا تھا نہ ہی کسی راجہ یا بادشاہ کے حکم پر حکومت کی تھی۔ ان دونوں دوستوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مان سنگھ کو شکست دینے کی قوت ان میں ہے ہی نہیں لیکن جنگ چھڑ جانے کے کچھ دن بعد ہی پیچھے ہٹنے کا ناٹک کیا جائے۔ ایسا لگے کہ مغلوں سے ڈر کر بنگال کی فوج پیچھے ہٹ گئی ہے۔ پھر مغل فوج ضرور ان کا پیچھا کریں گی اس وقت مغلوں کو گھنے جنگلوں اور گھاٹی کی طرف لے جانا ہے۔ کیدار اور عیسیٰ فوج لے کر دو طرف کے دو جزیروں پر چھپے تاک لگائے بیٹھے رہیں گے، کھاڑی کے آس پاس بہتے ندی نالوں تک آکر جب مغل فوج اپنی سمتوں سے بھٹک جائے گی، اور اس وقت یہ دو "بارہ بھوئیاں" دو طرف سے حملہ بول کر مغل فوج کو نیست و نابود کر دیں گے پھر کچھ ہی دنوں بعد برسات کا موسم بھی شروع ہو جائے گا۔

ادھر پہلی دفعہ میں زوروں کی بارش ہوتی ہے جس کے نتیجے میں حالات بے قابو ہو جاتے ہیں اور خطرناک حد تک سیلاب آجاتا ہے۔ بنگالی ان حالات کا آسانی سے مقابلہ کر لیتے ہیں لیکن اتری بھارت میں رہنے والے مغل فوجوں کے لئے ان حالات کا سامنا کرنا ہرگز ممکن نہیں ہے۔ کھاڑی اور جنگل کے علاقوں میں باگھ اور مگرمچھوں کا راج ہوتا ہے۔ ان حالات میں مغل فوج کا ٹک پانا مشکل ہے۔ وہ جنگ کرنے کے بجائے محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں رہیں گے صرف اسی ہوشیاری سے مغل فوج کو ان کے سپہ سالاروں کے ساتھ بنگال سے کھدیڑا جا سکتا ہے، کم سے کم کچھ دنوں کے لئے تو ان سے راحت ملے گی۔

کچھ دیر تک اسی موضوع پر تبصرہ ہوتا رہا۔

بات بات میں دوسرے موضوع بھی چھڑ جاتے۔ عیسیٰ خان کو بچپن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا مگر جنگی مہارت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کیدار رائے کو سنسکرت، عربی، فارسی کی تعلیم ملی تھی۔ عیسیٰ خان کو ان سے رامائن مہابھارت کے واقعات سننے میں بڑا مزا آتا تھا۔

خاص کر کے شری رام چندر کے بھگت ہنومان کے قصے وہ بار بار سننا چاہتے تھے۔ آج یکا یک انھوں نے کیدار رائے سے پوچھا: ''راجہ رام چندر نے بانر راج بالی کی جس طرح چھپ کر قتل کیا تھا، آپ اسے غلط کیوں مانتے ہیں؟'' جنگ کے وقت تو دشمن کو کسی طرح بھی ختم کرنا چاہئے۔ ہم بھی تو پیچھے سے وار کرتے ہیں اور آپ بھی تو کرتے ہیں۔''

کیدار رائے نے کہا: ''اس زمانے میں جنگ کے الگ الگ اصول ہوتے تھے، جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی شرطیں طے کر لی جاتی تھیں، کبھی آمنے سامنے جنگ کریں گے، شام کے بعد کوئی جنگ نہیں کرے گا، عورتیں اور بچے اس سے بری ہیں۔ ہاں کہیں کہیں شرطیں توڑی بھی گئی ہیں۔''

عیسیٰ خان نے پھر سوال کیا: ''بالی ودھ کے بعد تو اس کی بیوی بیوہ ہوگئی، پھر سگریو نے اس سے شادی کیسے کی؟ مہادھارمک ہنومان نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا! اس زمانے میں کیا ہندو بیواؤں کی شادی ہوتی تھی؟''

کیدار نے کہا: ''وہ بانر تھے، کیا پتہ ہندو تھے بھی یا نہیں۔''

عیسیٰ نے کہا: ''کیا وہ سچ مچ بندر تھے؟ پھر انسانوں کی زبان میں کیسے بول لیتے تھے؟ کچھ تو کافی عقلمند بھی تھے، کیا بندر کبھی انسانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ہتھیار پکڑ کر جنگ کر سکتا ہے؟''

کیدار نے کہا: ''پہلے میرے من میں بھی یہ سوال اٹھا تھا۔ پھر میں نے اپنے پنڈت جی سے پوچھا، انھوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ وہ پیڑوں پر اچھلنے کودنے والے بندر نہیں تھے، ان کے اپنے گھر بار ہوا کرتے تھے، وہ اناریہ تھے یا نر یعنی جو جنگل میں رہتے ہیں یا پھر بدصورت نر! یہ اناریہ بے حد کالے ہوا کرتے تھے، اس لئے گورے آریہ ان کو بدصورت کہتے تھے، حالانکہ اناریہ ہونے پر بھی عقل اور سمجھداری کے معاملے میں وہ کچھ کم نہیں تھے۔

''پھر رائے مہودے! میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہوں گا، اگر آپ برا نہ مانیں، آپ لوگ بھی تو آریہ ہیں، ہیں نا؟''

''ضرور! آپ بھی ہیں، ہمارے دھرم الگ ہو سکتے ہیں لیکن ہندو مسلمان سبھی آریائی نسل کے ہیں، عرب دیش سے آپ لوگوں کا دھرم آیا ہے، عرب کے لوگ آریہ ہی ہیں۔''

''آپ لوگ بھارت کے ہندو آریہ ہیں، میری سمجھ سے آپ لوگوں کے مقابلے اس زمانے کے اناریہ کہیں زیادہ ترقی یافتہ فکر اور سوچ رکھتے تھے۔ ان میں بیواؤں کی شادی کا رواج

تھا۔ ہم مسلمانوں میں بھی بیوہ عورتوں کے دوبارہ شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ خود ہمارے پیغمبر نے ایک بیوہ سے نکاح کیا تھا۔ آپ لوگ ایک بیوہ کو کیوں صحیح ڈھنگ سے جینے نہیں دیتے؟ ساری زندگی ان کو ظلم۔ سہنا پڑتا ہے۔ آپ کے دھرم کا یہ کیسا انصاف ہے؟''

''کس نے کہا ہماری بیواؤں کو ساری زندگی ظلم۔ سہنا پڑتا ہے؟ وہ پاکیزہ زندگی گزارتے ہوئے عبادت میں ڈوبی رہتی ہیں۔ میکے میں وہ بچوں اور بوڑھوں کی خدمت کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں، اصولوں کی راہ پر چل کر وہ اگلے جنم میں سکھی ہوتی ہیں۔''

''راجہ! ہندو بیوہ ایک غلام کی زندگی جیتی ہے، باہر کی کھلی ہوا روشنی اسے کبھی نصیب نہیں ہوتی، وہ کسی غیر مرد کو اپنا چہرہ بھی نہیں دکھا سکتی ہیں۔ ان سے بات کرنا تو دور کی بات ہے۔ زندگی کی ساری خوشیاں تمام مسرتوں سے وہ محروم رہتی ہیں، دو وقت کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا، رنگین لباس یا زیورات پہننا بھی ممنوع ہے، مجبوراً ان کو دوسروں کی گرہستی میں پس پس کر مرنا پڑتا ہے، آپ اسے اصول کہتے ہیں؟ اس کا نام پاکیزگی ہے، کیوں؟ ہندو مرد تو اپنی بیوی کے مرنے کے بعد ان اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔''

کیدار اے ذرا گرم لہجے میں بولے۔ ''میں آپ سے اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے مذہبی سنسکاروں کو لے کر آپ دماغ نہ ہی کھپائیں تو بہتر ہے، لیکن ہاں! ہندو بیواؤں کے بارے میں آپ کو اتنی معلومات ملی کیسے؟''

عیسیٰ نے کہا'' کیوں نہیں، میری رگوں میں بھی تو ہندو کا ہی خون ہے۔''

''کیا؟ کیا کہا آپ نے؟''

''آپ کو میرے والد کا نام معلوم ہے؟''

''نہیں، اوہ، یاد آیا، آپ شاید قاسم خان کے بیٹے ہیں۔''

''نہیں، قاسم خان میرے چچا ہیں، ان کی میں اپنے ابا جیسی ہی عزت کرتا ہوں، لیکن میرے ابا کا نام ہے کالی داس گزدانی، ہمارے آباواجداد ایودھیا کے راجپوت تھے۔ میرے ابا ایک خوبصورت پنڈت تھے۔ میں نے بچپن میں ہی ان کو کھو دیا تھا، ان کی بات مجھے کچھ زیادہ یاد بھی نہیں ہے۔ ہندو پنڈت ہو کر بھی انھوں نے اسلام مذہب کو کیوں قبول کیا۔ اس کے دو قصے ہیں۔ ایک، کسی پٹھان سلطان کی بیٹی نے ان کی خوبصورتی پر نثار ہو کر ان سے نکاح کرنا چاہا لیکن میرے ابا اس بات پر راضی نہیں تھے تب ان کو زبردستی اٹھا کر گائے کا گوشت کھلا دیا گیا۔ اس پر ہی ان کو مجبوراً

اسلام دھرم اپنا کر اس لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ دوسرا، کالی داس پنڈت ایک بار مسلمان مومنوں کے ساتھ ہونے والی مناظرہ بازی میں ہار گئے اور دین اسلام کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمان بن گئے۔ ہمارے خاندان میں اس دوسری کہانی کو ہی صحیح مانا جاتا ہے۔ خیر! انھوں نے کسی سلطان کی بیٹی سے نکاح کیا تھا اور وہ سلیمان خان بن گئے۔ اس سلطان کے زمانے میں ان کی کافی ترقی ہوئی اور پٹھانوں کی طرف سے مغلوں کے خلاف جنگ میں وہ مارے گئے۔ میں اور میرا بھائی اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ آگے سننا چاہتے ہیں؟''

''ضرور! مجھے تو ان باتوں کی جانکاری ہی نہیں تھی۔''

''اس جنگ میں سبھی اپنی اپنی جان بچانے میں لگے تھے۔ اس وقت کسی نے ہم دو بھائیوں کو یتیم ہندو بچہ سمجھ کر غلام بنا کر بیچ دیا۔ میں فارس (ایران) بھیج دیا گیا۔ وہاں کچھ برس ہم نے امیر لوگوں کے گھر پر نوکروں کا کام کیا۔ پھر یہاں کا ماحول پر سکون ہونے کے بعد میرے ہمدرد چاچا صاحب نے آدمی بھیج کر ہمیں کھوج نکالا اور لے آئے۔ میرا بھائی اسمٰعیل زیادہ دن نہیں بچا۔ خوش قسمتی سے مجھے تری پورہ کے راجہ امر مانکیہ کی فوج میں نوکری مل گئی۔ میں نے اس بار تری پورہ کی طرف سے سپہ سالار شہباز خان کو شکست دیدی۔ مہاراج اور امر مانکیہ کی رانی نے خوش ہو کر مجھے سرگائل پرگنہ بطور تحفہ دے دیا۔ میں ان کو ماں کہتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بیٹے جیسا پیار کرتی تھیں۔ ان سے ہی مجھے مسند علی کا خطاب ملا اور پھر میں نے اپنی فوج تیار کی۔ شہباز خان اپنی بے عزتی نہیں بھولا تھا۔ بار بار میرا پیچھا کرتا رہا اس لئے میں نے سرائیل چھوڑ کر شورگنج کے جنگل باڑی میں اپنی نئی راجدھانی قائم کی، آپ نے وہ راجدھانی نہیں دیکھی ہے۔''

کیدار رائے نے تعجب آمیز لہجے میں کہا۔'' یہ تو روپ کتھا ہے۔ ایک معمولی غلام سے آپ آج اس پورے کھاڑی علاقے کے راجہ ہو گئے ہیں۔ مغل بھی آپ کو سمجھ کر چلتے ہیں۔ آپ نے وارثت میں نہیں بلکہ اپنی طاقت، عقلمندی اور ہوشیاری سے سب کچھ حاصل کیا ہے۔''

عیسیٰ خان نے کہا۔'' بس ایک چیز بھی ہوئے ہم نے اپنا مذہب بدلا ہے۔ میرے چاچا صاحب بھی پہلے ہندو ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی آج بھی ہندوؤں کے رسوم و رواج مانتی ہیں۔ ان کو قرآن پڑھنا بھی آتا ہے اور ہندوؤں کے برت، اپواس کا بھی پالن کرتی ہیں۔ میں نے ان سے ہی ہندو بیواؤں کی دردناک زندگی کے بارے میں سنا ہے۔ اکادشی کے دن ان کو ایک بوند پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔''

کیدار رائے بولے۔ ''رمضان کے مہینے میں آپ لوگ بھی تو دن بھر کچھ کھاتے پیتے نہیں۔''

اب عیسیٰ خان نے سامنے آ کر کیدار رائے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہا۔ ''رائے، رائے ہاں! کیدار راج! میری آپ سے ایک گزارش ہے۔''

کیدار رائے بولے۔ ''یہ کیا، آپ اس طرح کیوں کہہ رہے ہیں؟! اٹھیے، بھلا میرے پاس آپ کی کیا عرضی ہوسکتی ہے؟''

عیسیٰ خان اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے۔ ''ہم لوگ دونوں ہی مغلوں کے خلاف یکجا ہو کر جنگ کرنے کے معاہدے میں ہیں اگر ہم دونوں کے خاندانوں کے بیچ بھی اٹوٹ رشتہ قائم ہو جائے تو ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔ ایسا رشتہ صرف شادی بیاہ کے بندھنوں میں آ کر ہی قائم ہوسکتا ہے۔ میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر کیدار رائے ہکا بکا رہ گیا، جیسے ان کو گہرا صدمہ پہنچا ہو۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ انھوں نے کہا۔ ''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں خان صاحب! آپ مجھ سے کچھ اور مانگ لیتے تو میں اپنی جان بھی آپ کو دے دیتا! لیکن! شادی! ہم وکرم پور کے کائستھ سبھا کے سب سے بڑے عہدیدار ہیں۔ ہمارے خاندان میں آج تک ہندو شاستر کے خلاف شادی نہیں کی گئی۔ اگر کوئی چھوٹی ذات کا راجہ بن جائے تو ہم اسے اپنے گھر کی بیٹی نہیں دیتے۔ مسلمان تو دور کی بات ہے۔''

عیسیٰ خان نے کہا۔ ''راجستھان کے خاندانی راجپوت راجہ تو مغلوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے قائم کرتے ہیں۔''

کیدار رائے بولے۔ ''مہارانا پرتاپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کھو دی لیکن اپنی ذات دھرم کو نہیں گنوایا۔'' دوسرے راج پوت راجہ نے مغلوں سے جنگ میں بار بار مات کھا کر ان کی غلامی کو قبول کر لیا۔ پھر مغلوں کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر کی بیٹیوں کو ان کے حرم میں بھیج دیتے ہیں۔ اس مان سنگھ کو ہی کو دیکھ لیجئے، مغلوں کی جوتیاں چاٹ کر سپہ سالار بن بیٹھا۔ میں چھوٹا زمیندار سہی، لیکن کسی بھی طرح لالچ میں مبتلا ہو کر اپنا دھرم نہیں گنوا سکتا بلکہ اپنی جان دے دوں گا۔ پھر میری بہن بیوہ ہے، ہندو بیوہ کی شادی کے بارے میں سوچنا گناہ ہے۔''

عیسیٰ خان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''مہاراج! آپ اپنی بہن کو آزادی دیجئے۔ ہر عورت مرد کا سکھ چاہتی ہے۔ اولاد کے جنم دینے میں ہی اسے بے انتہا سکھ ملتا ہے۔ آپ کی بہن ان سب خوشیوں سے محروم رہی ہیں، اس لئے اگر آپ چاہیں تو۔۔۔۔۔''

اب کیدار رائے گرج پڑے۔ ''عیسیٰ خان، ! دوبارہ آپ کی زبان سے اگر اس تعلق سے ایک بھی لفظ نکلا تو میں پھر کبھی آپ کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ میری بہن کا کردار بے داغ ہے۔ آپ کی ایسی بات سن کر وہ اپنی جان دے دے گی۔۔ میں آپ کو ہوشیار کر دیتا ہوں۔ آپ نے پھر کبھی اگر۔۔۔۔۔''

عیسیٰ خان کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ انھوں نے بڑی نرم روی سے اپنی گذارش پیش کی تھی جس کے جواب میں اس ہندو راجہ نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی۔ عیسیٰ خان کے اندر اگر غصے کے شعلے بھڑک اٹھے تو اس کے انجام سے شاید کیدار رائے واقف نہیں ہے۔ وہ اسی پل اپنے میان سے تلوار نکال کر اس راجہ کو ختم کر سکتے ہیں۔

بڑی مشکلوں سے اپنے غصے پر قابو پا کر عیسیٰ خان کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ندی کے کنارے سنسان تھے۔ ادھر گھنے جنگل تھے۔ ایک مچھرا اکیلے پانی میں جال پھینک کر مچھلی پکڑ رہا تھا۔ کیا اسے پتہ نہیں کہ کسی بھی وقت وہ باگھ کا شکار بن سکتا ہے۔ اپنا چہرہ گھما کر عیسیٰ خان نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''مہاراج ! آپ اس جہاز کو یہاں لگانے کے لئے کہئے۔ میں یہیں پر اترنا چاہتا ہوں۔ یہ جنگل قلعہ بنانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں ذرا گھوم کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

کیدار رائے سر جھکائے رہے وہ بھی اپنے غصے کو قابو میں کر رہے تھے۔

عیسیٰ خان کے قریبی دوست داؤد خان گڑھ جر۔پہ شیر پور میں رہتے تھے وہ اس قلعے کے راجہ تھے۔ کبھی کبھار جنگل محل چلے آتے تھے۔ وہاں دوست کے ساتھ گپ شپ کر کے دو چار دن بعد لوٹ جاتے۔ اس بار تو عیسیٰ خان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

ادھر مان سنگھ خود راج محل میں رہ کر ادھر ادھر بکھرے پٹھانوں کو سبق سکھانے میں مصروف تھے، پٹھان ہمیشہ سے مغلوں کے دشمن رہے ہیں۔ گور بنگ پر اپنی حکومت کھو کر بھی وہ چپ نہیں تھے۔ کچھ دنوں تک ادھر ادھر چھپے رہ کر وہ مغلوں پر دھاوا بول دیتے۔ اس بار مان سنگھ نے پٹھانوں کو جڑ سے مٹانے کی ٹھانی تھی۔ خود بیمار تھے اس لئے اپنے دونوں بیٹوں اور ماہر سپہ سالاروں کو جنگ کے میدان میں بھیجا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ پٹھانوں کا خاتمہ کر کے وہ پرتاپ ادت اور دوسرے بارو بھویاں کو سبق سکھائیں گے۔ فی الحال اس طرف مغلوں کے حملے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

دوست کے بلاوے پر بھی عیسیٰ خان چپی سادھے بیٹھے رہے۔ رنی واس سے نکلتے ہی

نہیں۔ ایک شام اپنے دوست کے برتاؤ سے حیران داؤد خان نے باغیچے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا کہ جھیل کے کنارے کسی گہرے خیال میں ڈوبے اکیلے بیٹھے ہیں۔ داؤد ان کے پاس خاموشی سے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد عیسیٰ خان کی طرف منہ گھما کر انھوں نے کہا۔ "مجھے پتہ ہے تم مجھ سے کٹ کر چلنا چاہتے ہو۔ جب بھی ملتا ہوں کس نصیحت دیتا ہوں مگر اب کچھ نہیں کہوں گا۔"

عیسیٰ خان نے آہستہ سے کہا۔ "میں لگاتار اپنے دل سے جھوجھ رہا ہوں لیکن کسی حال میں میں اپنے کو سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔ میں اندر ہی اندر جھلس رہا ہوں۔"

داؤد نے پوچھا۔ "تم کس آگ میں جھلس رہے ہو؟ کیا وہ خوبصورتی کی پیاس ہے یا محبت کی؟ یا پھر ٹھکرائے جانے کی بے عزتی؟"

عیسیٰ خان بولا۔ "صرف خوبصورتی کی پیاس کیوں ہوگی؟ کیا عورت کی خوبصورتی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی؟ اور محبت کسے کہتے ہیں، مجھے پتہ نہیں۔۔ صرف جنگ اور جسم بہلانے سے میرا سروکار رہا ہے۔ اس عورت نے صرف ایک بار اپنی نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کیا تھا، اس کا مطلب میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔ بس وہ آنکھیں مجھے بار بار یاد آتی ہیں اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

داؤد نے کہا۔ "چلو! ہم کہیں شکار پر جاتے ہیں یا پھر کوئی شہر لوٹ لیتے ہیں۔ تم کو اپنا دل اور دماغ دوسری طرف موڑنا ہی ہے، ورنہ مصیبت آنے میں دیر نہیں ہے۔"

"مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہی میں بس ایک دفعہ ان نگاہوں کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں، بس ایک بار ملنا چاہتا ہوں"

"دوست! میں نے پہلے بھی تم سے جو کہا ہے، ابھی بھی کہے بنا نہیں رہا جاتا، اس عورت کو تم دماغ سے اتار دو، کیدارا نے اور تمہاری فوج کے یکجا ہوئے بغیر ہمیں مغلوں سے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ہندو مسلم فوجی کندھے سے کندھا ملا کر جنگ کریں گے۔ کیا کم بڑی بات ہے؟ ایک عورت کے لئے سب کچھ برباد ہو جائے گا؟ کوئی بڑا کام کرنے کے لئے چھوٹی موٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔۔ اگر تم چاہو تو میں اس سے بھی خوبصورت عورت تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔"

"داؤد۔ تم نے جو کہا، کیا میں اس کی اہمیت نہیں سمجھتا؟ لیکن مجھے بار بار یہی لگ رہا ہے کہ ان کے ساتھ اور ایک بار ملے بنا میری زندگی ہی برباد ہو جائے گی۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں؟ لگتا

ہے اس کے سامنے سب کچھ حقیر ہے۔ میری سلطنت جنگ میں حاصل ہونے والی جیت ہار سب کچھ بے معنی ہے۔ مجھے اب کچھ نہیں چاہئے۔''

''یا اللہ! یہ تو محبت نہیں، محبت کا جنون ہے، چاہو تو میں اس کا علاج کروا سکتا ہوں، کان کھول کر سنو، کیدار رائے ہرگز اپنی بیوہ بہن کی شادی تم سے کروانے کے لئے راضی نہیں ہوگا۔ اس وقت تمام ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ کسی زمانے میں یہ ملک ان کا ہی ہوا کرتا تھا لیکن آج وہ سب مسلمانوں کے رحم وکرم پر زندہ ہیں پھر بھی وہ اپنا وقار اور اپنا اصول نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ہندو بیواؤں کے دماغ میں اس قدر اندھا عقیدہ بھر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی غیر مذہبی اسے بیوگی کی ذہنی اذیتوں سے آزادی بھی دلانا چاہے تو وہ اس بات کو نہیں قبول کریں گی بلکہ وہ خودکشی کرنا بہتر سمجھیں گی۔''

''تم کو یاد ہے، اس دن وہ لٹیرے اس عورت کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ اگر ہم صحیح وقت پر نہ پہنچ گئے ہوتے تو وہ اسے اٹھا کر لے جاتے۔ وہ آدمی ہندو تھا یا مسلمان؟ اس وجہ سے تو بعد میں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''بھئی، وہ خبر کیا باہر پھیلی ہے؟ بس کوئی جان نہ پائے تو سارے قصور معاف۔ یہ ہندو چاہے بیواؤں کی پاکیزگی پر کتنا ہی فخر کیوں نہ کریں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کتنی ہی بیوائیں اپنے رشتہ داروں کی ہوس کی شکار ہو جاتی ہیں۔ حمل بھی ٹھہر جاتا ہے۔ یہ خبریں اندر ہی دبا دی جاتی ہیں، کبھی کبھی ان بیواؤں کو مار ڈالا جاتا ہے۔''

عیسیٰ خان نے کھڑے ہو کر جھیل کے پانی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ پھر ٹکٹکی باندھے اس ٹھہرے پانی میں اپنی پرچھائیں دیکھنے لگا۔ اس نے داؤد کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''دوست، مجھے کچھ پرکھنا ہے تم چلو گے میرے ساتھ؟''

اس بیچ عیسیٰ خان نے اپنے مخبروں سے سورن مئی کے بارے میں بہت ساری جانکاریاں حاصل کی تھیں۔ ویسے تو سورن مئی اپنے میکے میں رہتی ہیں لیکن سسرال میں بھی ان کا آنا جانا ہے۔ حال ہی میں ان کی ساس گزر گئی تھیں۔ سورن مئی سے ان کی ساس کا رشتہ بڑا اچھا تھا بالکل ماں بیٹی کی طرح۔ انھوں نے ہی سورن مئی کو ان کے سسر کے شرادھ میں بلوا بھیجا تھا۔ وہاں دس دن رہ کر سورن مئی کو اپنے میکے لوٹنا تھا لیکن اس بیچ ان کی ماں جیسی ساس بیمار پڑ گئیں تو سورن مئی ان کی خدمت کے لئے رک گئیں۔ ان کی موت کے بعد ان کا شرادھ سنسکار کر کے آج دو مہینے

کے بعد سورن مئی اپنے میکے لوٹ رہی تھیں۔

آج کوئی آندھی پانی نہیں تھا، ساتھ میں بارہ پہرہ دار تھے۔ ولبھ رام کا گھاؤ بھی گہرا نہیں تھا۔ علاج سے پوری طرح ٹھیک ہوکر اب وہ بھی ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ آج کسی مصیبت کا اندیشہ نہیں تھا۔ آج موسم خوشنما تھا۔ اس ٹولے چھوٹے مندر کے نزدیک آنے پر چنتا داسی نے پالکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اجی! رانی دیدی کہہ رہی ہیں، یہاں کچھ دیر رکو، ذرا آرام کرلو۔'' ولبھ رام نے دوڑتے ہوئے آکر کہا۔ ''چنتے! رانی دیدی سے کہو کہ یہ جگہ منحوس ہے۔ یہاں ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی تھی اچھا ہو کہ ہم لوگ یہاں سے جلدی جلدی چل کر کالی گنگا ندی کے کنارے ستالیں گے۔''

چنتا نے اپنے ہونٹ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ جگہ منحوس ہے؟ یہیں پر ہم پر آئی کتنی بڑی مصیبت ٹلی تھی، یاد ہے بھی یا نہیں؟ یہی سب سے خوش قسمت جگہ ہے۔''

مجبوراً ان کو وہیں پالکی اتار کر آرام کرنا پڑا اس کے کچھ ہی دیر کے اندر پاس والے جنگل سے قریب پچاس فوجوں کی ایک ٹولی ان کی طرف بڑھنے لگی جس میں دس بندوق دھاری تھے۔ فوج کی وہ ٹولی اس قافلے سے دوری بنا کر ایک قطار کی شکل میں کھڑی رہی، صرف ان میں سے ایک گھوڑسوار دھول اڑاتے ہوئے سامنے آیا۔ وہ گھوڑسوار جنگی فوجی کے بھیس میں تھا۔ سر پر پنکھ لگا لوہے کا ٹوپ تھا۔ قریب آتے ہی اس گھوڑسوار کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا۔ وہ تھے عیسیٰ خان۔ ولبھ رام اس گھوڑسوار کو پہچان کر ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

عیسیٰ خان نے کہا۔ ''میں تم لوگوں کا کوئی برا نہیں کروں گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں صرف اس پالکی میں بیٹھی راج کماری سے دو چار سوال پوچھوں گا۔''

ولبھ رام نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''حضور رانی بی بی کسی غیر مرد کے ساتھ بات نہیں کرتی۔''

عیسیٰ خان بولے۔ ''وہ میں سمجھ لوں گا، تم سب اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہو اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اتنا یاد رکھنا، اور اگر چپ چاپ رہو تو آرام سے گھر واپس جاسکو گے۔''

پالکی کے پاس آکر انھوں نے کہا۔ ''اندر جو ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ میں سونار گاؤں کا منصب دار عیسیٰ خان ہوں، شری پور کی راج کماری سے دو چار باتیں کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔'' پردہ سرکا کر چنتا نے کہا۔ ''حضور کو میرا پرنام سویکار ہو، آپ کو بھلا کون نہیں جانتا، اس

بار آپ نے ہماری جان اور عزت بچائی تھی۔ اس کے لئے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ گستاخی معاف ہو! میں ادنیٰ سی ایک کنیز ہوں۔ پھر بھی آپ سے میرا اتنا کہنا ہے کہ ہماری رانی دیدی کسی غیر مرد سے بات نہیں کرتیں۔"

عیسیٰ خان نے کہا۔" ٹھیک ہے مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف کچھ سوال پوچھوں گا اور تم ان سے پوچھ کر جواب دے دینا۔ راج کماری جو بیوہ کی زندگی جی رہی ہیں، کیا وہ ایسی زندگی سے آزادی چاہتی ہیں؟" تھوڑی دیر بعد چِتا بولی۔" حضور! راج کماری نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔" عیسیٰ خان نے کہا۔" ٹھیک ہے اب میرا دوسرا سوال ہے، اگر کوئی شخص تم کو عزت کے ساتھ اپنی بیوی بنانا چاہے، تب بھی وہ کیا راضی نہیں ہوں گی؟ دوسرے مذہب میں اس طرح کی کوئی ممانعت نہیں ہے؟ کیا وہ صرف ہندو مذہب کا سنسکار بنائے رکھنے کے لئے ساری زندگی دکھ جھیلتی رہیں گی؟" چِتا نے کہا۔" حضور! راج کماری آپ کے اس سوال کا بھی جواب نہیں دیں گی۔"

عیسیٰ خان کے کہا۔" اچھی بات ہے، میرا تیسرا اور آخری سوال! اگر کوئی ان کی محبت کا دیوانہ بن کر زبردستی اٹھالے جائے تو وہ کیا کریں گی؟"

کچھ دیر بعد چِتا نے کہا۔" حضور! راج کماری جی اس بار بھی آپ کے سال کا جواب نہیں دیں گی، اگر اجازت ہو تو کیا میں خود آپ سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں۔ جہاں تک مجھے پتہ ہے کیدار رائے کے ساتھ آپ کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ آپ اپنے دوست کی بہن کے ساتھ اس طرح پیش آئیں گے؟"

اب عیسیٰ خان نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا۔" ہاں، یہ صحیح ہے کہ کیدار رائے میرے دوست ہیں۔ تم نے مہابھارت کی وہ کہانی سنی ہوگی، شری کرشن کے ساتھ بھی تو ارجن سے دوستی تھی، پھر بھی ارجن شری کرشن کی بہن سبھدرا کو اٹھالے گئے تھے، اگر میں بھی۔۔۔۔"

چِتا نے کہا۔" حضور ہم لوگ بے بس عورت ہیں، اگر ہمارے پہرہ داروں اور محافظوں نے آپ کو روکنا چاہا تو ہم ان سے کیا کہیں گے؟" چِتا کے لہجے میں نہ ڈر تھا، نہ ہی شک۔

عیسیٰ خان کہا۔" پھر تو میں تمہارے مذہبی کتابوں کے مطابق شری پور کی راج کماری کو اٹھالے جانا چاہتا ہوں، اس بات پر کہیں وہ خودکشی تو نہیں کرلیں گی؟" اس بار بھی چِتا چپ رہی۔

عیسیٰ خان نے کہا۔" سنو، تمہارے پہرہ داروں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہمیں

روک سکیں نہ ان میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ پھر میں خود تم لوگوں کو پالکی سے نہیں نکالنا چاہتا۔ اگر راج کماری جی خود باہر آئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

ان کے اتنا کہتے ہی چتنا کا ہاتھ پکڑے راج کماری سورن مئی باہر نکل کر کھڑی ہوگئی، چہرے پر پڑا گھونگھٹ ہٹا کر انھوں نے عیسیٰ خان کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ پراسرار لگا ہیں!

عیسیٰ خان نے کہا۔'' چتنا! میں ایک مسلمان ہوں۔ ان کے لئے اچھوت۔ میں خود پہلے ان کو نہیں چھونا چاہتا۔ تم ان کو میرے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھا دو، دیکھو! کہیں ان کو اعتراض تو نہیں؟''

چتنا نے بڑی آسانی سے سورن مئی کو گھوڑے پر سوار کر دیا۔ عیسیٰ خان نے ایڑ لگا کر گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ تھوڑی دیر بعد سورن مئی نے آہستہ سے پہلی بار اپنی آواز کھولی۔'' کیا آپ مجھ سے سچ مچ شادی کریں گے؟ اپنی بیوی کا درجہ دیں گے؟''

چہرہ گھما کر عیسیٰ خان نے کہا۔'' ضرور! یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ ہی میری خاص بیگم یعنی پٹ رانی بنیں گی۔ اللہ اور چاند سورج کو گواہ مان کر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم دونوں کا اگر بیٹا ہوا تو وہی ہماری گدی کا وارث ہوگا۔''

یہ خبر جب راجدھانی تک پہنچی تو اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک چاندرائے سے یہ خبر چھپا کر رکھی گئی لیکن بھلا کب تک چھپائی رکھی جا سکتی ہے۔ چاندرائے کو اپنی بیٹی کے لوٹنے کا انتظار تھا۔ اندر محل میں یہ خبر پہنچتے ہی چاندرائے آہ آہ کر کے کراہنے لگے جیسے کسی نے ان کی چھاتی میں بھالا گھونپ دیا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کو ہوش آیا تو وید حکیم ان کو گھیرے بیٹھے تھے۔ پاؤں کے پاس کیداررائے بیٹھے تھے۔ چاندرائے نے کیداررائے کی طرف ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔'' جو سن رہا ہوں کیا وہ سچ ہے؟''

کیدرائے نے بغیر کچھ کہے، سر ہلا کر'' ہاں'' کہہ دیا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے چاندرائے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔'' دور دیش سے یہ یون (مسلمان) ہندوؤں کو برباد کرنے آئے ہیں۔ یہ ہمارے راج ہڑپ لیں گے، ہماری مندر توڑ دیں گے، ہمارے گھروں کی بیٹیوں کو اٹھالے جائیں گے، اب ایک بھی ہندو نہیں بچے گا، ہمارا قدیم دھرم بھی ختم ہو جائے گا، شاید یہی ہمارا مقدر ہے۔'' پھر کیداررائے کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔'' مسلمانوں پر کبھی اعتماد نہیں کرنا، تو نے اس نرادھرم سے دوستی کی تھی۔ اب دیکھ لیا نا اس دوستی کا نتیجہ۔ کیا قیمت دی اس

نے، میں سمجھ رہا ہوں کہ اب میں زیادہ دن نہیں رہوں گا، ان آخری دنوں میں میرے سامنے اس سونائی کا نام بھی نہ لے۔ آج سے وہ ہمارے لئے مرگئی ہے۔ کیدار! تو میرے سامنے قسم کھا، تجھے اسکا بدلہ لینا ہی ہے۔ جب تک تیرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی رہے گا تب تک تو اس یون کے راج کو تباہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اگر تو اس پاپی کا قتل کر پایا تبھی میری آتما کو پرلوک میں شانتی ملے گی۔"

اس کے تین دن بعد چاند رائے نے آخری سانس لی۔

کیدار رائے نے اپنے باپ کے سامنے حلف لیا تھا اور خبر پاتے ہی انھوں نے خود ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ عیسیٰ خان کو تباہ کر کے چھوڑیں گے چاہے اس کے لئے ان کو اپنا راج ہی کیوں نہ کھونا پڑے۔

باپ کے شرادھ سنسکار کے ختم ہوتے ہی جنگ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ کیدار رائے نے عیسیٰ خان کے راج کے خضر پور شہر پر حملہ بولا۔ دونوں فریقین میں گھمسان جنگ ہوئی لیکن حیرت کی بات تھی، جنگ کے میدان میں عیسیٰ خان کہیں نظر نہیں آیا، کوئی دوسرا سپہ سالار ان کی فوج کی رہنمائی کرر ہا تھا۔ آخر کار کیدار رائے نے فتح حاصل کی۔ انھوں نے خضر پور کو لوٹ کر اسے اجاڑ ڈالا۔ اس کے بعد کیدار رائے کیل گا چھا گڑھ کی طرف بڑھے وہاں بھی عیسیٰ خان کی غیر حاضری میں کیدار رائے نے آسانی سے اس قلعے پر اپنا قبضہ کرلیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد کیدار رائے کے پاس یہ خبر آئی کہ ان کے راج کے دوسرے کنارے پر عیسیٰ خان نے اپنی فوج کی دوسری ٹولی لے کر ان کے دو قلعوں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ کیدار رائے کے راج میں تباہی مچی تھی۔ عیسیٰ خان فی الحال کیدار رائے کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو اپنی بھرپور طاقت کا احساس ان کو اچھی طرح دلانا چاہتے تھے۔

ان آپسی حملوں میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ دونوں فوج کی تعداد میں کمی آگئی۔ ان دو بارہ بھوئیاں کی فوج کی یکجائی کی امید پوری طرح سے ختم ہوگئی۔ ہندو اور مسلمان عوام میں بھی بے اعتمادی اور شک کا بیج پھوٹ پڑا۔

کیدار رائے اپنے دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے بیٹھ گئے۔ دیر تک بحث وتمحیص کے بعد ان لوگوں نے کہا۔"مہاراج عیسیٰ خان کی طاقت کو ہمیں کم نہیں سمجھنا چاہئے۔ جنگی منصوبہ بندی میں وہ مہارت رکھتا ہے۔ ان کو پوری طرح سے ختم کرنے کے لئے ہمیں

اپنی طاقت اور بھی بڑھانی ہوگی۔ بحری فوج کو اور مضبوط کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں وقت چاہئے، ادھر آراکان راج یہاں حملہ کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھے ہیں جبکہ عیسیٰ خان نے اس سے معاہدہ کرلیا ہے اس لئے اس وقت ہمیں بچاؤ کے لئے سب سے پہلے آراکان راج کو روکنا ضروری ہے۔''

کیدارراۓ نے وقت کے تقاضے کو سمجھا۔ انھوں نے اپنے پرتگالی سپہ سالار کاربالو کو جیسور کے راجہ پرتاپ ادت کے پاس مدد طلب کرنے کے لئے بھیجا۔ مہینہ در مہینہ بیتا۔ جیسور سے کوئی خبر نہیں آئی۔ ادھر آراکان کی فوج لوٹ پاٹ اور قتل و غارت گری کرنے لگی۔ پرتاپ ادت اپنے مفاد کی خاطر کوئی بھی غلط کام کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ انھوں نے کاربالو اور ان کے ساتھ آئے سپاہیوں کو مہینوں بٹھائے رکھا، پھر آراکان کے راج کی نقل و حرکت پر گہری نظر ڈالے رکھی۔ ''مگ'' سینا جیسور تک آ ہی نہیں سکے گی اس لئے ان کے خلاف جانے میں کوئی سمجھداری نہیں ہے بلکہ آراکان راج کو خوش کرنے لئے انھوں نے ایک آسان راستہ اختیار کیا۔ لمبے وقت تک انتظار کروانے کے بعد ایک شام انھوں نے صلاح مشورے کے بہانے کاربالو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلوایا۔ کاربالو کے اپنی نشست پر آنے کے بعد ایک بھی لفظ کسی نے نہیں کہا۔ پرتاپ ادت کے اشارے پر بارہ چھپے ہوئے حملہ آوروں نے کاربالو اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا اور پل بھر میں کٹے ہوئے سر زمین پر لوٹنے لگے۔ یہ خبر مگ سینا تک پہنچتے ہی وہ اور بھی بے خوف وکرم پور کی طرف بڑھنے لگے۔ کیدارراۓ کو ان کے خلاف اکیلا ہی لڑنا پڑا۔ عیسیٰ خان اپنے ہاتھ سمیٹے دور کھڑے دشمن کی بربادی کا تماشہ دیکھتے رہے۔ مگوں کو راج پر قبضہ کرنے کے بجائے لوٹ پاٹ میں زیادہ دلچسپی تھی، اس لئے یہ جنگ چلتی ہی رہی۔

ادھر مان سنگھ نے پٹھانوں پر پوری طرح قابو پا کر اپنا سارا دھیان ان بارہ بھوئیں ہارو پر لگا دیا۔ پرتاپ ادت کا راج ان میں سب سے بڑا تھا مگر اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے مغلوں کے خلاف جنگ میں اترنے کی بجائے ان کو اپنی عیاش غلام زندگی زیادہ پسند تھی۔ مغل فوج کے آگے بڑھتے ہی انھوں نے بہت سارے تحفے تحائف بھیجے اور مان سنگھ کے آگے بغیر جنگ کے ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ مان سنگھ نے ان کو ٹیکس ادا کرنے والوں میں شامل کرلیا۔

ان بارہ بھوئیں ہارو میں صرف دو شخص ہی اپنی آزادی سے پیار کرتے تھے اور ساتھ ہی مغلوں کے خلاف تھے۔ ایک مسلم، دوسرا ہندو، دونوں میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ نڈر جنگی بھی تھے مگر یہ دونوں یکجا ہو کر لڑنے والے نہیں ہیں۔ اس کی خبر مان سنگھ کو پہلے ہی لگ گئی تھی۔

ایک ایک کر کے ان کو ختم کرنا ہی ٹھیک رہے گا، یہ سوچ کر وہ دھیرے دھیرے سونار گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔

کبھی عیسیٰ خان کے ساتھ معاہدہ کر کے مان سنگھ ان کو دلی لے گئے تھے لیکن عیسیٰ خان نے اپنی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے کبھی بھی دلی کے بادشاہ کو ٹیکس نہیں دیا تھا۔ مان سنگھ کی فوج نے سونار گاؤں کی طرف دھاوا بول دیا۔ اس بار کیدار رائے منھ پھیرے بیٹھے رہے۔ انھوں نے سوچا کہ دونوں ہی ان کے دشمن ہیں اب اگر جنگ میں دونوں کی فوج کم ہوتی ہے تو فائدہ ان کا ہی ہے۔ کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ اس جنگ میں اچانک دشمن کے گولے سے عیسیٰ خان کی موت ہوگئی۔ ادھر مان سنگھ نے سونار گاؤں کو چھوڑ کر جزیرے پر قبضہ کرنے کے لئے مغلوں کا پیچھا کیا۔ کیدار رائے نے دیکھا سونار گاؤں پر قبضہ کرنے کا یہ سنہرا موقع ہے۔ عیسیٰ خان کے بغیر ان کی فوج کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ عیسیٰ خان سے وہ سیدھے تو بدلہ نہ لے سکے گا لیکن ان کے راج کو تہس نہس کر کے کچھ تو تسلی ملے گی، یہ سوچ کر کیدار رائے نے کچھ ہی دنوں اپنے پرانے دوست کے راج پر حملہ کیا۔

لیکن جتنی آسانی سے اس راج پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، ویسا ہوا نہیں۔ عیسیٰ خان کی تتر بتر ہو جانے والی فوج پھر سے یکجا ہوگئی۔ کیدار رائے حالانکہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے لیکن جنگل محل کے قریب آتے ہی عیسیٰ خان کی فوج جم کر کیدار رائے کی فوج کا مقابلہ کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس راج کے جنگی اب پیچھے نہ ہٹنے کے لئے پوری طرح سینہ سپر ہوں۔ شام کو کیدار رائے اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے بیٹھے۔ انھوں نے سوال اٹھایا کہ عیسیٰ خان کے نہ رہنے پر بھی کون شخص اس راج کا سپہ سالار ہے جو جنگی داؤں پیچ میں اتنا ماہر ہے۔

کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ لہروں کی طرح فوج اس پر ٹوٹ پڑتی ہے مگر آج تک کسی کو سامنے سے رہنمائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ مگر سپہ سالار کے بغیر اس جنگ کی اتنی کامیاب منصوبہ بندی کون کر سکتا ہے؟ کیدار رائے بولے" سفیر بھیجو، اس راج میں عیسیٰ خان کا وارث کون ہے؟ اس کا جاننا ضروری ہے۔"

تینوں سمتوں کی طرف تین سفیر بھیجے گئے۔ ان میں دو کو تو کوئی خبر ہاتھ نہیں لگی لیکن آدھی رات گئے، تیسرا ایک ناقابل یقین خبر لے کر آیا۔ وہ بھیس بدل کر دشمن کی فوج کے اندر گھس کر خود اپنی آنکھوں سے سپہ سالار کو دیکھ آیا ہے۔ اس نے کہا" مہاراج! اس راج کی سیناپتی (سپہ سالار) ایک خاتون ہے۔"

''خاتون؟۔ بھلا بنگالی خاتون نے جنگی داؤں پیچ میں کب مہارت حاصل کی؟ وہ تو جنگ کے میدان کے آس پاس پھٹکتی بھی نہیں۔'' کیدار نے پوچھا،'' کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ یا پھر اڑتی باتیں سنی ہیں؟''

سفیر نے کہا۔'' میں نے سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا نام سونائی بی بی ہے لوگ ان کو نعمت بی بی بھی کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسلحے میں لیس رہ کر فوج میں جوش بھرتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جنگ کے نازک دنوں میں بھی وہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر آگے کی قطار میں آکر مورچہ سنبھالتی ہیں۔''

ذرا جھجکتے ہوئے اس سفیر نے کہا۔'' مہارج! میں نے جہاں تک سنا ہے، یہ خاتون مرحوم عیسیٰ خان کی بیوی اور آپ کی سگی بہن سونائی بی بی ہیں۔''

کیدار رائے کچھ پل کے لئے حیرت زدہ رہ گئے، پھر دھیرے سے بولے'' سونائی، میری بہن، وہ اتنی شرمیلی تھی کہ بات کرنے سے بھی لجاتی تھی کبھی کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، وہی سونائی اب ہتھیار لے کر مردوں کی فوج میں گھومتی ہے؟''

سفیر سے اور کچھ دیر جرح کرنے کے بعد انھوں نے اپنے دوسرے سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ'' جنگ نہیں کی جائے گی؟ سفید جھنڈا اڑایا جائے گا۔ مخالف فوج کے سپہ سالار کے پاس سفیر بھیجا جائے گا، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

رات بھر کیدار رائے کو نیند نہیں آئی۔

انھوں نے سمجھا تھا کہ ضد میں آکر عیسیٰ خان نے ان کی بہن کا اغوا تو کر لیا لیکن کچھ دنوں تک اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر اس نے اس کو حرم بھیج دیا ہوگا۔ عیسیٰ خان کی طرف سے کیدار رائے کا غصہ ذرا بھی کم نہیں ہوا تھا مگر سورن مئی کو بھول چکے تھے جیسے کہ وہ مرگئی ہو۔ سورن مئی کو دوبارہ وہاں سے اپنے محل میں لانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہندو عورت کو اگر کوئی غیر مرد نے چھو بھی لیا تو پھر اس کا اپنے گھر لوٹنا ناممکن ہے اس لئے خاندان کے دوسرے افراد اسے مرا ہوا مان کر چلتے ہیں۔ چاند رائے کی اس لاڈلی بیٹی، اور نہایت پرسکون اور نرم مزاج لڑکی میں ایسا بدلاؤ کیسے آیا؟ آج وہ اپنے ملک اور بڑے بھائی کے خلاف ہتھیار لے کر جنگ کے میدان میں اتری تھی۔ اگلے دن سفید جھنڈا پھیلانے کے بعد پیغام رساں مخالف خیمے میں گیا مگر فوراً ہی ملاقات کا فیصلہ نہیں لیا گیا۔ طرح طرح کی شرطوں کو لے کر دونوں فریقوں میں کھینچا تانی چلنے لگی کیونکہ مخالف

سربراہ سے ملنے کے بہانے ان کو قتل کرنے کی ان گنت مثالیں تھیں جہاں بھائی کو بھائی پر بھروسہ نہیں ہے وہاں بھائی اور بہن میں کیسا بھروسہ؟ دن کے آخر میں طے ہوا کہ دونوں فریقین کی فوج سے کچھ دور بیچوں بیچ ایک جگہ پر ایک نیا خیمہ گاڑا جائے گا جہاں دونوں فریق کے دس دس چنے گئے فوج پہرے پر رہیں گے۔ خیمے کے اندر صرف اس فریق کے راجہ اور دوسرے فریق کی رانی صاحبہ رہیں گی۔

دن ڈھلنے کو تھا، سانجھ ہونے کو تھی،۔ کیدار رائے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں۔ آمنے سامنے دو سنگھاسن رکھے ہوئے تھے۔ کیدارائے ایک پر بیٹھ گئے۔ رانی صاحبہ کے اندر آنے کے بعد کیدار رائے کچھ پل ان کی طرف ٹکٹکی باندھے گھورتے رہے۔ وہ پہچان میں ہی نہیں آرہی تھی جس کو ہمیشہ سفید لباس میں دیکھا تھا، آج وہی رنگین مسلمانی لباس میں سر پر پنکھ لگائے سونے کا تاج پہنے سامنے کھڑی تھی۔ رانی نے ہی بات کرنے کی پہل کی۔

''دادا مجھے تمہاری قدم بوسی کرنی چاہئے تھی لیکن کہیں میرے چھونے سے تمہاری ذات نہ چلی جائے، اس لئے میں دور سے آداب کر رہی ہوں۔'' طنز کے ساتھ کیدار رائے نے کہا۔

''رہنے بھی دے، بہت ہو چکا، تو کیا سچ مچ ہماری سونائی ہے، اپنا دھرم گنوا کر تو ایسی بدصورت لباس میں میرے سامنے آئی ہے۔ اس سے پہلے تو مر کیوں نہیں گئی۔''

رانی نے صاف صاف کہا،'' جو مذہب عورت کو صرف مرنے کے لئے کہتا ہے، میں اس مذہب کو نہیں مانتی۔''

کیدار نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔'' ہمارا مذہب کہاں عورت کو مرنے کے لئے کہتا ہے؟ باپ کی خدمت، شوہر کی خدمت، بیٹے کی خدمت، جیسی عظیم خدمتیں عورتوں کے لئے ہی ہیں، وہ ان کو انجام دیتی ہیں۔ بیوہ عورت عمر بھر پاک دامن رہتی ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی عبادت کر کے کتنے پن کماتی ہیں۔ دوسرے جنم میں بھی اس لئے وہ سدا سہاگن رہتی ہیں۔''

رانی سنگھاسن پر بیٹھی نہیں بلکہ کھڑی رہی اور بولی۔'' پاک دامن کا مطلب ہے کہ اس دنیا کے سارے عیش و آرام سے اپنے کو دور رکھنا۔ سیوا کا مطلب ہے سسرال یا میکے میں دوسروں کی کنیز یا غلام بن کر رہنا۔ مجھے اپنے پہلے شوہر کی شکل تک یاد نہیں۔ میں ایک دن بھی ان کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں جی، پھر بھی ساری عمر ان کا ہی دھیان کرنا پڑے، تم لوگوں نے تو کبھی مجھے چین سے سانس بھی لینے نہیں دیا۔''

آواز رندھنے لگی تھی لیکن رانی اس وقت اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اپنے پر قابو پاتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ ''دوسرے جنم میں تو تم لوگ یقین کر سکتے ہو۔ میں اب مسلمان ہوں، میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی، میں سمجھ گئی ہوں کہ انسان کو اپنی خواہشیں، اپنی چاہت، اسی جنم میں مٹا لینی چاہئے۔''

کیدار رائے بولے۔'' چھی، خود کو مسلمان کہنے میں تم کو ذرا بھی شرم نہیں آتی ۔تو ہمارے خاندان کا کلنک ہے۔ ایک احسان فراموش لٹیرے نے تجھے اغوا کیا تھا۔ اپنا مذہب چھوڑنے سے پہلے تو مری کیوں نہیں، کم سے کم اس سے بھی ہم خوش ہوتے۔''

''دادا تم کو یا تمہارے خاندان کو خوش کرنے کی ذمہ داری اب میری نہیں رہی۔ میرے شوہر نے مجھے جو عزت دی ہے۔۔۔۔۔''

''عزت؟ ان کے حرم میں تیرے جیسی اور کتنی بیویاں ہیں؟''

''جتنی بھی ہوں، کیا ہندوؤں کی آٹھ دس بیویاں نہیں ہوتیں؟'' یہ لوگ تو پھر بھی حرم میں اپنی بیویوں کو کھانے پہننے کو دیتے ہیں اور ہندو؟ وہ تو ایک کے بعد ایک شادی کرتے ہیں اور بیوی کو اس کے میکے چھوڑ آتے ہیں اور اوپر سے جہیز مانگتے ہیں اور سب سے بڑی بات کیا ہے، دادا! میرے شوہر نے مجھے بھرپور آزادی دی ہے۔ مجھے گھوڑ سواری سکھائی ہے ہتھیار چلانا۔۔۔۔''

''یہ فالتو باتیں رہنے دے، اب کام کی بات کرتے ہیں۔''

''تو میرے ساتھ کس بوتے پر جنگ کرنے آئی ہے؟ تیرا راج میں چاہوں تو مسل کر رکھ سکتا ہوں۔ مان سنگھ نے تو میری آدھی فوج کا خاتمہ کر دیا ہے، کل تو اور تیری فوج ہتھیار ڈال دے۔ دونوں راج ایک ہو گئے تو ہم ڈٹ کر مان سنگھ کا مقابلہ کر سکیں گے۔ عیسیٰ خان سے میں نے کئی بار اس بابت کہا تھا لیکن معمولی عیش و آرام کے لالچ میں اس نے میرے ساتھ احسان فراموشی کی۔ میں تجھے وچن دیتا ہوں کہ تیرے یا تیرے بچوں کو کوئی چھو بھی نہیں سکے گا۔ میں تیرے لوگوں کے لئے ماہانہ خرچ بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔ باقی کی زندگی آرام چین سے بسر کرنا۔''

تھوڑی دیر خاموش رہ کر رانی بولی۔'' میرے شوہر آخری سانس تک آزادی کے لئے لڑتے رہے، ان کی موت پر ہمیں ناز ہے۔ انھوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ زندگی کے رہتے میں اس راج کی آزادی کو داؤں پر نہ لگاؤں، میرے دو بیٹے کسی کے غلام نہ بنیں۔ اب تم میرے دشمن ہو، میں آخری سانس تک اپنے ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔ میرے ہر فوجی نے یہ عہد کیا ہے۔''

''اس جنگ میں تو تجھے ہارنا ہی ہے۔ اس کے بعد میری فوج جب لوٹ پاٹ مچائے گی تو میں ان کو روک نہیں پاؤں گا۔ تم سے تم اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچ تو۔۔۔۔''

تبھی باہر سے کسی نے بے قراری کے لہجے میں آواز لگائی۔ ''مہاراج' مہاراج۔''

کیدار رائے نے گرج کر کہا۔ ''آہ، میں نے کہا نا تھا کہ اس وقت مجھے کوئی تنگ نہ کرے، دور ہو جاؤ۔''

اس آدمی نے پھر بھی کہا۔ ''مہاراج! مہاراج! بہت ضروری خبر ہے، آپ کے لئے ابھی جاننا ضروری ہے۔'' مہاراج۔۔۔''

کیدار رائے نے خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا کہ باہر سامنے ان کے تین بہت ہی بھروسہ مند معاون جنگی گھبرائے سے کھڑے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا۔

''مہاراج، راجدھانی سے خبر آئی ہے کہ مہاراج مان سنگھ نے آپ کے پاس ایک پیامبر بھیجا ہے، پیامبر کے پاس ایک خط بھی ہے، تین دن کے اندر اگر اس خط کا جواب نہیں ملا تو وہ لوٹ جائے گا۔''

کیدار رائے تھوڑی دیر بھویں سکوڑے رہے کہ یہ مان سنگھ کی کوئی نئی چال ہے؟'' یہ پیامبر و یامبر تو انھوں نے کبھی نہیں بھیجا۔ سرحد پر آکر بگل بجا کر جنگ کا اعلان ہی ان کا طریقہ ہے۔''

اب دوسرے آدمی نے کہا۔ ''مہاراج اس وقت ہماری راجدھانی محفوظ نہیں ہے، اسی وقت آپ کو وہاں لوٹ جانا چاہئے۔''

دوبارہ خیمے میں آکر کیدار رائے نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''سونائی، میں نے بھی پتا جی کے سامنے قسم کھائی ہے کہ عیسیٰ خان کا راج تہس نہس کئے بنا میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔ فی الحال وہ کام میں ٹال رہا ہوں۔ اس وقت میں مان سنگھ کی فوج کو اچھی طرح سے سبق سکھانے کے قابل ہوں۔ میری بحری فوج مغلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اب تو زمینی جنگ میں میرے ہاتھی سینا بھی ہے۔ مان سنگھ نے اگر اپنی جان بچا بھی لی تو بھی اسے پیچھے تو ہٹنا ہی ہے۔ اس کام کو انجام دے کر میں پھر یہاں آؤں گا اس بات کو یاد رکھنا۔''

اسی رات اپنی ایک گھوڑسوار ٹکڑی کے ساتھ کیدارائے فوراً راجدھانی کے لئے روانہ ہو گئے۔ اب مغل سپہ سالار کے پیامبر کے ساتھ دوسرے ہمراہیوں کی طرح ملا تو نہیں جا سکتا۔ اگلے

ہی دن راج سبھا کو نئے ڈھنگ سے شان و شوکت کے ساتھ سجایا گیا۔ ایک اونچے تخت پر نگینوں سے جڑا سونے کا راج سنگھاسن رکھا گیا۔ درباریوں کو خبر دے کر بلوایا گیا، صدر دروازے کو پھولوں سے سجایا گیا۔''

صبح کو دربار شروع ہوا۔ مان سنگھ کے پیامبر کو مجلس میں بیٹھا کر کیدار رائے دوسری درباریوں کے ساتھ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے میں مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ اپنے میر دربار کے ساتھ مہابھارت کے دشینت شکنتلا اُپھیان اور کالی داس کا ''ابھگیان شاکنتلم'' کن کن پہلوؤں پر الگ ہے، اس پر بات چیت چھیڑ بیٹھے، جیسے وہ سمجھانا چاہتے تھے کہ مان سنگھ کے بھیجے پیامبران کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کہیں مصیبت کی کوئی وجہ نہیں ہے، کچھ دیر وقت گزر جانے کے بعد ان کو جیسے اچانک یہ یاد آ گیا، اس ڈھنگ سے انھوں نے وزیر سے پوچھا۔ ''ارے ہاں، میں نے سنا ہے کہ مہارانا مان سنگھ کی طرف سے پیامبر آئے ہیں، کہاں ہیں وہ، ذرا بلایئے ان کو۔''

وزیر نے کہا۔ ''مہاراج! وہ مجلس میں حاضر ہیں، اس سنگھاسن پر بیٹھے ہیں۔''

اب پیامبر نے پاس آ کر مہاراج کو نہایت ادب و احترام سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ ''مغل سپہ سالار مان سنگھ نے کالی ندی کے اس کنارے اپنا خیمہ ڈالا ہے۔ وہ جنگ اور خون خرابے سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ اس ڈھنگ کے جو بھی زمیندار شہنشاہ کی ماتحتی قبول کرنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ راجہ مان سنگھ دوستانہ رشتہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آپ کے لئے ایک خط اور نذرانے بھیجے ہیں۔''

دور بیٹھے دوسرے پیامبر نے سامنے آ کر ایک صندوق کھول کر اس میں سے ایک تلوار اور لوہے کی ایک زنجیر نکالی۔ پیامبر نے کہا۔ ''جناب عالی! آپ ان دونوں میں سے کسی کو ایک قبول فرمائیں۔ ہم اسی سے آپ کے منشا سے واقف ہو جائیں گے۔'' پیامبر نے ابھی تک کیدار رائے کو راجہ یا مہاراجہ کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خود ہی راجہ بن بیٹھے ہیں۔ دلی کے دربار سے سند ملے بغیر مغل اسے راجہ نہیں مانتے ہیں۔

اپنے سنگھاسن سے اتر کر کیدار رائے نے کہا۔ ''ہر زیور ہر انسان پر نہیں جچتا، یہ زنجیر مان سنگھ ہی قبول ہو''۔ کیدار رائے نے ہاتھ میں اس تلوار کو اٹھا کر کہا۔ ''اس کی تو دھار ہی نہیں ہے، وزن بھی کم ہے۔ میرے راج میں اس سے کہیں زیادہ دھاردار اور وزن دار تلوار تیار کی جاتی ہے۔ مہاراج مان سنگھ اگر ان تلوروں کا سامنا کر چاہتے ہیں تو ان کا استقبال ہے، ذرا ان کا خط لایئے۔''

اس خط کو پڑھتے پڑھتے مہاراج کیدارراۓ نے کہا۔ '' آپ کے مہاراج کے پاس تو ایک ماہر مکتوب نگار بھی نہیں ہے۔'' سچ مچ خط کی زبان بے حد کمزور تھی، اس کی ایک جگہ پر لکھا تھا کہ تری پورہ واسی، مگ، بنگالی سب بھاگ جاؤ، ہاتھی گھوڑا، پیدل اور بحری سینا سے یہ بنگال بھومی کانپ رہی ہے کیونکہ خطرناک سرسنگھ، مان سنگھ اب آچکے ہیں۔''

کیدارراۓ تضحیک آمیز ڈھنگ سے اس خط کو اپنے میر دربار کی طرف بڑھاتے ہوۓ بولے۔ '' آپ خالص سنسکرت میں اس کا جواب لکھ دیجئے۔ اس میں یہ ضرور لکھئے گا کہ شیر اگر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو پھر بھی وہ ایک جانور رہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''یعنی سیدھے سیدھے جنگ کا بلاوا''

مان سنگھ نے اپنی فوج کے ساتھ ندی پار کرنی چاہی۔ کیدارراۓ ان کو زمینی اور بحری راستے سے روکنے کے لئے آگے بڑھے۔ برسوں سے مان سنگھ کو ایسی کڑی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بنگالی فوج جیسے ہر روز اپنی جان کی بازی لگا کر جنگ کے میدان میں اتر رہی تھی ۔کیدارراۓ بھی جیسے آسمانی طاقت سے بھرپور ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کبھی وہ گھوڑ سوار فوج کے سامنے نظر آتے تو دوسرے ہی پل وہ جنگی جہازوں میں کمان داغتے نظر آتے۔ کبھی فوجی اپنے راجہ کو اپنے ساتھ پاتے۔ برق کی سی تیزی سے وہ پورے جنگ کے میدان چھاگئے تھے۔ پہلے دن کی جنگ برابری پر رہی لیکن دوسرے دن مان سنگھ کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مغل فوج ان کے جنگی داؤں پیچ کو سمجھ ہی نہیں پارہی تھی۔ یہ بنگالی فوج سامنے سے زیادہ نہیں آتی لیکن اچانک ہی داہنے بائیں اور پیچھے سے ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑی دھاوا بول دیتی ہے۔ نہ جانے کیسے اتنی جلدی سمت بدل لیتے ہیں یہ بنگالی فوج۔۔

ندی نالے والے دیش کے یہ لوگ پانی کے اندر دیر تک ڈبکی لگاۓ رہ سکتے ہیں۔ دور سے ڈبکی لگا کر تیرتے ہوۓ آکر یہ کب دشمن کی بحری فوج کی ناؤ میں پانی کے اندر سے حملہ کر دیتے ہیں، اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

مغلوں کی زمینی فوج اور کمان کیدارراۓ کی فوج کے مقابلے کہیں زیادہ طاقتور تھی مگر کیدارراۓ کی فوج میں حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جنگ کے نویں دن مان سنگھ پیچھے ہٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ تبھی ایک خوفناک حادثہ ہوا۔

برسات کا موسم آنے والا تھا اس لئے مہاراج کیدارراۓ کی فوج کو اپنی فتح کا یقین تھا

لیکن یکا یک مغلوں کی فوج سے کسی سپہ سالار نے سیدھے کیدارائے کے سر کو نشانے میں لے کر گولی چلا دی۔ نشانہ خطا نہ ہو سکی۔ کیدار رائے گھوڑے سے گر گئے۔ عیسیٰ خان اور کیدار رائے کی موت بالکل ایک ہی ڈھنگ سے ہوئی۔

بنگالی فوج میں ہاہا کار مچ گئی۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر مغلوں نے اپنے حملے میں تیزی پیدا کر دی۔ کیدار رائے کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ مہاراج مان سنگھ اپنی فوج کے ساتھ راج دھانی شری پور آئے، وہاں انھوں نے اپنی فوج کو لوٹ پاٹ کی اجازت دے دی۔ خود اس راج کی دیوی شیلا مئی کی مورتی لے کر چلے گئے۔ سونے کا شری پور تباہ ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد عیسیٰ خان کا راج غیر محفوظ سمجھ کر مگوں نے پھر حملہ کیا مگر نعمت بی بی نے خود اپنی فوج کو یکجا کیا اور خود ہتھیار اٹھا لیا۔ پہلی دفعہ تو انھوں نے مگ سینا کو روکا پھر حاجی گنج درگ میں جا کر پناہ لی۔ دشمنوں کے ساتھ انھوں نے جو گھمسان جنگ کی، ایسا کبھی کسی بنگالی خاتون نے شاید کیا ہو۔

مگوں نے حاجی گنج قلعے کو باہر سے آگ لگا دی۔ نعمت بی بی یعنی سونائی بی بی نے دشمن کے ہاتھ نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ اسی آگ میں کود کر انھوں نے اپنی مرضی سے جان دیدی۔ ان کا بدلہ اور ان کے قسم دونوں پورے ہو گئے۔

☆☆☆

پابوسی

نیل کمل برہم

پروفیسر الکلیش کو لے کر میں اب بھی اکثر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہوں کسی کے دل کی گہرائیوں میں کوئی دکھ درد چھپا ہو تو اسے کسی بھی طرح سے دبانا صحیح نہیں کہا جائے گا۔ اور یہ بھی سوچنے لائق بات ہے کہ باپ مرگین داروغہ نے اگر کسی زمانے میں اپنی سرکاری ڈیوٹی بجانے کے لئے کسی پیٹھ پر دو چار چابک جما ہی دئے تو اس جرم کی سزا بیٹی انولیکھا کو دینا کیا مناسب ہے۔ ایک طرف تو میرا دوست الکلیش ہے، دوسری طرف میری شاگرد وہ انولیکھا۔ ان کے علاوہ بیچ میں بے چارہ مرگین داروغہ۔ اب ریٹائرڈ۔ میرا کسی کے تئیں حمایت نہیں ہے۔ ان کے بیچ جو بھی کچھ ہوا اس سے مجھے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ الکلیش اور انولیکھا کی آپس میں شادی ہو جاتی تو اچھا ہوتا، مجھے خوشی ہوتی۔ عمر کا حساب لگائیں تو پروفیسر الکلیش کی شادی کب کی ہو جاتی۔ کالج کے دنوں میں میرے ساتھ ہی تھا الکلیش یعنی اگر آج اسے کسی بھی لحاظ سے نوجوان نہیں کہا جاسکتا۔ میری بڑی بیٹی ہی اس بار I.M.S اسکالرشپ کا امتحان دے گی۔ وہ کہاوت ہے نا کہ پیدائش، انتخاب اور موت پر کسی کا بس نہیں۔ یہ تینوں چیزیں آدمی کی زندگی میں جب ہونی ہوگی تو ہو کر رہے گی۔ اور اگر ہونی نہیں لکھی ہوگی تو لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہیں ہوگی۔ الکلیش کے لئے میرے دل میں دکھ نہیں ہے۔ انولیکھا کو لے کر بھی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی میرے دل میں ریٹائرڈ مرگین داروغہ کے تئیں کوئی غصہ ہے۔ پھر بھی یہ خیال دل سے نکال نہیں پاتا کہ الکلیش انولیکھا ازدواجی زندگی میں بندھ جاتے تو اچھا ہوتا۔ دراصل الکلیش تھوڑا اڑیل قسم کا لڑکا رہا ہے۔ جو سوچ لیا اس سے ٹس سے مس ہونا اسے منظور نہیں ہوتا۔ ورنہ باپ کی غلطی کے لئے بیٹی انولیکھا کو کیوں زندگی بھر کا دکھ دیتا۔ شادی کی بات سب سے پہلے الکلیش کے دل میں آئی تھی۔ انولیکھا کو پسند کرنے والا بھی الکلیش خود ہی تھا۔ ''شادی کروں گا تو انولیکھا کے ساتھ ہی کروں گا۔''

اسٹاف کامن روم میں ایک دن خود الکلیش کے من سے یہ جملہ نکلا تھا۔ انولیکھا کو دیکھنے

جانے کی بات نکلی۔ بوڈو سماج کا یہ اصول ہے لڑکا لڑکی کا پہلے سے تعارف ہو تب بھی ہونے والی بہو کو دیکھنے جانے کے بہانے ان کی ذات برادر والوں کی عزت میں تامبول پان اور دو بوتل جو تحفے میں دے کر سماجی رسم کو نبھانا پڑتا ہے۔ سماج میں کتنا کچھ بدل گیا ہے لیکن بوڈو سماج میں شادی کے وقت اس اصول کا اب بھی پالن ہوتا ہے۔

الکیش کے خود لڑکی دیکھنے جانے کی بات تھی۔ انولیکھا ان دنوں گھر پر ہی تھی۔ ہماری بھی گرمی کی چھٹیاں تھیں۔ میرا ارادہ چھٹیوں میں دارجلنگ میں سالی کے یہاں جانے کا تھا۔ ایک دن اچانک الکیش میرے یہاں حاضر ہو گیا۔ لڑکی دیکھنے جانے کا پروگرام طے کرنے۔ دوسرے دن ۱۵ ڈاؤن ایکسپریس سے ہم انولیکھا کے گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ انولیکھا کے گاؤں پہنچنے کے لئے اسٹیشن سے دو میل کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔

الکیش تو راستہ جانتا ہی تھا اس لئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی حالانکہ سر کے اوپر جیٹھ کا سورج تپ رہا تھا۔ جب ہم تھکے ہارے بھوکے پیاسے انولیکھا کے دروازے تک پہنچے تو پورا گاؤں خاموش تھا۔ راستے میں مشکل سے ایک دو لوگ نظر آئے۔ انولیکھا کے گھر کے اندر کافی چہل پہل تھی۔ شاید انولیکھا کے والدین نے رشتہ داروں کو بلا رکھا تھا۔ مجھے ماحول میں شادی جیسی فضا نظر آئی۔ کوئی کھانے پینے کے لئے کئے گئے انتظام دیکھتا تو چھوٹی موٹی شادی ہی سمجھتا۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھا کر انولیکھا کسی دوسرے کمرے پر گھس گئی۔ اس درمیان ہمارے کمرے کی کھڑکی سے کئی لوگوں کی نظریں الکیش کو دیکھنے لگیں۔ دیکھنے والوں میں کوئی اس کا بہنوئی ہوگا، کوئی سالا ہوگا، کوئی ساس ہوگی۔ سب کی زبان بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ پتہ نہیں مکھیوں کی طرح کیا بھنبھنا رہے تھے۔

کافی دیر بعد انولیکھا ہمارے لئے چائے لے کر آئی۔ اس بیچ ہم نے انولیکھا کے ماں باپ یا چاچا، ماما وغیرہ کے ساتھ اکثر ایسے موقعوں پر کی جانے والی بات چیت نہیں کی۔ کوئی ہمارے پاس آیا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے پیچھے تھک ہار کر آئے مہمانوں کو آرام کرنے دینے کا مقصد ہو۔ آخر ہم نے چائے بھی پی کر ختم کر دی۔ انولیکھا پھر ایک بار خالی کپ لینے آئی اس کے پیچھے پیچھے ایک عمر دراز آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ انولیکھا کے رویوں سے ہم نے اندازہ لگا لیا کہ وہی اس کے باپ ریٹائرڈ داروغہ مرگین کا تھام تھے۔

عمر دراز آدمی کو عزت دینی چاہئے۔ پھر ان کی ہی لڑکی کے ساتھ شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اٹھ کر ان کے پاؤں چھو کر سلام کیا۔ شاید شرم سے یا اس طرح

پاؤں چھو کر سلام قبول کرنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے الملیش اپنی جگہ سے اٹھا ہی نہیں۔ کمرے میں آنے کے بعد جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی بغیر ٹس سے مس ہوئے بیٹھا رہا۔ منہ سے چوں تک نہیں کی۔ انولیکھا کے باپ اور میرے درمیان دھان چاول سے لے کر سیاست تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن الملیش نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مرتین دارونہ سے ساتھ بات چیت کے بعد لگا کہ وہ بوڑھوذات کے مستقبل کو لے کر کوئی خاص پرامید نہیں ہے۔ بوڑو زبان کے حامیوں کے لئے ان کا خیال یہ تھا کہ وہ ہمارے بچوں کو کنویں کا مینڈک بنانا چاہتے ہیں۔

دوپہر گذر گئی۔ بات چیت میں میری دلچسپی کم ہوتی گئی۔ بھوک سے پیٹ میں انتڑیاں اینٹھنے لگیں۔ اسی وقت ہاتھ میں دو گمچھے لئے انولیکھا ہمارے کمرے میں داخل ہوئی۔ بات چیت میں میری دلچسپی کم ہونے کا شاید اندازہ لگا کر مرتین دارونہ ہمارے کمرے سے نکل گئے۔ انولیکھا نے دونوں گمچھے کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''کنویں پر نہانے میں وقت ہو تو پاس ہی ندی ہے وہاں نہا سکتے ہیں۔''

اب جا کر الملیش کے منھ سے الفاظ نکلے۔

''ہاں ہاں، یہ ٹھیک رہے گا کنویں پر لوگوں کی بھیڑ بھی ہوگی۔'' کہتے ہوئے وہ اپنا سوٹ کیس لینے کے لئے آگے بڑھا۔

''سوٹ کیس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تولیہ اس میں بھی ہے، چلو چلو۔'' یہ کہتے ہوئے ہڑبڑی میں وہ دروازے تک پہنچ گیا۔

گھر کے باہر بھی الملیش کی ہڑبڑی دیکھ کر مجھے عجیب لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے پوچھا۔ ''گھاٹ کا راستہ تو یہ نہیں ہے۔'' اس پر الملیش نے عجیب سا جواب دیا۔ ''زندگی کو ہم ایک ڈھونگی سمجھیں اور دنیا کو ایک ندی تو ایسے ایک دو نہیں ہزاروں گھاٹ آئیں گے جہاں ہمیں لنگر ڈالنا ہوگا۔ میں انولیکھا نام کے گھاٹ پر لنگر ڈالنا چاہتا تھا لیکن گنوار مرتین دارونہ کی وجہ سے میرا ازدواجی زندگی کا سنہرا خواب ٹوٹ گیا۔''

بات کو سمجھ پانا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ لیکن اس پہیلی کو بوجھنے کا میرا دل نہیں تھا۔ میرے دل میں تو یہ چڑھ تھی کہ لڑکی دیکھنے کے لئے ساتھ لا کر الملیش نے اس طرح میرے لئے منہ چھپانے والے حالات پیدا کر دیے۔

اسٹیشن پہنچنے تک میں کچھ نہیں بولا۔ الملیش بھی چپ رہا۔ اسٹیشن پہنچتے ہی میں نے

سیدھے Refreshment Room میں جا کر دو تھالی کھانے کا آڈر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ویٹنگ روم میں اللیش سے کہا۔ ''آدمی کی زندگی اور اس کی غیرت کے ساتھ اس طرح کھلواڑ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا ہی کرنا تھا تو کم سے کم مجھے ساتھ نہیں لانا تھا۔'' تھوڑی دیر اللیش چپ رہا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا تھا تو یہی کہے گا۔ میری وجہ سے تمھاری عزت گئی اس کے لئے سچ مچ مجھے افسوس ہے، لیکن ہوسکتا ہے خاص مجرم میں نہ ہوں۔''

شام کی ۱۶اپ اکسپریس آنے میں اب تھوڑی دیر تھی۔ دلی تکلیف اور تھکان کی وجہ سے میرا کچھ بھی بولنے کا جی نہیں کر رہا تھا۔ ویٹنگ روم کے ایزی چیر پر بدن کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے میں پسر گیا۔ لیکن اللیش کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ بے قراری کے عالم میں تھا۔ آنکھوں میں دکھ اور درد کی صاف تصویر جھلک رہی تھی۔ ہوسکتا ہے انولیکھا کو چاہنے کے بعد اب اس کے ساتھ اپنی شادی کا راستہ خود ہی روکے جانے کی وجہ سے پچھتاوے کی آگ میں اس کا دل جل رہا ہو، میں نے اس کی حس کو جھجھوڑنے کے ارادے سے کہا۔ ''تب شادی نہیں ہوگی؟''

''شادی؟'' چونک کر اللیش نے میری طرف دیکھا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ ''کسی اور کے ساتھ ہوسکتی ہے لیکن مرگین داروغہ کی بیٹی کے ساتھ تو ہرگز نہیں ہوسکتی۔''

''کیوں؟''

''اس کیوں کے جواب میں ہی سب کچھ چھپا ہے، اسی میں تمھیں اس بات کا جواب مل جائے گا کہ میں نے انولیکھا کے باپ کی قدم بوسی نہیں کی۔ بغیر کچھ کھائے، بغیر کچھ باتیں کئے کیوں واپس لوٹ آیا۔ کیوں میں نے تمھارے ان کے اور میرے لئے شرمندہ ہونے والے حالات پیدا کئے۔''

قصہ سنانے کے انداز میں اللیش ایک سرے سے واقعات سناتا گیا۔ کالج میں وہ تاریخ پڑھاتا ہے اور اسے باتوں کو سِن وار طریقے سے اور معتبر انداز سے کہنے کا ہنر آتا ہے۔ جب تک وہ بولتا رہا، میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ جب اس نے کہانی پوری کی 16 Up آنے کا وقت ہوگیا تھا۔

گھر لوٹنے تک اللیش کی باتیں میرے دل کے اندر آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اللیش، انولیکھا کی شادی ہونا مناسب ہے یا ان کا ازدواجی زندگی میں نہ بندھنا ہی ٹھیک رہا۔

اللیش کی باتوں کو بے بنیاد یا غلط نہیں کہا جاسکتا۔ اپنے ہی لوگ آدمی کے خاص دشمن

ہوتے ہیں یوراج ڈے مالو کو سوتیلی ماں کی ڈاہ کی وجہ سے موت کو گلے لگانا پڑا تھا۔ راون کی سونے کی لنکا بھائی وبھیشن کی دغابازی کی وجہ سے ہی جلی تھی۔ بھائی میر جعفر کی وجہ سے سراج الدولہ کو تخت و تاج گنوانا پڑا تھا۔ ہر ذات میں اپنے پیٹ کی خاطر سماج کے فائدے کے لئے کئے جانے والے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے والے کُل کے کلنک پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ المیش کے مطابق مرتین داروغہ بھی ایسا ہی ایک کلنک ہے۔ کالج کے دنوں میں بوڈو زبان کے لئے رومن لپی کی مانگ کو لے کر ہونے والے مظاہرے میں حصہ لیتے ہوئے جب المیش بھی گرفتار ہوا تھا تب اس تھانے کا داروغہ مرتین ہی تھا۔ اس نے حوالات میں المیش اور اس کے ساتھیوں کی جم کر دھنائی کی تھی۔ پیٹھ پر داروغہ کی بوٹ کی مار سے بنے داغ اب بھی المیش کو اس واقعے کی یاد دلا جاتے ہیں۔

اپنی بات پوری کر کے المیش نے میری طرف قابل فکر ایک سوال اچھال دیا تھا۔

"جس آدمی کے دل میں اپنے سماج کے تئیں کوئی محبت نہ ہو، جو دوسروں کا نمک کھا کر اپنے ہی سماج کے مستقبل کو تباہ کرتے ذرا بھی نہیں ہچکتا ہو، ویسے آدمی کی بیٹی سے میں کیسے شادی کر سکتا ہوں؟ جن پیروں کو بوٹ نے میرے پیٹھ کو لہولہان کیا تھا۔ ان پیروں کو چھو کر میں کیسے سلام کر سکتا ہوں؟"

اتنا سننے کے بعد میں کچھ نہیں بولا۔ ایک طرف المیش کی کہانی پوری ہوئی دوسری طرف اسٹیشن پر آتی ہوئی 16UP ایکسپریس کی آواز سے پلیٹ فارم گونجنے لگا۔

☆☆☆

مرحوم نیل کمل برہم (۱۹۴۷۔۱۹۹۸) بوڈو کے افسانہ نگار، شاعر، ڈراما نگار، تنقید نگار اور ناول نگار۔ پانچ افسانوں کے مجموعے، ایک ناول، بچوں کے لئے دو کتابیں شائع ہو چکے ہیں۔ راتک سار انعام سے اعزاز یافتہ۔

پنجابی کہانی

کوئی ایک سوار

سنتو کھ سنگھ دھیر

سورج کی ٹکلی ساتھ تانگہ جوت کر اڈے پر لگاتے ہوئے بارو تانگے والے نے ہانک لگائی۔ '' ہے کوئی ایک سوار کھنّے جانے والا بھائی؟'' سردی کے موسم میں اتنی صبح کسی سبب سے بھلے ہی کوئی سوار آ جائے نہیں تو روٹی پانی کھا کر دھوپ نکلنے کے بعد ہی آدمی گھر سے نکلتا ہے لیکن بارو اس موقع کو بھی کیوں کھوئے؟ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بھی وہ سب سے پہلے اپنا تانگہ اڈے پر لگانے کی سوچتا۔

بارو نے بازار کی طرف منہ کر کے اس طرح زور سے ہانک لگائی جیسے اسے کُل ایک سوار کی ہی ضرورت ہے لیکن بازار کی طرف سے ایک سوار بھی نہ آیا۔ پھر اس نے گاؤں کی طرف سے آتی الگ الگ پگڈنڈی کی طرف آنکھیں اٹھا کر امید کے ساتھ دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔ نامعلوم کبھی کبھی سواریوں کو بھی کیا سانپ سونگھ جاتا ہے؟ بارو سڑک کے ایک طرف پٹری والے کے پاس بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔

بارو کا چنچل گھوڑا آرام سے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس نے دو تین بار نتھنے پھلا کر خراٹے مارے اور پھر اپنے آپ دو تین قدم چل پڑا۔ ''بس او بیٹا! اتاؤلا کیوں ہوتا ہے، چلتے ہیں۔ آنے دے کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کو۔'' مستی سے ہنستے ہوئے بارو نے لپک کر گھوڑے کی لگام تھامی اور اس کو کس کر تانگے کے بمبو کے ساتھ باندھ دیا۔

اسٹیشن پر گاڑی نے چیخ ماری۔ گاڑی کی چیخ بارو کے دل میں لگ گئی۔ اس نے گاڑی کو ماں کی گالی نکالی اور ساتھ ہی ریل بنانے والے کو بھی۔ '' پہلے جنتا نکلی تھی اب ڈبے! سالی گھنٹے گھنٹے کے بعد گاڑیاں چلنے لگ پڑی ہیں۔'' سواری کے لئے بارو نے ایک بار پھر سے اونچی آواز میں ہانک لگائی۔

اس نے ایک بیڑی اور سلگائی اور اتنا گہرا کش لیا کہ آدھی بیڑی پھونک دی۔ بارو نے

دھوئیں کا غبار چھوڑتے ہوئے بیڑی کو گالی نکالتے ہوئے پھینک دیا۔ مرچ کی مانند اس کا دھواں تیکھا لگ رہا تھا۔

گھوڑے کو چین نہیں تھا۔ اس نے ایک دو بار پیر اٹھا اٹھا کر زمین پر مارے۔ منہ میں پھنسی لوہے کی لگام چبا چبا کر تھوبڑا گھمایا۔ تانگے کی چولیں ہلیں۔ چر مر کی آواز نکلی، پنچھوں کی رنگ برنگی کلغی ہوا میں پھڑکی اور بالوں کے پاس لٹکے ریشمی رومال ہلنے لگے۔ بارو کو اپنے گھوڑے کی چستی پر ناز ہوا۔ اس نے پچکار کر کہا۔ ''ٹھہر جا بیر یا کرتے ہیں ابھی ہوا کے سنگ باتیں''

''بارو تیرا گھوڑا بہت چنچل ہے، کودتا پھاندتا رہتا ہے۔'' پھیری والے نے کہا۔

''کیا دانت نہیں؟'' بارو فخر سے بولا۔ ''کیا ہے تو دیکھ تو، بدن پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔''

''جانور بچتا بھی تبھی ہے۔'' نتھو نے یقین سے کہا

اچھا خاصا دن نکل آیا تھا لیکن کھنئے جانے والا ایک سوار بھی ابھی تک نہیں آیا تھا اور بھی تین چار تانگے اڈے کے اندر آ کھڑے ہوئے تھے اور کندن بھی سڑک کی دوسری طرف کھنئے کے رخ کی طرف تانگہ کھڑا کر کے سواریوں کے لئے ہانک لگانے لگا تھا۔

ہاتھ میں جھولا لئے ایک شوقین جیسا بابو بازار کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ بارو اس کی چال پہچاننے لگا۔ بابو اڈے کے اور قریب آ گیا لیکن ابھی تک اس کے پیروں نے کسی جانب کا رخ نہیں کیا تھا۔

''چلو ایک سوار سرحد کا، کوئی ملوٹھ جانے والا ہو۔'' آوازیں اونچی ہونے لگیں لیکن سواری کی مرضی کا پتہ نہ چلا۔ بارو نے کھنئے کے لئے ہانک لگائی۔ سوار نے سر نہ اٹھایا۔ ''جنٹل مین آدمی کیوں کر جلدی منہ سے بولتے ہیں؟'' بارو نے دل ہی دل میں ملامت کی اور بابو کھنئے کی طرف کھڑے تانگے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ''اور ہے کوئی سواری؟'' اس نے مشکل سے بول کر پوچھا۔

بارو نے ادب کے ساتھ جھولا پکڑتے ہوئے کہا۔ ''لے لیں ...!''

لیکن بابو نے جھولا نہیں دیا اور ہوا کو دیکھتا ہوا خاموشی سے کھڑا رہا۔ ''یوں ہی گھنٹہ بھر تانگے میں بیٹھے رہنے کا کیا مطلب؟''

بارو نے زور لگا کر ایک سوار کے لئے ہانک لگائی جیسے اسے صرف ایک ہی سوار کی ضرورت ہو۔ بارو ذرا ٹہلتے ہوئے تانگے کے اگلے حصے کے قریب آ گیا۔ بارو نے بڑے صبر کے ساتھ ایک اور ہانک لگائی۔

بارو نے اپنا جھولا تانگے کی اگلی سیٹ پر رکھ دیا۔ اور خود پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے لگا۔ بارو نے دلار سے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر تانگے کی پچھلی سیٹیں یوں ہی کچھ ٹھیک ٹھاک کرنے کا دکھاوا کرنے لگا۔ اتنے میں ایک سائیکل سوار آ کر تانگے کے پاس رک گیا۔ سائیکل سوار نے اس پر بیٹھے بیٹھے تھوڑی دیر بابو کے ساتھ بات کی اور وہ اپنا جھولا اٹھانے لگا۔ بارو نے بے چارگی سے کہا۔ ''ہوا سامنے کی ہے باؤ جی۔'' سائیکل سوار بابو کو لے کر روانہ ہو گیا۔

دن چڑھ رہا تھا۔

بارو مایوس ہو کر ایک بار پھر سڑک کے کنارے پٹری والے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا من سینزر سگریٹ پینے کے لئے للچایا لیکن دو پیسے والی سگریٹ ابھی وہ کس حوصلے کے ساتھ پیے؟ آج مشکل سے ایک ہی پھیرا لگنے کی امید تھی۔ کھنتے کے لئے چار آنے سواری تھی۔ چھ سواریوں سے زیادہ لے جانے کا حکم نہیں ہے۔ تین روپے تو گھوڑے کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے دل میں ضرب سی لگنے لگی۔ اس طرح وہ یہاں پر کیوں بیٹھے؟ وہ وہاں سے اٹھ کر تانگے کی پچھلی گدی پر بیٹھ گیا۔ اس لئے کہ دور سے دیکھنے پر سواری کو تانگہ خالی نہ لگے۔

تانگے پر بیٹھا وہ لارالپا، لارالپا گانے لگا اور پھر ہیر کا بند لیکن جلد ہی اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ٹپے اس کے ہونٹوں کو بھول گئے۔ وہ دور فصلوں کی طرف جھانکنے لگا۔ بل کھاتی پگڈنڈیوں پر کچھ راہی چلے جا رہے تھے۔ قریب آتے ہی راہ گیروں کو بارو نے دھیان سے دیکھا۔ سفید اور چوکھانے کھیس اوڑھے کل چار جاٹ تھے۔ بارو نے سوچا پیشی بھگتنے والے ہوتے ہیں اس طرح کے چودھری۔ اس نے تانگے کو موڑ کر ان کی طرف کرتے ہوئے آواز لگائی۔ ''کھنتے جاؤ گے لمبردارو؟ آؤ، بیٹھو، چلیں..........''

سواریوں نے کچھ کن من سی کی، پھر ان میں سے کسی نے کہا۔ ''جانا تو ہے اگر جلدی چل پڑو..........''

''ابھی لو، بس بیٹھنے کی دیر ہے۔'' بارو نے گھوڑے کے منہ کے پاس سے لگام پکڑ کر تانگے کا رخ اڈے کی طرف کر دیا۔

''ہمیں تحصیل پہنچنا ہے، ہمارے پیشی ہے۔''

''اجی بیٹھئے تو سہی، پنچھی کو پر نہیں مارنے دوں گا۔''

سواریاں تانگے میں بیٹھ گئیں۔ ایک سواری کے لئے ہانک لگاتے ہوئے بارو نے

تانگے کو اڈے کی طرف سرکا دیا۔

''ابھی اور چاہئے ایک سواری؟ آخر تانگے والا ہی نکلا۔'' ان میں سے ایک نے کہا

''چلو اسے اپنا گھر پورا کر لینے دو'' کسی نے جواب دیا۔ ''سمجھ لو ہم آواز پڑنے کے بعد پہنچ جائیں گے۔''

اڈے سے بارو نے تانگہ بازار کی طرف بھگا دیا۔ بازار کے کنارے بارو نے تانگے کے بمبو پر تن کر آواز لگائی۔ ''ہے کوئی اکیلا سوار کھنے کے لئے بھائی''

''اکیلے سوار کو راستے میں لوٹو گے؟'' بازار سے کسی نے بارو کے ساتھ مسخری کی۔

بازار میں ہنسی پھیل گئی۔ بارو کے سفید دانت اور لال ہونٹ دکھائی دینے لگے۔ اس کی گالیں پھول کر چمکنے لگیں اور ہنسی میں ہنسی ملاتے ہوئے سواری کے لئے ہانک لگاتے ہوئے اس نے گھوڑے کو موڑ لیا۔

اڈے پر آ کر کھنے جانے والے راستے پر سڑک کے ایک طرف تانگہ روک کر خود چڑی والے کے پاس جا بیٹھا۔

''وہی بات کی نا؟'' تانگے والے کو ٹالتے دیکھ کر ایک سوار بولا۔ ''ارے بھائی تانگے والے ہمیں اب یوں ہی پریشان کرو گے؟''

''اجی ہمیں رکنا نہیں ہمیں لمبردار! بس ایک سواری کی تلاش ہے۔ مل گئی تو ٹھیک نہیں تو چل پڑیں گے۔'' بارو نے تسلی دی۔

سواریوں کی بے چینی دیکھ کر کندن نے اپنے تانگے کو ایک قدم اور آگے کرتے ہوئے ہانک لگائی۔ ''چلو چاروں سوار لے کر کھنے کو؟'' چڑھانے کے لئے وہ بارو کی طرف گھورنے لگا۔

''باز آ جا رے تائی کے، باز آ جا اپنی کرتوتوں سے'' بارو نے کندن کی طرف آنکھیں نکالیں اور سواریوں کو ہوا لگنے سے بچانے کے لئے اس نے لڑکیوں اور عورتوں کی آتی ہوئی رنگ برنگی ٹولی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم چلتے ہیں سردارو! ابھی بس وہ آ گئی ہیں سواریاں۔''

ٹولی کی طرف دیکھتے ہوئے بارو سوچنے لگا۔ بیاہ گونے کی ایسی سنوری سواریاں ہیں جیسے دو تانگے بھر جائیں، چاہیں تو، اس طرح کی سواریاں پیسے اچھے دے جاتی ہیں۔

ٹولی نزدیک آ گئی۔ کچھ عورتیں لڑکیاں ہاتھوں پر رومال سے ڈھکی ہوئی ٹوکریاں، طشتریاں اور تھال اٹھائے ہوئے تھیں۔ ان کے پیچھے گھونگھٹ والی دلہن اور ننھی ننھی بچیاں تھیں۔

بارو آگے بڑھ کر بیٹی جیسا بیٹا بن کر ایک مائی سے بولا۔ ''آؤ مائی جی، تانگہ تیار ہے۔ بس آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ بیٹھو کھنے کے لئے۔''

''ارے نہیں ویر'' ماں نے سرسری طور پر کہا۔ ''ہم تو ماتا کے تھان (مندر) پر ماتھا ٹیکنے جا رہی ہیں۔''

''چنگا مائی چنگا'' بارو ہنس کر بے چین سا ہو گیا۔

''ارے بھائی چلو گے کہ نہیں؟'' سواریوں میں سے ایک نے کہا۔ ''انھیں کہاں ہوتا ہے صبر؟'' بارو بھی ہر بار انھیں کیسے کیسے طریقوں سے ٹال رہا تھا۔ ہار کر اس نے صاف صاف کہا۔ ''چلتے ہیں بابا۔ آ جانے دو ایک سواری کو کچھ بھاڑا ابھی تو ہے.........''

''تم اپنا بھاڑا بناؤ، ہماری تاریخ نکل جائے گی۔'' سواریاں بھی بچی تھیں۔

کندن نے پھر چھیڑتے ہوئے سنا سنا کر کہا۔ ''بعض لوگ بھولے ہوتے ہیں، کہاں پھنس گئے، اگا تو چلتا ہی نہیں۔ اگر چلا بھی تو کہاں پر اوندھا پڑا ہوگا پیروں پر لہو رستا..... گھوڑا اگر اٹھ بھی گیا تو راستے میں اڑ جائے گا، سر نہیں لگے گا۔''

سواریاں کان کی کچی ہوتی ہیں۔ بارو کو ایک چڑھے ایک اترے لیکن وہ چھیڑ چھاڑ کو ابھی بھی برداشت کرتی ہوئی کندن کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نائی کے رے نائی کے، تیری موت منڈرا رہی ہے۔ پہلے ماں کے پاس جا کر اپنی گاڑی کو تو سدھروالا، ڈھینچوں ڈھینچوں کرتی ہے۔ یہیں کھڑا بھونکے جا رہا ہے۔ نیچ ذات''

لوگ ہنسنے لگے لیکن جیسی حالت بارو کی تھی وہی کندن اور دوسرے تانگے والوں کو بھی تھی۔ کے سواریاں نہیں چاہئے تھیں۔ کس نے گھوڑے اور گھر والوں کے پیٹ نہیں بھرنا تھا۔ نہ تو بارو بیچ میں سے چلے نہ کسی اور کو چلنے دے۔ کہاں منحوس اڑا ہوا ہے آگے۔ کندن نے اپنی جڑ پر چیرا لگاتے ہوئے غصے میں آواز لگائی۔ ''چلو چاروں کو لے کر کھنے کی طرف چلتا بمبو کاٹ۔ چل منٹوں سکنڈوں میں کھنے پہنچا تا چل، بھاڑا ابھی تین تین آنے.........'' اور اس نے اپنا تانگہ ایک قدم اور آگے کی طرف کر لیا۔

بارو کی سواریاں پہلے ہی توبہ کر رہی تھیں اور پھر سواریاں کسی کی سگی بھی نہیں ہوتیں۔ تنگ آ کر وہ تانگے سے اترنے لگے۔ بارو نے کندن کو للکارتے ہوئے ماں کی گالی نکالی اور دھوتی کو لانگڑ لگا کر کہا۔ ''اتر بیٹا تانگے سے نیچے۔''

کندن بارو کو غصے میں تنا ہوا دیکھ کر کچھ کھسیایا لیکن وہ تانگے سے نیچے نہیں اترا اور بولا۔

''منھ سنبھال کر نکالنا گالی۔ کالی زبان والے''

بارو نے ایک گالی نکالی اور ہاتھ میں پکڑی سنٹی پر انگلیاں جوڑتے ہوئے کہا۔'' پیٹ کے گزوں میں سے تہرا کر کے نکال دوں سالے کو....''

''تم ہاتھ تو لگا کر دیکھو۔'' کندن اندر سے ڈرتا تھا لیکن اوپر سے بھڑکتا تھا۔

''اوئی کہتا ہوں باز آ جا نائی کے۔ لہو کے بوند تک زمین پر گرنے نہیں دوں گا۔ کھڑے کھڑے لہو پی جاؤں گا۔'' بارو غصے میں تھا کہ کندن اس کے برابر کی گالی کیوں نہیں نکالتا۔

آس پاس کی سواریاں دونوں کے منھ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''میں نے تجھے کچھ کہا ہے۔ تو فالتو میں ناک چڑھا رہا ہے۔''

''میں تو ہانک لگا رہا ہوں، تو باندھ لے اپنی سواریوں کو۔''

''میں صبح سے تیرا منھ دیکھ رہا ہوں، چوٹی اکھاڑ دوں گا۔''

''اکھاڑ دے گا تو چوٹی؟۔'' کندن برابر مقابلہ کرنے لگا۔

''تو میری سواریوں کو بٹھائے گا۔''

''ہاں بیٹھاؤں گا۔''

''بیٹھا کر تو دیکھ'' بارو نے آستین چڑھالی۔

''آ بابا.....'' کندن نے ایک سوار کو کندھے سے پکڑا۔

بارو نے جھپٹ سے کندن کا گریبان پکڑ لیا۔ کندن نے بھی بارو کو لپیٹ لیا۔ دونوں الجھ پڑے۔ پکڑو، چھڑاؤ کی آوازیں آنے لگیں۔ آخر دوسرے تانگے والوں اور سواریوں نے دونوں کو چھڑا دیا۔ اڈے کے ٹھیکیدار نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ سبھی نے یہی کہا کہ سواریاں بارو کے تانگے میں ہی بیٹھیں گی۔ تیس تو ان آنے فالتو کی بات ہے۔ کسی نے لینے نہ دینے۔ کندن کی سبھی نے لعنت ملامت کی۔ سواریاں پھر سے بارو کے تانگے میں جا کر بیٹھ گئیں۔

بارو کو اکیلا اور دکھی دیکھ کر سواریوں کو اب اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ سارے مل جل کر اس کا تانگہ بھر اپرا کر کے چلوانا چاہتے تھے۔ سواریوں نے بھی کہہ دیا کہ وہ کچھ پل اور ٹھہر جائیں گی۔ یہی اپنا گھر پورا کر لے۔ اس غریب نے بھی اپنا اور جانور کا پیٹ بھرنا ہے۔

اتنے میں بازار کی طرف سے آتے آتے پولیس کے حوالدار نے قریب آ کر پوچھا۔'' ارے لڑکو، کھنے جانے کے لئے کوئی تانگہ تیار ہے؟''

پل بھر کے لئے بارو نے سوچا۔ ''آ گئی مفت کی سواری نہ پیسہ نہ دھیلا۔'' جھٹ سے اس نے سوچا۔ ''پولیس کو نہ تو کی ہی نہیں جاتی۔ اس کی وجہ سے دو سواریاں زیادہ تو بیٹھا ہی لوں گا۔ نہیں دے گا بھاڑا نہ سہی۔'' اور بارو نے کہا۔ ''آیئے حولدار جی، تیار ہی کھڑا ہے تانگہ، بیٹھئے آگے۔''

حولدار تانگے میں بیٹھ گیا۔ بارو نے ایک سوار کیلئے ایک دو تگڑی آوازیں لگائیں۔

ایک لالہ بازار کی طرف سے آیا اور بغیر پوچھے بارو کے تانگے پر آ کر بیٹھ گیا۔ دو ایک بڑھیا سڑک کی طرف سے اڈے کے لئے آ رہی تھیں۔ بارو نے بے چین ہو کر پوچھ لیا۔ ''مائی کھنے جاؤ گی؟''

بڑھیا جلدی جلدی پیر بڑھانے لگی اور ایک نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''ذرا رکنا ویر''

''جلدی کرو مائی جلدی'' بارو کے پیر جیسے کلبلا رہے تھے۔ بڑھیا جلدی جلدی آ کر تانگے میں بیٹھنے لگی۔

''ارے بھائی کیا لو گے؟''

''بیٹھ جاؤ مائی، تسلی سے تم سے زیادہ نہیں لوں گا۔''

آٹھ سواریوں کے ساتھ تانگہ بھر گیا۔ دو روپے بن گئے تھے۔ چلتے چلتے مالک اور بھیج دے گا۔ دو چکر لگ جائیں اسی طرح بارو نے ٹھیکیدار کو موصول دے دیا۔

''لو بھائی! اب دوریاں ناپو۔'' پہلی سواریوں سے ایک نے کہا

''لو جی! لیتے ہیں رب کا نام'' بارو گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی مار کے بمبو سے لگام کھولنے لگا۔

پھر اسے دھیان آیا کہ ایک سگریٹ بھی لے لے۔ ایک پل کے لئے خیالوں میں اس نے خود کو ٹپ ٹپ چلتے تانگے کے بمبو پر جھک کر بیٹھے دھوئیں کے فرائے بھرتے دیکھا اور وہ بھرے ہوئے تانگے کو چھوڑ کر سیزر سگریٹ خریدنے کے لئے پٹری والے کے پاس چلا گیا۔

بھوکی ڈائن کی طرح امبالے سے لدھیانے جانے والی بس تانگے کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ دوسری ہی پل تانگے میں بیٹھے سواریاں اتر کر بس کے کھڑے پیٹ میں سما گئیں۔ اڈے کا صفایا کرتی ہوئی، ڈائن کی طرح چنگھاڑتی بس آگے چلی گئی، کڑوے دھوئیں کے غبار اور دھول کے بگولے اس کے منہ پر پڑ رہے تھے۔ بارو نے اڈے کے بیچوں بیچ سنٹی اٹھا کر دل اور جسم کو پوری طاقت کے ساتھ ایک بار پھر سے ہانک لگائی۔ ''جا رہا ہے کوئی...... ایک سوار کھنے کی اور بھائی رے......''

☆☆☆

تامل کہانی

اپنا اپنا انت رنگ

ڈی۔ جے کانتن

''ایک منٹ رکئے ابھی بلاتا ہوں آپ کون بول رہے ہیں ؟''
دوسری طرف سے آواز آئی تو اس نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔''میں....ان کا بیٹا ونیو!''
تھوڑی دیر کے بعد اس کے باپ کی آواز فون پر سنائی دی۔''ہیلو! میں سندرم بول رہا ہوں۔''

اچانک ونیو الجھ سا گیا۔ دل میں بھاری ہلچل، غصہ جنون اور نفرت کے جذبے کی اتھل پتھل، ہمت جواب دیتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ سینے میں تیز دھڑکن، ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے، زبان لڑکھڑا اٹھی۔ پھر بھی اپنے کو سنبھالتے ہوئے بولا۔''میں ونیو بول رہا ہوں.... ذرا آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے.....آپ سے اکیلے میں''
''اوہ ٹھیک ہے، میں بھی تھوڑی دیر میں گھر آجاؤں گا۔''
''نا اس کے بارے میں میں گھر پر بولنا نہیں چاہتا اگر آپ وہیں رہیں گے تو ابھی دس منٹ میں ادھر آجاتا ہوں۔''
''وہ آئی سی.......!.......ٹھیک ہے.....آجاؤ.....''
''تھینکس''

''ریسیور نیچے رکھنے کے بعد ونیو نے پیشانی پر چھلکتے پسینے کو پوچھ لیا۔ دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے جانے کیا کیا پوچھنا تھا۔ من کے ترکش میں کلبلا رہے چبھتے سوالوں کو اس نے ترتیب سے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد کسی خاص کام کو انجام دینے کے لئے اپنے کو تیار کرنے کے انداز میں اپنی ہتھیلی پر زور سے مکا مارا۔ کھنکار کر اپنے آپ سے بولا۔''ہوں یہ میرا فرض ہے، خاندان کو بکھرنے سے بچانا میری ذمہ داری ہے۔ اب انہیں اس بات کا

احساس کرانے کا وقت آ گیا ہے کہ ان کا کردار اور چال چلن خود ان کے بیٹے کے ذریعہ قابل مذمت ہے جانے کی حد تک گر چکے ہیں۔ واقعی بے عزتی کی بات ہے یہ مجھے اپنا توازن کھوئے بغیر انصاف کی بات کرتے ہوئے ان کے اس گھناؤنے راز کو افشا کرنا ہوگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹے، کہتے ہوئے لیپا پوتی کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ہوں۔ ان کی میز کی دراز سے وہ کاغذ نکالا ہے۔ بے شرمی کی حد ہو گئی۔ جو رومانی خط ملا ہے اسے اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ ثبوت پیش کرنے پر ناراضگی جتاتے ہوئے پوچھ سکتے ہیں۔ ارے، میری میز کی دراز میں نقلی چابی لگائی، کیا یہ چوری نہیں ہے؟'' چوری چھپے جو یہ پریم کی لیلا رچ رہے ہیں اس کا پتہ لگانے کے لئے میرے ذریعہ کی گئی چوری کوئی گھناؤنا جرم تھوڑی ہی ہے پرسوں رات کو اپنی محبوبہ کے ساتھ جناب نائٹ شو دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ اس کا ٹھوس ثبوت پانے کے بعد ان کے کمرے کی تلاشی کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔''

''وینو جلدی سے کپڑے پہن کر جوں ہی باہر نکلا سامنے سے آ رہی ماں نے اسے دیکھ لیا۔ اس وقت ماں اپنی اقبال بیچ، بیچ کر لیڈیز کلب جانے کے لئے نکل رہی تھیں۔

ادھر کچھ دنوں سے وینو کے برتاؤ اور بات چیت میں جو بدلاؤ نظر آ رہا تھا وہ ماں سے مخفی نہیں تھا۔ یکا یک بیٹے سے آمنا سامنا ہونے پر ماں نے اسے غور سے دیکھا اور فکر مند ہو گئی، سوچنے لگی۔ اس نے کیا صورت بنا رکھی ہے۔ لگتا ہے کئی دنوں سے ٹھیک سے کھایا ہے نہ چین سے سویا ہے۔ جسم دبلا ہو کر کالا پڑ رہا ہے، داڑھی نہ بنانے کی وجہ سے ہونٹ کے ارد گرد ٹھوڑی، گال، اور کنپٹی پر بال اگ آئے ہیں، آنکھوں میں چھائی سستی اور سیاہی سے لگ رہا ہے کہ کوئی ذہنی تناؤ اسے کھائے جا رہا ہے۔ اب یہ بالغ ہو گیا ہے اس طرح سوچتے ہوئے وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''کیوں رے وینو، کدھر نکلے؟''

کہتی ہوئی ماں نے بڑے اپنے پن کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وینو ایک دم سٹ پٹا سا گیا۔

''کوئی ضروری کام ہے ماں!''

''اچھا...... What is wrong with. you my boy'' چاہے کچھ بھی ہو، اگر میں تمھاری کچھ مدد کر سکتی ہوں تو بتاؤ....'' ماں نے کہا۔

''تھینکس'' کہتے ہوئے وینو آگے بڑھنے لگا تو ماں نے اسے روک لیا۔'' چل بیٹے''

اندر رسوئی بنانے والی اماں ۔ نے آج کوئی خاص پکوان بنایا ہے۔ کھا کر چلے جانا!''

پیار بھرے لہجے میں بیٹے سے اس طرح منت کرنے کے بعد ماں نے کلائی گھڑی پر نظر ڈالی جیسے احساس دلانا چاہ رہی ہو کہ مجھے دیر ہو رہی ہے اور وہ نکل گئی۔

وینو لمحے بھر کے لئے وہیں ٹھٹھک کر سوچنے لگا، دیکھو اس ماں کو بابو جی کتنی چالاکی سے ٹھگ رہے ہیں۔ اس ڈھلتی عمر میں بھی ماں کا اس طرح لپ اسٹک اور پاؤڈر لگائے، بنا بازو کا بلاؤز اور اونچی ایڑی کی جوتی پہنے اتراتے پھرنا اور نقلی آواز میں انگریزی بولنا اسے ایک دم بھدا اور گھناؤنا لگ رہا تھا۔''

'' بیٹھک میں ابھی ابھی کونوٹ اسکول سے لوٹے اس کے دونوں چھوٹے بھائی اور چھ سال کی بہن صوفے پر بیٹھ کر موزے کھول رہے تھے، انھیں دیکھ کر وینو کے دل میں رنج کے ساتھ ہمدردی امنڈ پڑی۔

'یہ غیر ذمہ دار ماں اور بد کردار باپ ان معصوم بچوں کے مستقبل کو برباد کر کے ہی چھوڑیں گے۔'

دل میں یہ خیال تو سوچنے لگا۔'اس کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں؟'

'اس کے لئے مجھے کچھ کرنا ہوگا، یہ میرا فرض ہے...... کیا میں اب بھی چھوٹا بچہ ہوں؟' میں اکیس سال کا ہو گیا ہوں...... ہاں، قانونی طور پر میں بالغ ہوں'

اچانک اسے اپنے دادا دادی کی یاد آئی جنھوں نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ شکر ہے میرا پالن پوسن اس کم بخت ماحول میں نہیں ہوا۔

وینو کے باپ سندرم اور ماں رمنی نے پچیس سال پہلے کالج میں پڑھتے وقت محبت کی شادی کر تھی۔ دونوں کی ذات الگ تھی اس لئے وہ اپنے ماں باپ کی مخالفت مول لیتے ہوئے ۔سندرم نے رمنی کا ہاتھ پکڑا۔

رمنی بچپن میں کانونٹ میں پڑھی اور انگریزی تہذیب میں پلی تھی۔ اس کا پورا خاندان مشرقی تہذیب میں شرابور تھا۔ اس زمانے میں سندرم رمنی پر ریجھ گیا تھا۔ تو اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی۔

اس کشش کی وجہ سے ماں باپ کی مخالفت کو طاق پیر رکھتے ہوئے سندرم نے اس سے شادی کر لی تھی۔ گاؤں میں رہنے والے اپنے ماں باپ سے دو سال تک اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

پورے دو سال بعد وینو کی پیدائش ہوئی ۔ بیٹے کی محبت کو عاق کر چکے گاؤں میں رہ رہے کپتی چلّے اور ان کی بیوی وشالم پوتا ہونے کی خوش خبری سے پھولے نہ سمائے ۔ پوتے کا منھ دیکھنے کے لئے ریل گاڑی میں سوار ہوکر چینئی چلے آئے ۔ باپ اور بیٹے کی آپسی رنجش کو دھیرے دھیرے کم کرتے ہوئے دونوں کے بیچ رشتے کا پل بنانے کا کام وینو نے ہی کیا۔

وینو جب چھ سال کا ہوا تو کپتی چلّے نے اسے اپنے ساتھ گاؤں لے جانے کی خواہش ظاہر کی ۔ مذہبی ماحول اور پرانی اور قدیم روایتوں میں محبت سے پالے پوسے بیٹے کو کسی اپنی ہی تہذیب میں لڑکی کے ہاتھوں گنوا دینے کا جو غم دل کو ہلکا کر رہا تھا۔ اس کی بھر پائی کرنے کے خیال سے وہ اپنے پوتے کو گاؤں لے آئے ۔ وینو دادا کے گھر میں پلنے لگا۔ گاؤں میں اس کی پڑھائی لکھائی ہونے لگی ۔ ماں باپ کا گھر اس کے لئے ایسے رشتہ دار کے گھر جیسا تھا جہاں کبھی کبھار چھٹیاں بتانے کے لئے جایا جاتا ہے۔

سندرم کے باپ کپتی چلّے شیو دھرم کے کٹر ماننے والے تھے ۔ تامل میں ان کا گہرا علم تھا ، بھگوان شیو کے گہرے بھگت ۔ قدیم روایتوں میں ڈھلی ان کی بیوی وشالم کو انیسویں صدی کی تانیثیت کی سچّی نمائندہ کہہ سکتے ہیں ۔ شوہر کے سامنے بیٹھ کر بات کرنا وہ گناہ سمجھتی تھی ۔ وینو جب کبھی چھٹیوں میں اپنے ماں باپ کے یہاں آتا تو یہی محسوس کرتا کہ زندگی جینے کا طرز اور رہن سہن ایک اجنبی پن لئے ہوئے ہے ۔ اس کے اپنے ماں باپ پرائے جیسے لگ رہے تھے ۔ بعد میں عمر بڑھنے کے ساتھ وہ اپنے دادا دادی سے ماں باپ کا موازنہ کر کے دیکھنے لگا ، اس کے دل میں دادا دادی ، بااصول میاں بیوی اور ہندوستانی تہذیب کی علامت کے طور پر موجود تھے۔

وینو گاؤں میں میٹرک کرنے کے بعد قریب کے ہی چدمبرم نگر کے کالج میں بھرتی ہوا۔ جدید موضوعات کی تعلیم حاصل کرنے پر بھی اس کی زندگی جدید رنگ ڈھنگ سے متاثر نہیں ہوئی ۔ اب کالج کی پڑھائی پوری ہونے پر چند مہینے ہوئے چینئی میں والدین کے ساتھ رہنے لگا۔ اصل میں دادا دادی سے بچھڑ کر ادھر آنے کا اس کا دل ہی نہیں تھا۔ اس نے دادا جی سے کافی خوشامد کر کے دیکھ لیا۔ ''دادا جی مجھے نوکری ووکری نہیں کرنی ، پڑھے لکھے لوگ نوکری کے پیچھے شہروں کی طرف بھاگتے ہیں ، اسی لئے تو ہمارے ملک کی حالت سدھر نہیں پائی ، مجھے یہیں رہ کر کھیتی کی دیکھ بھال کرنے دیجئے نا؟''

دادی کو بھی اس کی یہ پیشکش اچھی لگی ، کافی دیر تک آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچنے کے بعد دادا جی نے دادی کو سمجھایا۔ ''اری تم بھی اس کے ساتھ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ سوچ

کرو دیکھو جب ہمیں اپنے بیٹے سے بچھڑ کر رہنا پڑا تھا تب تمھارے دل کو چین ملتا تھا۔ اس کے ماں باپ کی بھی تو یہی حالت رہتی ہوگی۔ پڑھائی لکھائی کے نام پر وہ اتنے سارے برس ہمارے ساتھ رہ چکا ہے۔ اب تو اپنے ماں باپ کا بیٹا بن کر یہ ان کے پاس جا رہا ہے۔ یہی انصاف ہے۔"

انھیں بیچ میں ٹوکتے ہوئے ونو نے کہا۔"میں گھر میں جا کر نہیں رہتا اس پر وہاں کسی کو شکایت نہیں ہے۔"

"ونو! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے کہ تمھارے یہاں رہنے پر تم سے زیادہ خوشی ہم دونوں کو بھی ہوگی۔ اب تم تھوڑے وقت کے لئے وہاں جا رہے ہو۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ آج میں تمھیں اتنا سمجھا رہا ہوں مگر تمھارے چھٹی جانے کے بعد ہم دونوں یہاں کیسے اپنے دن کاٹیں گے۔ پتہ نہیں۔ جیسے تم چھٹیوں میں وہاں جا کر رہتے تھے۔ یہی مان کر وہاں تھوڑے دن رہ لینا ٹھیک ہے نا؟" دادا جی نے اس طرح مختلف قسم کی دلیلیں دے کر اسے سمجھایا تبھی وہ چھٹی جانے کو راضی ہوا۔

ان دنوں چھٹیوں میں یہاں آ کر پورے دو مہینے بعد اس سے جو اب محسوس ہوتی اب کے بار دو ہفتے میں ہی ویسی حالت ہوگئی۔ اسے یہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

اپنے ماں باپ کا ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے کھانا کھانا صبح آٹھ بجے تک ماں کا سوتے رہنا اور باپ کا بھاگ بھاگ کر اس کی خدمت کرنا یہ سب ونو کو بڑا گھناونا لگتا تھا۔

ساٹھ برس ہونے کے باوجود صبح سویرے غسل کر کے ماتھے پر ہلدی کم کم کے ساتھ ہنستی دادی کی تصویر اس کے دل میں بار بار ابھرتی تھی۔ یہ جو بابو جی ہیں اچھے خاصے جورو کے غلام ہیں۔ وہ سوچتا اور یہ جو ماں ہیں جب دیکھو یا تو سنیما گھر میں ہوتی ہیں یا لیڈیز کلب میں۔ بابو جی ان کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتے۔ اسی طرح ماں بھی ان کی پرواہ نہیں کرتی۔ چھی۔ یہ بھی کوئی رشتہ ہے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اس کا من جھنجھلا اٹھا۔

"اچھا جانے دو، مجھے کیا فرق پڑتا ہے دادا جی کی بات رکھنے کے لئے کچھ وقت تک یہاں رہنے کے بعد مجھے پھر سے گاؤں چلے ہی جانا ہے۔" اس ارادے سے ان دنوں رہ رہے ونو کے من میں غصہ اور حقارت پیدا کرنے والا ایک واقعہ پچھلے ہفتے رونما ہوا۔

رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بابو جی اس وقت اوپری منزل میں تھے۔ ونو نے فون اٹھایا۔

"ہیلو" اس نے فون نمبر بھی بتایا۔

''میں وتسلا بول رہی ہوں۔ سنئے، آپ سے ملنے کے لئے کالج آئی تھی تب تک آپ نکل چکے تھے۔ سنا ہے sound of music شو کا آج آخری دن ہے۔ نائٹ شو چلیں؟ کیا با ت ہے، آپ کچھ جواب نہیں دے رہے ہیں؟''

وینو کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، شروع میں رانگ نمبر کا جو شک پیدا ہوا تھا وہ کالج میں ملنے کی بات سے خارج ہو گیا۔ کچھ نہیں سوجھا تو ریسیور کو فون پر رکھ کر وہ اس کمرے سے بھاگ نکلا۔ قریب کے اپنے نجی کمرے میں بیٹھے وینو کے دل میں طرح طرح وسوسے جنم لینے لگے۔ اس عورت کو پورا بھروسہ ہے کہ اس گھر میں مرد کی آواز بابو جی کو چھوڑ کر اور کسی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ تبھی تو اطمینان سے بول رہی تھی۔ کیا نام بتایا تھا؟ وتسلا۔ لگتا ہے ان کی کوئی چہیتی ہو گی۔

تھوڑی دیر میں فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی، بجتی ہی رہی۔ وینو اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

سیڑھیاں اتر کر ہال میں آئے سندرم نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو''

وینو دھیرے سے اٹھ کر بیٹھک اور اپنے کمرے کے بیچ والے دروازے کے کواڑ پر کان لگائے بات چیت سننے لگا۔ اس کے بابو جی انگریزی میں بول رہے تھے۔

''نہیں تو میں اوپر والے کمرے میں تھا،......ہوں......اوہ......''

''......''

It is all right

''......''

''شاید میرا بڑا بیٹا ہوگا۔......ہاں، وہ گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ ابھی کچھ مہینوں سے یہاں آیا ہے۔......ہاں......''

''......''

''اور کوئی بڑا نہیں ہے۔''

''......''

''ٹھیک ہے، میں سنبھال لوں گا......او کے۔''

''......''

''۹.۳۰......یس......او کے......''

''......''

''Do not worry''

"۔۔۔"

"What are you talking?"

"۔۔۔"

"بائی۔"

بات چیت ختم ہونے سے پہلے وینو چپکے سے اپنے کمرے سے کھسک گیا۔

اس واقعے کے بعد آج تک وینو نے بابو جی سے آنکھ نہیں ملائی، ایک ہی چھت کے نیچے رہنے پر بھی بڑی چالاکی سے وہ ان سے روبرو ہونے سے بچتا رہا۔

کچھ دن پہلے جب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اوپر بابو جی کے نجی کمرے میں گھسا، اپنے شک کو مضبوط کرنے کے لئے اسے کچھ ٹھوس ثبوتوں کی ضرورت پڑ رہی تھی، نقلی چابیاں لگا کر وینو نے ان کی میز الماری وغیرہ کھول کر ٹٹولا۔ یوں چور کی طرح کام کرتے ہوئے اس کے دل میں شرمندگی کا احساس نہیں ہوا۔ اس سے بھی زیاد ذلت آمیز ثبوت جو اس کمرے میں مل رہے تھے۔ اس لئے اسے اپنا کام غلط نہیں لگا۔

'مجھے کس لئے ڈرنا ہے؟ غلطی کرنے والے بابو جی کو دیکھ کر مجھے کیوں چھپنا چاہئے ؟...... مجھے صحیح ڈھنگ سے ان کے سامنے یہ بات رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی غلطی کا احساس کریں اور اپنا برتاؤن سدھارلیں۔ یہ میرا فرض ہے...... اس کے بارے میں ان سے کہاں بات کی جائے؟ گھر میں بیٹھ کر باتیں کریں گے تو ماں کو پتہ چل جائے۔'

'گھر کے باہر کسی جگہ پر ملاقات کر کے بات کرنی ہوگی، اگر وہ میری بات نہ مانیں تو؟ اس کے بارے میں بعد میں سوچ لیں گے۔ پہلے اس موضوع پر ان سے دوٹوک بات کر لینی چاہئے...... '

اس طرح کئی دنوں تک من ہی من غور وخوض کے بعد وہ کل ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

'جیسے بھی ہو کل بابو جی سے سیدھے بات کر لینی چاہئے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ کیا میں بچہ ہوں؟ I am an adult'

سمندر سے ملحق اندر کی سڑک پر سندرم نے اپنی موریس مائنر گاڑی روک دی۔ کار میں اس کے ساتھ بیٹھا وینو دروازہ کھول کر پہلے اترا۔ اس کی نگاہ دور پر گرج رہے سمندر پر ٹکی تھی ہوا میں لہرا رہی لنگی کو تہہ کر کے باندھتے ہوئے وہ ذرا دور سمندری ریت پر چل کر کھڑا رہا۔ پچھلے دس

منٹ سے وہ عجیب طرح کی الجھن میں گرفتار تھا۔ بات کیسے چھیڑی جائے؟ بھلے ہی بابو جی سے کوئی گرم بحث ہوئی ہو۔ بیٹا ہونے کے ناطے اس کے منھ سے کوئی نازیبا بات نہیں نکلنی چاہئے۔ یہ خوف بھی اس کے دل پر چھایا ہوا تھا۔

کار سے اترے سندرم نے اپنے کوٹ کو تہہ کر کے پچھلی سیٹ پر ڈال کر کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دئے، پھر گاڑی بند کر کے اس کے پاس چلے آئے۔ پاس میں کھڑے ہو کر کلائی کی گھڑی میں جیسے اپنے سے ذرا اونچی آواز میں بولے۔ ''ابھی پانچ ہی بج رہے ہیں۔''

''تبھی تو سمندر کا کنارا خالی ہے۔'' وینو بھی پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ سمندر کے کنارے کی ریت پر ابھی سایا نہیں پھیلا تھا۔

ریت پر چپ چاپ قدم بڑھاتے ہوئے سمندر کی طرف چلتے ہوئے وہ دونوں باپ بیٹے نہیں لگ رہے تھے۔ ناک نقشے میں یکسانیت ضرور تھی دیکھنے میں بڑے چھوٹے بھائی یا استاد شاگرد لگ رہے تھے۔ قد میں باپ جتنا ہی لمبا ہونے پر بھی اس کا اپنا اکہرا جسم ہونے کی وجہ سے وہ بابو جی کے مقابلے میں لمبا دکھائی پڑ رہا تھا۔

سر جھکائے ہوئے چلتے ہوئے اس کی نگاہ ریت میں دھنس دھنس کر نکل رہے اپنے پاؤں پر ٹکی تھی۔ دل کا بوجھ لمحہ لمحہ بڑھ رہا ہے۔ سینے کے اندر موجزن غصہ گلے میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے۔

دور سے آتی ہوئی لہروں کو گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں کے کناروں پر سرخی چھا رہی ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے پلکوں کے کناروں پر آنسو چھلک رہے ہیں۔

باپ نے اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ جب وینو نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو وہ اسے خاموش کرنے کے انداز میں مسکرائے۔ وینو کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔

''کیوں یہیں بیٹھ لیں؟'' انھوں نے پوچھا۔

کوئی جواب دئے بغیر وہ بیٹھ گیا۔

''کیس شروع کیا جائے؟''

وہ باپ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا اور پھر ریت پر الٹی سیدھی ریکھائیں کھینچتا رہا۔

وہ جس موضوع پر ان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ سندرم کو اس کی بھنک پڑ گئی ہوگی۔ ٹیلی فون والے ماجرا کے بعد پورا ایک ہفتہ گزر گیا اس دوران اس سے ایک بار بھی نظر ملانے

کا موقع ہی نہیں آیا۔

یہ ان کے علم میں بھی تھا۔ انھوں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اس واقعہ سے متاثر ہونے کے باوجود بالغ ہونے کی وجہ سے تہذیب کے ناطے وہ مجھ سے روبرو ہونے سے بچ رہا ہے۔

لیکن آج وہ اس واقعہ کے بارے میں ان سے سیدھی بات کرنے کی تیاری کے ساتھ آیا ہے۔ یہ بات انہیں دل چسپ نہیں لگ رہی تھی پھر بھی اس ملاقات کو ٹالنے کی کوشش بزدلی مانی جائے گی۔ یہی سوچ کر آج اس کے سامنے آئے ہیں۔

پھر بھی وہ خود پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

وینو دھیرے سے کچھ بدبدانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ '' I am sorry واقعی یہ بہت ہی شرم ناک اور بے عزتی کی بات ہے'' یوں انگریزی میں بولنے کے بعد وہ باپ سے مخاطب ہوا۔ '' آپ کو کچھ پتہ ہے کہ میں کس موضوع پر بول رہا ہوں؟'' ذرا بھی بے چین ہوئے بغیر انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

باپ کا یہ انداز دیکھ کر وینو کا غصہ بھڑک اٹھا۔ '' میں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ آپ ایسے گھٹیا انسان ہوں گے'' بے حد جذبات کی شدت سے تن رہے اپنے ہاتھوں کو اس نے زور سے دبا کر ٹھیک کرلیا۔ ہوا میں اس کے بال بکھر رہے تھے۔ دل میں امنڈتے جذبات کو شدت سے ضبط کرنے کی کوشش میں وہ لگ بھگ ہانپ رہا تھا۔

'' وینو! Dont be silly' کیا تم کوئی چھوٹے بچے ہو؟ — اطمینان سے سوچو'' کہتے ہوئے سندرم نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

'' یس۔ یس۔ آئی ایم این ایڈلٹ'' دانت بھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر انگریزی میں اپنی بات جاری رکھی، شاید اس نے یہی سوچا ہوگا کہ کوئی باپ بیٹے غیر ملکی زبان میں ہی اس طرح کی باتوں پر بحث کر سکتے ہیں۔

'' کیا آپ کو نیلی فون کا وہ واقعہ یاد ہے، اس دن سے میں آپ پر نظر رکھتا آرہا ہوں — میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے باپ اس قدر عورتوں میں دلچسپی لینے والے ہوں گے۔ کیا یہ ہمارے خاندان سے جڑا ہوا مسئلہ نہیں ہے۔ کیا یہ آپ کی عمر اور رتبے کے مطابق ہے — یہ جو ماں ہے، بالکل بدھو ہے، بے حد سیدھی سادی کیا ان کے ساتھ زندگی بھر بے وفائی کا کھیل کھیلتے آئے ہیں۔

وینو بولتا جا رہا تھا اور وہ اس کی بات میں دخل دیئے بغیر سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔

لیکن اب اسے ٹوکتے ہوئے بولے۔ ''پلیز اس معاملے میں اپنی ماں کو بیچ میں نہ لاؤ۔ میں تمھارے خیال کو، چاہے وہ کتنا ہی ٹھیک اور تہذیب کی کسوٹی پر کھرے نہ اترتے ہوں، چپ چاپ سننے کو تیار ہوں...... لیکن اس مسئلے میں اپنی ماں کو بیچ میں نہ لاؤ کیونکہ تمھارے مقابلے میں میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں، تم مجھے جتنا جانتے ہو اس سے زیادہ وہ مجھے جانتی ہے۔ ہم پچیس سال سے ازدواجی زندگی جی رہے ہیں، اسی طرح آخری وقت تک نبھاتے رہیں گے اچھا، اب اپنی بات جاری رکھ سکتے ہو۔''

''آپ ماں کے ساتھ بے وفائی کرتے ہوئے ایک نقلی زندگی گزار رہے ہیں لیکن مجھے دھوکا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔''

''تمھیں دھوکا دینے کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔'' وہ مسکرانے لگے۔

''محض اس ٹیلی فون کے واقعے کی بنا پر میں آپ کے بارے میں اس فیصلے پر نہیں پہونچا ہوں۔ دوبارہ گھنٹی بجنے کے بعد آپ نے اس سے بات کی تھی نا، وہ بات چیت میں نے چھپ کر سنی تھی۔ اس کے بعد رات کو نو بجے کے بعد آپ گاڑی لے کر نکلے تھے۔ آپ دونوں کو میں نے سنیما ہال میں بھی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تھا لیکن اسی بنیاد پر کسی پر شک کیا جا سکتا ہے۔؟ آپ کے محبت بھرے خطوط کا پورا ایک پلندہ ہے اس میں ایک خط ..... یہ لیجئے۔''

غصے سے کانپ رہے وینو نے کاغذ نکال کر کے سامنے پھینکا......

پھر اس نے دوسری طرف رخ کر لیا۔ آنکھیں چھلچھلا آئی تھیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

سمندر کے کنارے کی لمبی سڑک پر نیلی بتیاں جلنے لگیں۔ اجلی ریت کے پھیلاؤ میں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ چار پانچ لوگوں کا جھنڈ ان کی طرف آ رہا تھا اس جھنڈ کے نکل جانے تک دونوں نے چپی سادھ لی۔ پھر وینو نے ہی بات جاری رکھی۔ ''آپ میرے باپ ہیں جنھوں نے مجھے پیدا کیا۔ آپ کے سامنے ایسی بات کرنے کی نوبت جو آئی ہے اس کا مجھے بے حد افسوس ہے ..... کم سے کم آئندہ اپنے کردار کو سدھار لیں تو اچھا ہوگا..... اسی لئے میں یہ سب بول رہا ہوں۔''

اس کے آگے کچھ نہیں بولنے کا سوجھا تو وہ چپ ہو گیا۔ سندرم خاموشی کے ساتھ لمبی سانس لیتے ہوئے آسمان کو تاک رہے تھے......'اس معاملے میں اپنے بیٹے سے کیا بولنا ہے۔ اس کے مقابلے اس سے کیا نہیں بولنا چاہئے، ان کا دھیان شاید اس پر مرکوز رہا ہو۔'

اس نے اچانک ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''دادا جی نے کہا ہے کہ آپ دونوں نے محبت کی شادی کی ہے۔ بتائیے ایسی تجارتی محبت آخر کس انجام پر پہنچتی ہے؟'' طنز اور نفرت سے سوال کرنے کے بعد وہ ان کے چہرے کو گھور کر دیکھنے لگا۔

سندرم سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے، پھر گہری سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر وینو کی طرف تاکا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید وہ اسے کوئی بات صاف گوئی سے سمجھانا چاہتے ہیں پھر دل میں یہی خیال آیا ہوگا۔ عمر الگ ہے اور تجربے الگ اس سے حاصل ہونے والی ذہنی بلوغت اور ہوتی ہے۔ اس لئے اس موضوع کو چھوڑ کر کسی اور بات کی طرف مڑ گئے۔ ''اچھا یہ بتاؤ! ان سب میں تمھیں اضطرابی کیفیت میں ڈالنے والی بات کون سی ہے؟''

ان کا یہ سوال سن کر وینو کے دل میں ایک طرف ان کے لئے غصہ آیا تو دوسری طرف ان پر ترس بھی کہ یہ آدمی ہے کہ پائجامہ؟ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔ ''بابو جی آپ ایک پروفیسر ہیں۔ ایک عزت دار گھرانے میں آپ کی پیدائش ہوئی ہے۔ چار بچوں کے باپ ہیں۔ اس عمر میں اس طرح لفنگا پن کیا آپ کو زیب دیتا ہے؟۔ اس سے آپ کی خاندانی شان کے ساتھ معاشرتی وقار مٹی میں مل رہا ہے۔ اس پر آپ اپنے بالغ بیٹے کی فکر کو غلط بتا رہے ہیں۔ کیا آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ اس معاملے سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے؟''

جب وہ روانی سے بول رہا تھا تو وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے منھ پر ایک طرف روشنی اور دوسری طرف اندھیرا چھائے رہنے کے باوجود ان کی تیز نگاہوں کو جھیلنے میں ناکام ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں، اس پر بھی انھوں نے غور کیا۔

''وینو! تم بالغ ہونے کا دعوی کر رہے ہو۔ یہ سچ بھی ہے لیکن ایک بالغ انسان کے اندر بلوغیت کی جو پختگی ہونی چاہئے۔ تم میں اس کی کمی نظر آ رہی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایک باپ ہونے کے ناطے اپنے نجی معاملوں، ذاتی معاملوں کو تمھارے ساتھ بانٹ لینا ضروری ہے، ایسا میں نہیں سمجھتا۔ میرے خاندانی شرافت اور معاشرتی وقار پر تم اپنی فکر ظاہر کر رہے ہو، یہ اچھی بات ہے۔ میرے وقار اور میری شرافت پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ اپنے وقار اور اپنی شرافت کی تم سے زیادہ مجھے پرواہ ہے۔ اس پر بٹہ لگنے کی نوبت آنے پر اس حالت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے شرافت اور شان کی حفاظت کرنے کی طاقت میرے اندر برقرار ہے اسے تمھارے سامنے ثابت کرنے کے لئے میں مجبور نہیں ہوں، کیوں ثابت کروں؟''

ان کے لہجے میں مضبوطی اور سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ ہڑبڑی یا احساس گناہ کے بغیر جس ڈھنگ سے وہ بولتے جارہے تھے اسے دیکھ کر وینو کو اندر ہی اندر خوف سا لگ رہا تھا کہ شاید اسی سے کچھ خطا ہوگئی ہو۔ اتنی عمر کے بعد بھی ایک لڑکی سے رشتہ رکھنے کے باوجود وہ کتنی ہمت کے ساتھ اپنی قوت گویائی سے مجھے ہرانا چاہتے ہیں دل میں ایسا خیال آتے ہی اس کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔

''آپ یہی پوچھ رہے ہیں کہ میرے سامنے کیوں ثابت کرنا ہے، سن لیجئے، اس لئے کہ میں آپ کی بیوی کا بیٹا ہوں، آپ ان کے ساتھ بے وفائی کرر ہے ہیں۔'' دانت بھینچتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہوں ...... کیا اس نے میرے بارے میں تم سے شکایت کی؟'' انھوں نے بڑے سکون سے پوچھا۔

''نا ...... !''

''پھر کیوں میری ازدواجی زندگی میں زبردستی دخل دے رہے ہو؟''

''I am your son، میں آپ کا بیٹا ہوں، یہ میرا فرض بنتا ہے۔''

''No sonny یہ تمھارا فرض نہیں ہے۔ اس میں دخل اندازی کرنے کا کوئی حق کسی بیٹے کو نہیں ہے بیٹے!''

''وینو نے ہونٹ بھینچ لئے، اسے رونا آ گیا۔ اس کے دل میں آرہا تھا۔ اسی موقع پر ان پرتابڑ توڑ گالی برسانے کے بعد ہمیشہ کے لئے ان سے اپنا رشتہ توڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔

''وینو کی تڑپ اور ذہنی انتشار کو دیکھ کر سندرم کو دکھ ہو رہا تھا۔ اپنے سے سروکار نہ رکھنے والے اور اپنی قوت صبر سے ماضی کے موضوعات کی پرواہ کئے بغیر انھیں پرے ہٹانے میں ناکامیاب ہوکر اس کا جوان دل بری طرح سے بلک رہا ہے۔ اس نرم جذبے کے ساتھ انھوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''...... وینو ......''

روٹھے ہوئے بچے کی طرح اس نے ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ اب وہ لگ بھگ رونے لگ گیا تھا۔ بیحد نمکین لہجے میں اس نے پوچھا۔ ''بابو! یہ بات مجھے بہت ذلت آمیز لگ رہی ہے کیا آپ کا ایسا برتاؤ ٹھیک ہے؟''

وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگے۔

'' My boy بالغ ہونے کا دعویٰ کرنے والا تمھارا سوال ٹھیک ہے کیا؟ تمھارے دل کی الجھن کو میں سمجھ رہا ہوں۔ میرا برتاؤ غلط لگتا ہے تو اسے اپنے دل میں دبا کر رکھو۔ وقت کے ساتھ دھیرے دھیرے تمھیں اپنے آپ صحیح غلط کی سمجھ آجائے گی ''

''—— تب پتہ چلے گا کون سی بات کس حد تک صحیح ہے یا غلط، ایک شفیق باپ ہونے کے ناطے میں تمھاری کرتوتوں کو معاف کر دیتا ہوں، سوچ کر دیکھو —— باپ کے ذاتی معاملے کا پتہ لگانے کے لئے بیٹے کا ان کی جاسوسی کرنا، ان کی ذاتیات میں دخل دینا نہایت بے عزتی کی بات ہے نا۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس کرتوت کے لئے زندگی بھر شرمندہ رہتا —— ''

وہ جو کہہ رہے تھے کہ انھوں نے اسے معاف کر دیا اور زندگی بھر اسے شرمندہ رہنا ہوگا، یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن وہ اتنا سمجھ گیا کہ بات کو آگے جاری رکھتے ہوئے ان کو سدھارنا، یا ان سے اپنی غلطی منوانا اس کے بس سے باہر کی بات ہے۔

☆

''ماں!''

چاروں بچوں میں رمنی کو ماں' اور سندرم کو' پتاجی'' کہہ کر پکارنے والا صرف وینو تھا۔ باقی بچوں کے لئے وہ ممی اور ڈیڈی تھے۔ اوپری منزل کے برآمدے میں کھڑے ہو کر وینو نے 'ماں' کہہ کر اسے پکارا اور اس وقت رمنی اماں آرام کرسی پر لیٹے لیٹے جولیس ہکسلے کی کتاب کے صفحوں کو دھیرے دھیرے پلٹ رہی تھی۔

وینو نے اس کتاب کے کور پیج پر غور کرتے ہوئے دل ہی دل میں اس کا نام پڑھ لیا Knowledge , Maorality and Destiny

''ماں! کیا میں آپ کی پڑھائی میں خلل پیدا کر رہا ہوں۔؟''

''چھی چھی! یہ بھی کیسی فارمیلیٹی ہے؟ آجاؤ.... ادھر بیٹھو...''

رمنی نے شفقت کے ساتھ اسے اپنے پاس بلایا۔

وینو برآمدے میں پڑی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا بولا جائے۔ رمنی کو اچانک یہ احساس ہوا کہ میں اتنے بڑے کی ماں ہوں.... اسی خوشی اور محبت کے ساتھ وہ اسے نہارتی رہی۔ وینو اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو ہاتھ سے نوچتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

''بیٹا اتنے دنوں کے بعد اپنے دل کو تکلیف پہنچا رہا ہے کسی مسئلے پر بحث کرنے یا سجھاؤ مانگنے کے لئے میرے پاس آیا ہے۔اس خیال سے ماں کا دل جوش وخروش سے بھرا تھا۔

پھر بھی اسے کچھ جھجکتے دیکھ کر منی نے بات شروع کر دی۔'' کیوں وینو! کیا یہاں کی لائف تمھیں بور لگ رہی ہے؟''

''بور ہونے کی بات نہیں ہے ماں.... مجھے یہ لائف پسند نہیں آتی.....کچھ بھی ہو میں زرا دیہاتی ٹائپ ہوں نا....؟ آپ لوگ شہری تہذیب میں بڑے تکلف کے ساتھ الٹرا موڈرن زندگی بسر کر رہے ہیں۔ان کے ساتھ تال میل بیٹھانا میرے بس کی بات نہیں ہے.....''

اتنا کہنے کے بعد وینو سر جھکا کر انگلیوں سے کچھ کریدنے لگا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد منی اماں نے کہا۔''تمھارے دل کی الجھن کو میں صحیح صحیح سمجھ نہیں پا رہی ہوں بیٹے.....میرے خیال میں ہم لوگ وہی زندگی جی رہے ہیں جسے اتنے سالوں سے جیتے آئے ہیں۔.....تمھارے دل میں جو بات کھٹک رہی ہے، اسے صاف صاف بتاؤ تبھی تو میں سمجھ سکتی ہوں.......''اس کے دل میں چھپی بات کو تاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے ماں نے کہا۔

مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں یہاں آ گیا ہوں....ایسا لگ رہا ہے کہ میں پرائے گھر میں رہ رہا ہوں...یہاں کے رہن سہن اور طور طریقے مجھے بڑے عجیب لگ رہے ہیں.....تم لوگوں کے آپسی رشتے اور محبت سب کچھ باہری دکھاوا لگ رہا ہے۔آپ لوگ سچ مچ نقلی اور جھوٹی زندگی جی رہے ہیں....میں سوچ رہا ہوں کہ پھر سے دادا جی کے یہاں لوٹ چلوں....''وہ رک رک کر صاف گوئی سے جو بول رہا تھا، ماں غور سے سن رہی تھی۔

پھر تھوڑی دیر تک دونوں چپ رہے۔دوپہر ہونے کو تھی۔دن کے گیارہ بج چکے تھے اس لئے گھر میں سناٹا تھا۔نیچے رسوئی بنانے والی اماں بھی سو رہی تھی۔گھر اور باہر کی سڑک تک ایک عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

''وینو!...... یہ بات تمھارے سامنے اب اچانک ایک بڑے مسئلے کی شکل میں کیسے کھڑی ہوگئی؟.....دادا جی کے یہاں کے معیار زندگی اور یہاں کے ماحول میں بیچ میں بھاری فرق کا ہونا ممکن ہے۔اسے میں بھی سمجھ پا رہی ہوں لیکن تمھاری عمر کے لحاظ سے تمھیں وہاں کی ہی زندگی تو بور لگنا چاہئے!...ٹھیک ہے، اپنے ماحول کے طور طریقوں اور عادتوں کے مطابق ہی انسان کی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں۔پھر بھی یہی تو تمھارا اپنا گھر ہے۔یہاں تمھیں اپنی پسند کے مطابق جینے

کا پورا حق ہے۔ اس پر کوئی آدمی روک لگا رہا ہے؟'' یہاں بھلے ہی کچھ باتوں میں کمی بیشی رہے لیکن دوسروں کی آزادی میں دخل دینے یا اپنا حق جتانے کی عادت یہاں کسی آدمی میں نہیں ہے۔ شاید تمھیں یاد ہو یا نہ ہو تمھارے دادا دادی جب یہاں آئے تھے تو تم ان کے ساتھ گاؤں چلنے کی ضد پر اڑ گئے...... ان کے دل میں بھی تمھیں اپنے یہاں لے جا کر پالنے پوسنے کی چاہ تھی..... لیکن صرف تمھاری خواہش کو اہمیت دیتے ہوئے میں نے پورے من سے تمھیں ان کے پاس بھیجا تھا..... میرا مطلب ہے کہ اس گھر میں بچوں کی آزادی کو بھی اتنا ہی ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے ایسے میں اپنی خواہش اور پسند کے مطابق تمھیں یہاں رہنے میں کون سی اڑچن ہے؟...... ''ہوں، بولو ونو'' کہتی ہوئی ماں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ونو خالی خالی نگاہوں سے ماں کو گھورنے لگا۔

''اس لئے مجھے لگتا ہے تم گاؤں لوٹنا چاہتے ہو تو اس کے پیچھے کوئی دوسری وجہ ہوگی کیوں ٹھیک ہے نا؟'' ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ممی نے پوچھا۔

''ہاں دوسری وجہ ہے '' کہتے ہوئے اپنے من میں کھلا رہے اپنے باپ سے متعلق سچائیوں کو بتانے کے لئے موزوں الفاظ کے استعمال کے لئے ونو بے چین ہو گیا۔

''ونو! اس کے علاوہ تم نہ جانے کی کیا کیا بتا رہے تھے اس زندگی کو باہری دکھاوا جھوٹا کہہ رہے ہو۔ کیا بات ہے بیٹے؟ ہمارے بارے میں جلد بازی میں اس طرح کے کسی فیصلے پر کیسے آئے؟ تم کس چیز کو باہری دکھاوا سمجھ رہے ہو؟ ونو!... تم کس کے بارے میں بول رہے ہو، ایسا لگتا ہے تمھارے دل میں کوئی گہرا زخم ہے۔ اسی لئے تم ایسے لفظوں کا استعمال کر رہے ہو..... بتاؤ نا کیا ہوا؟''

ونو نے جیب سے اپنا رومال نکال کر ناک اور آنکھوں کو اس طرح دبا کر پونچھا کہ چہرہ ایک دم لال ہو گیا۔ چہرے پر الجھن کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''ماں! مجھے بابوجی کا چال چلن بالکل پسند نہیں ہے '' منھ موڑ کر آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بولا۔

ماں کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اسی سے ہمت پاتے ہوئے ان کے چہرے کو دیکھے بغیر اس نے بات جاری رکھی۔ ''میں اتنے دنوں سے اسی الجھن میں تھا کہ اس سے تمھارے اور بابوجی کے بیچ میں من مٹاو ہوا اور میری وجہ سے اس گھر کا سکون درہم برہم ہو جائے گا لیکن گھر کر ٹوٹ رہے اس گھر کے سکون کو درہم برہم ہونے سے کتنے دن تک بچایا جا سکتا ہے

؟....... بابو جی تمھارے ساتھ فریب کر رہے ہیں ماں! اس کی جانکاری ملنے کے بعد بھی اگر میں تمھیں بتائے بغیر چھپاؤں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں بھی اسی فریب کا حصہ دار ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے اس ذلت آمیز ماحول میں رہنا پسند نہیں ہے۔ انھیں سدھارنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ہو سکے تو تم اسے صحیح راستے پر لے آؤ۔ یہ تم لوگوں کا معاملہ ہے، میں چل رہا ہوں۔''

اس طرح جذباتی لہجے میں بولنے کے بعد اس کے آگے ماں کا چہرہ دیکھنے سے کتراتا سا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا دل طرح طرح کے شکوک سے بھر اٹھا۔

''میری باتیں سن کر ماں شاید رو پڑے گی۔ روتے روتے ان کے بارے میں کرید کرید کر اور باتیں پوچھے گی یا ناراض ہو کر شوہر کو کوسے گی۔ نہیں تو اتنے دنوں سے جس بات کو لے کر من ہی من کڑھ رہی تھی۔ وہ راز آج بیٹے کی جانکاری میں آ گیا، اس اس بے عزتی سے ان کا دل دہل اٹھے گا۔' ان ممکنات کا تصور کرتے ہوئے وہ مجرم کی طرح اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

''وینو!'' خاموش لیکن جذبات کی شدت سے بھاری ماں کے لہجے نے اسے روکا۔

وینو نے مڑ کر دیکھا۔ چہرے پر کسی طرح کے منفی تاثرات نہیں تھے بلکہ شفقت آمیز مسکراہٹ لہرا رہی تھی۔ انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو کرسی سے اٹھا وینو پھر بیٹھ گیا۔

''ارے میں نے سوچا تھا کہ اپنی زندگی سے جڑے کسی مسئلے کے بارے میں مجھ سے ذکر کرنے والے ہو، آخر وہ تمھارے باپ سے متعلق سروکار رکھنے والا مسئلہ نکلا ...... یہ بھی خوب رہا!'' وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگی۔

''تو یہ معاملہ آپ کو پہلے سے معلوم ہے کیا؟'' وینو بدبدایا۔

''میں ایسی باتوں کے بارے میں کچھ بھی جاننا نہیں چاہتی، وینو'' وہ گہری فکر کے ساتھ بولی ''دیکھو بیٹے وہ تمھارے باپ ہیں یہ سچ ہے۔ وہ میرے شوہر ہیں، یہ جتنا سچ ہے اتنا ہی سچ یہ بھی ہے کہ وہ ایک پروفیسر ہیں، وہ ایک دانشور ہیں اور سماجی مقام رکھنے والے ہیں...... ہیں نا؟......''

وینو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماں آگے بولتی گئی۔ ''تم جن باتوں کے لئے اپنے باپ پر فخر کر سکتے ہو ان سب کو چھوڑ کر، جن چیزوں کے بارے میں تمھیں پوری جانکاری نہیں ہے جو بہت ہی نجی اور ذاتی معاملے ہیں انھیں کرید کرید کر دکھی ہوتے ہو اور ذلت کا احساس کرتے ہو، کیا تمھیں یہ صحیح لگتا ہے؟''

وینو فوراً ابل پڑا۔ ''پوری طرح سے جاننے کے بعد ہی بول رہا ہوں ماں۔ I have

proofs میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔ اس دن انھیں ایک فون آیا تھا۔ وہ جو بول رہے تھے میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ اس دن رات کو صرف اسی مقصد سے سنیما ہال چل کر ان آنکھوں سے دیکھا..... ان کے کمرے میں جو دراز ہے، ان کے نام آئے محبت بھرے خطوں کی ایک پوری فائل ہے۔ اس میں سے ایک کاغذ نکال کر جب میں نے ان کے منھ پر پھینکا تھا، وہ کہاں انکار کر پائے؟''

''اف It is a shame on you کیا کہا؟ Proof ہیں؟ وہ باعزت اور شہرت یافتہ لوگوں کے بارے میں افواہ اڑانے کو ہی دھندہ بنانے والی افواہ ساز رسالے ہیں نا، ان کے پاس بھی اس طرح کے ہوں گے۔ ایسے Proof نہیں ہوں تو وہ افواہ ساز رسالے کیسے کہلائے گی۔ شریف لوگ ایسے رسالوں کو خارج کر دیتے ہیں۔ کسی فرد کی اہمیت اور صلاحیت وغیرہ کو چھوڑ کر اس کی ذاتی کمزوریاں کا ڈھنڈورا پیٹنے کو ہی ایسے رسالے اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے معاشرے اور تہذیب کو نقصان ہوتا ہے۔ فائدہ ذرا بھی نہیں۔ اسی لئے تو ہم افواہ ساز رسالوں کو منافرت سے دیکھتے ہیں ابھی تم نے جاسوسی کا جو کام کیا ہے وہ افواہ ساز رسالے والوں کے کام سے کیسے الگ ہے، بولو! انھیں کی طرح تم بھی کہتے ہو میرے پاس Proof ہیں۔ وینو تمھیں لے کر میں دکھی ہوں۔ It is shame on you'' رتنی اماں نے اپنے دونوں کان بند کر لئے۔ ''کیا تم نے سچ مچ یہ سب کام کیا، وینو اتنے بڑے انسان کے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت۔'' وہ کانپ اٹھی۔

''یہ کیسی عورت ہے! یہ کیسی بیوی ہے!'' ماں کو سمجھنے میں ناکام وینو جھینپ سا گیا۔

''ماں! تمھاری بھلائی کے لئے بھی غلط جانتے ہوئے مجھے ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا پڑا۔'' ماں کا رخ سمجھتے ہوئے اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔ ''وینو مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے، انھیں لے کر نہیں تمھیں دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے تم نے ایسا برتاؤ کیا، باپ کے تئیں بیٹا ہائے! میں تصور تک نہیں کر پا رہی ہوں، وینو!''

''یہ جان کر بھی وہ تمھارے ساتھ فریب کر رہے ہیں۔''

"It is my problem" وہ بیچ میں ٹوک کر چلا اٹھی ''وہ میرا اپنا معاملہ ہے، بولو، تمھیں ہمارے ازدواجی معاملے میں دخل دینے کا کیا اختیار ہے۔'' پھر سمجھانے لگیں۔ ''ہم پچیس سال خاموشی سے جیے ہیں، آخر تک اسی طرح جئیں گے۔ اسی لئے اس سکون اور اطمینان میں رکاوٹ ڈالنے والے کسی بھی معاملے میں، میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتی..... میں بھی اس کے

بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہوں ..... کیا فرق پڑتا ہے، یہ بات طے ہے کہ ان کے لئے میرے مقابلے میں پرنسلر سا تھن کوئی نہیں ہوسکتی ہے۔ تم نے جس بات کا ذکر کیا اسے لے کر میرے من کے اندر گہرا دکھ ضرور ہے۔'' کہتے کہتے دبا کر رکھنے پر بھی بے قابو ہوکر دل کی تہ میں چٹان کی طرح جمع ہوا وہ درد پگھل اٹھا ..... آنکھوں میں لڑی بن کر امنڈ رہے آنسوؤں کی دھارا کو چشمہ اتار کر پونچھتی ہوئی وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ برآمدے میں کچھ لمحے کھڑی رہ کر اس نے اپنے کو نارمل کر لیا اور پھر بیٹے کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

''وینو! جیسا تم سمجھتے ہو، زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ وہ بہت پیچیدہ ہے، الجھن بھری ہے۔ وینو! ان پیچیدگی اور الجھنوں کے باوجود گھر کو کیسے سکون اور اطمینان سے چلایا جائے، یہی جینے کا فن ہے ..... عذر اور قوت برداشت کی کمی میں شفقت اور محبت کے کوئی معنی نہیں ہے۔ اگر میں نے تمھاری طرح برتاؤ کیا ہوتا تو میں ہی اس گھر کے سکون اور ان کے وقار کو تہس نہس کرنے کی وجہ بن جاتی۔ اپنے posissivness مثبت رویوں کی وجہ سے ..... انھیں اپنے قابو میں رکھنے کی للک سے اس گھر کے سکون، ان کے وقار اور اپنے بچوں کے مستقبل کو قیمت کی شکل میں چکانے کی حد تک میرا خود غرض ہونا کتنا تحقیر آمیز ہے۔ میری ان باتوں سے تم یہ مت سوچنا کہ میں کسی بھاری دکھ کو من میں رکھتے ہوئے جی رہی ہوں۔ لیکن میرے من میں دکھ ذرہ برابر نہ ہو، ایسی بات بھی نہیں ہے۔ زندگی میں پورا سکھ کس کو ملا ہے۔''

''وینو! سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں بولنے کا حق ہے یا نہیں ..... اس کا کیا نتیجہ ہوگا یہ بھی سوچنا ہے، ہم کسی کی عزت کرتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟ ان کے ذاتیات کو اور ان کی Privacy کو جاننے کی کوشش کئے بغیر رہنا ہے۔ کسی سے محبت کرنے کا مطلب ہے ان کی کسی ذاتی کمزوری کی جانکاری ہونے پر بھی ان کی دوسری صلاحیتوں اور اہمیت پر بٹہ لگائے بغیر یہ مان لینا ہے کہ ان کی شخصیت میں وہ کمزوری بھی شامل ہے۔''

''اوہ! کسی کی ذاتیات کتنی پاکیزہ ہوتی ہے۔'' It is something secret Veenu! اس میں کسی دوسرے کا گھسنا جنگلی پن ہے ..... حیوانیت ہے ..... ہر فرد کی اپنی ذاتیات ہوتی ہے۔ اس کی عزت کرنی چاہئے، اس کی عزت کرنی چاہئے وینو۔ جس انسان کی ہم عزت کرتے ہیں، ان کی ذاتیات کو خاص اہمیت دینی چاہئے۔ تم نے اپنے باپ کے بارے میں کیا سمجھ رکھا ہے۔ وہ بڑے Strong man ہیں۔ اسے برداشت کرنے کی طاقت ان کے اندر ہے ..... وہ

یہی نہیں ، وہ اپنی کمزوریوں کو بھی لانگھ کر آئیں گے ...... زندگی بڑی پیچیدہ ہوتی ہے وینو، زندگی کو سمجھنا ضروری ہے، اس کتاب کو پڑھ کر دیکھو..... اسے پڑھنے سے تمھارے اندر نئی فکر اور سوچ پیدا ہوگی، نظریہ بدل جائے گا۔''

وینو الجھن میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا لیکن اس لمحے میں بھی دادا دادی مثالی میاں بیوی کے روپ میں ابھرے۔

کچھ دنوں کے بعد ایک شام کالج سے لوٹ کر سندرم کپڑے بدل رہے تھے، اس وقت رُمنی اماں نے ان کے ہاتھ میں ایک خط لا کر دیا۔ دو دن پہلے کسی کو بتائے بغیر گھر چھوڑ کر نکلے وینو کا خط تھا۔ خط کی آخری دو سطریں یہ تھیں۔

''میں صرف دادا جی کا پوتا بن کر رہنے کے قابل ہوں۔ آپ لوگوں کی زندگی کے فلسفے کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے اگر مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہو تو اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ ''...... وینو۔

خط پڑھنے کے بعد دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ '' ستر سال کے لوگ ہی دقیانوسی ہوں گے، یہ ضروری ہے..... بیس سال میں بھی ہو سکتے ہیں۔''۔ سندرم ہنستے ہوئے بولے۔

رُمنی اماں تھوڑی دیر انھیں آنکھیں پھاڑ دیکھتی ہیں۔ ان آنکھوں میں ایک نا قابل بیان کرب چھایا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں چھلچھلا آئیں۔

اپنے دل کی تہہ میں دبے گہرے دکھ کو مسکراہٹ کی شکل میں کھلاتی ہوئی اس نے پوچھا۔

''ارے یہ کیا ..... اب بھی آپ ..... آپ .....!''

ادھر رُمنی کے پھڑکتے ہونٹوں پر اپنے گال لگاتے ہوئے سندرم اسے بازوؤں میں کس رہے تھے۔

.........اس کے بعد جو بھی ہوا وہ ان دونوں کا ذاتی معاملہ تھا

☆☆☆

تیلگو کہانی

روشنی کی تلاش میں

اولگا

میں نے ایسی کون سی غلطی کردی ہے، یہ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ جو کچھ اب تک ہوا ہے، اسے اگر میں کچھ حد تک ٹھیک کر سکتی یا کچھ بدل سکتی تو آج مجھے اتنا غصہ نہیں آتا۔ جب میرے شوہر ایسی ہی مصیبت میں تھے، تو میں نے ان کی کتنی مدد کی، کتنی ہمت بڑھائی تھی۔

اس دن ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ گذشتہ اس سال کی کھٹی میٹھی باتوں کو یاد کرتی ہوئی ان کی قمیض میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ جب میں مائکے میں تھی تب سب سے پہلے بڑے ابا کی زبانی ان کا نام سنا تھا۔ بڑے ابا نے ہی یہ رشتہ طے کیا تھا۔ تب سے 'مدھوسودن راؤ' یہی نام میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ میں نے سوچا، میری زندگی کی معنویت اسی نام کے ساتھ جڑی ہے۔ تین سالوں تک میں انتظار کرتی رہی کہ کب میرا نام، اس نام کے ساتھ جڑے گا۔ میرے انتظار کی آخری گھڑیاں پاس آگئیں۔ اس دن مجھے اپنا یہ گھر پرایا لگنے لگا۔ مجھے خوشی ہونے لگی کہ چھ مہینوں کے بعد میرا اپنا گھر ہوگا۔ غیر ہونے کا جذبہ خود بہ خود میرے اندر نہیں جاگا۔ ماں مجھے کئی بار ایسی باتیں کہتی رہتی تھیں۔ اگر میں کچھ بھی ادھر ادھر کرتی تو ماں کہتیں۔

''اپنے گھر میں اپنی مرضی کے مطابق کر لینا۔ اس گھر میں میری چلنے دو۔''

یہ باتیں میرے دماغ میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی کام کرنے کے لئے میرا اپنا الگ گھر ہوگا۔ اس گھر کا تصور کرتے ہوئے میں دن کاٹنے لگی۔ جب مجھے پتہ چلا کہ میرا اپنا ہونے والا گھر حیدرآباد میں ہے تو میں خوشی سے پاگل ہو اٹھی۔ گھر میں کوئی بھی، حیدرآباد یا مدھوسودن راؤ کا نام لینے لگتا تو خود بہ خود ہی میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی تیر جاتی تھی۔ اسے دیکھ کر میری بہن میرا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ میرا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا تھا۔

میرے گھر والے پچاس ہزار روپیہ جہیز میں دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے یہ خبر بھی اپنی سہلیوں کو سنائی۔ بی اے کے امتحان کے بعد ہم سہیلوں کے درمیان اکثر یہی شادی بیاہ

کی باتیں چھیڑا کرتیں تھیں۔

سب سے پہلے میری شادی طے ہوئی تو مجھے فخر سا محسوس ہونے لگا۔

جہیز کی رقم سنتے ہی ایک سہیلی کہنے لگی: ''باپ رے اتنی رقم!''

دوسری نے کہا: ''بہت سستے میں تم نے شوہر کو خرید لیا ہے۔'' ایک اور نے چڑھ کر کہا: ''آخر جہیز کیوں دے رہی ہو؟'' اور آگے کہا: ''شادی کے بعد تم تو اس کی خدمت کرو گی ہی، اسے بچے دو گی، گھر کی بھی ذمہ داریوں کو نبھاؤ گی۔ اس کے بدلے میں تمہیں ہی اسے پیسے دینے ہوں گے نا، تو پھر تم جہیز کیوں دے رہی ہو؟'' مجھے غصہ آیا، شادی جیسے خوبصورت رشتے کا الٹا مطلب کیسے نکال رہی ہیں! میں نے فوراً جواب دیا۔

''ارے اتنا کام کروں گی تو اس گھر میں میں بھی تو خوشی سے رہوں گی نا۔ بچے ہوں گے تو وہ میرے بھی تو ہوں گے نا۔'' تب بھی وہ چپ نہیں رہی ٹھیک ہے جب تم خوش ہونے جا رہی ہو تو پچاس ہزار روپیہ جہیز میں دے کیوں رہی ہو؟'' میں نے سوچا ایسا الٹا سیدھا بولنے والوں سے کیا کہیں؟ کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ یہی سوچ کر میں نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارا رواج ہے، جب میرے گھر والوں کو اور مجھے اس بات سے کوئی اعتراض نہیں ہے تو تمہیں کیوں؟'' تب اس سہیلی نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''مجھے کیوں؟ اس کیوں کا جواب تمہیں اپنی شادی کے بعد پتہ چلے گا۔'' کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔

لیکن شادی کے بعد بھی میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔ میری شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ اس حسین لمحے کو بھول نہیں پائی جب میں نے پہلی بار اپنے شوہر کو دیکھا۔

فوٹو سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دئے۔ میں نے سوچا، ان کے ساتھ میری زندگی بہت ہی خوشحال ہو گی۔ شادی کے وقت بھی میں نے سبھی رسموں کو دل لگا کر ادا کیا۔ اپنے منگل سوتر کو آنکھوں سے لگایا۔ اس وقت میں نے ٹھان لی تھی کہ زندگی بھر انہیں خوش رکھوں گی۔ شادی کے بعد کچھ کڑوے تجربوں کا سامنا کرنا پڑا، پھر بھی سب کچھ بھول کر میں نے سمجھوتا کر لیا۔ میں گنگنایا کرتی تھی۔ ''محبت سے بھرا ہے یہ میرا اپنا گھر۔'' ایسے گانے مجھے بچپن سے ہی اچھے لگتے تھے۔ میں سوچا کرتی تھی کہ میں لتر کی طرح مدھوسودن کی زندگی سے لپٹ جاؤں، اس سے بڑھ کر خوشی مجھے کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن مجھے اپنے گھر کی خوشیاں اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوئیں۔ جن خوبصورت خوابوں سے میں نے اپنی ازدواجی زندگی شروع کی، ان حسین اور پاکیزہ جذبوں کو

قائم رکھنے کے لئے مجھے کافی جد و جہد کرنی پڑی۔ میری سوچ اور میرے شوہر کی سوچ میں کافی اختلاف تھا۔ وہ صفائی کے معاملوں میں زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے میں صفائی پر بہت دھیان دیتی تھی ۔ میں چیزوں کو صحیح ڈھنگ سے لگاتی تو وہ الجھ اٹھتے۔ میں نے اپنے آپ کو ہی بدلنے کی کوشش کی۔ میری پڑوسن بھی جو صاف صفائی پر توجہ نہیں دیتی تھی لیکن اس کے شوہر صاف صفائی پر بہت دھیان دیتے تھے۔ شوہر کے خوف سے میری پڑوسن صاف صفائی پر دھیان دیتی تھی۔ جب بھی ہم دونوں ملا کرتی تھیں، بس انہیں باتوں کا ذکر ہوتا تھا۔ میں نے صفائی کے بارے میں انہیں سکھایا اور اس کے کاہل پن کو کچھ حد تک میں نے سیکھنے کی کوشش کی۔

وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ پیار کو ناپنے کا کوئی پیمانہ تو نہیں ہے۔ اگر پھول خرید کر لانا، پکچر دکھانا، سیر کرانا ہی پیار کا مطلب ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے بہت پیار ملا ہے۔ لیکن کبھی میں اپنی پسند کے پھول خریدوں، یا من پسند پکچر دکھانے کی فرمائش کروں تو ان کا موڈ بگڑ جاتا ہے۔ چونکہ میں نے شادی کے دن ہی قسم کھائی تھی کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کروں گی، اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ ہم دونوں خوش ہیں۔ میرے ساس سسر بھی اچھے ہیں۔ جہیز اور چھوٹی موٹی فرمائشوں کے علاوہ انہوں نے اور کچھ نہیں مانگا۔ وہ بھی دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ اس وجہ سے ساس بہو کے جھگڑے بھی نہیں تھے۔ بس سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا۔

اس دن ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ گذری ہوئی باتوں کو یاد کرتی ہوئی میں ان کی قمیض میں بٹن لگا رہی تھی۔ اچانک سوئی میری انگلی میں کھپ گئی۔ درد کے مارے چیخ میرے منھ سے نکلی۔ تبھی باہر سے کافی شور سنائی دیا۔ میں دوڑ کر باہر گئی۔ کئی لوگ آٹو رکشہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ دھیرے سے آٹو رکشہ سے میرے شوہر کو لے کر اندر آنے لگے۔ انہیں دیکھتے ہی میں رو پڑی۔ ''چپ ہو جائیے۔ ہم سب خوش قسمت ہیں۔''

ایک بزرگ نے یہ کہا اور آہستہ سے میرے شوہر کو بستر پر لٹایا۔ تب میں نے غور کیا۔ میرے شوہر کے داہنے ہاتھ میں خون سے لتھ پتھ ایک پٹی بندھی ہوئی ہے۔ مجھے چکر سا آنے لگا۔ میں گہرے تناؤ میں گھر گئی۔

''انہیں کیا ہوا؟ کب تک ٹھیک ہوں گے؟'' میرے آنسو بہتے چلے گئے۔

لوگوں نے مجھے تسلی دی اور اس دن کا حادثہ بتانے لگے۔ جس مشین پر میرے شوہر روز کام کرتے تھے، جس کی خوبیوں کو بتاتے ہوئے وہ کبھی تھکتے نہیں تھے۔ اتنے سالوں سے ہوشیاری

سے اس سے کام نبھاتے آرہے تھے۔ آج نہ جانے کیوں اسی مشین کے نیچے داہنے ہاتھ کی انگلی آگئی۔ پھر انہیں لوگوں نے مجھے تسلی دی کہ علاج میں جتنا بھی خرچ ہوگا، اسے فیکٹری کے مالک ہی دیں گے۔ اب مجھے صرف ان کی صحت کا خیال ہی رکھنا ہوگا۔ انہیں صبر دلانا ہوگا۔ بس اور کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ کچھ پیسے انھوں نے میرے ہاتھ میں رکھے۔ مجھے لگا بھگوان کہیں اور نہیں ہیں بس انہیں لوگوں میں بسے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں کچھ سنبھل گئی۔ سب کو کافی پلائی مصیبت کے لمحے میں ساتھ دینے والا ہو تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے آج ہوا۔

کچھ دیر بعد سبھی لوگ چلے گئے تو پھر غم نے مجھے گھیر لیا۔ لیکن میں نے آنسوؤں پر قابو پالیا۔ جب میں اندر آئی تو میرے شوہر رو رہے تھے۔ جیسے ایک ماں اپنے بچے کو سینے سے لگا کر پیار کرتی ہے، ویسے ہی میں نے اپنے شوہر کو تسلی دی۔ میرے شوہر اتنے بے صبر ہو اٹھے کہ انہیں لگا کہ میں ان سے محبت کرنا چھوڑ دوں گی۔ یہ بات سنتے ہی میں نے کہا۔ ''آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟''

پھر میں نے اس ہاتھ کو پیار سے چوما۔ انھیں اس کے علاوہ ایک فکر اور تھی کہ انگلیوں کے بغیر ان کی نوکری بھی جا سکتی ہے۔ پھر کیا ہوگا؟

اب اور کہیں نوکری بھی تو نہیں ملے گی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی بات کو لے کر فکر مند نہ ہوں۔ نیند کی دوا دے کر میں نے انھیں سلایا۔ وہ تو سو گئے لیکن میں رات بھر جاگتی رہی۔

خبر پاتے ہی دوسرے دن میرے ساس سسر آگئے۔ پھر ایک بار رونا دھونا۔ تبھی یونین والے آئے۔ انھیں دیکھ کر سبھی لوگ کچھ سنبھل گئے۔ یونین والوں نے کہا، نوکری کے لئے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس طرح نوکری سے نکال دیں گے تو پھر یونین کا کیا مطلب رہے گا؟'' تب جا کر میرے شوہر کو کچھ تسلی ہوئی۔ اس وقت میرے شوہر نے مجھ سے کہا کہ میں جا کر یونین کے نیتا کے پیر چھولوں۔ میں نے تہ دل سے ان کے پیر چھوئے۔

نیتا نے ہم سب کو بتایا۔ ''آج مدھوسودن کی نوکری بچی ہے تو اس کے پیچھے صرف یونین والوں کا ہی ہاتھ نہیں ہے۔ اسکے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے۔ ایک سو چھبیس سال پہلے مزدوروں میں جو چیتنا کی لہر دوڑی، یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ ایک زمانہ ایسا تھا جب مزدوروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا تھا۔ اس وقت کوئی بھی مزدور اگر حادثے کا شکار ہو جاتا تھا تو ان کے سامنے مرنے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ فیکٹری کے مالک ان کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد جب سبھی مزدور ایک ہو کر لڑنے لگے تب ان کے حق میں کئی قانون بنے۔ اس وجہ سے آج

مدھوسدن کی مشکل اتنی آسانی سے حل ہو پا رہی ہے۔''

''یہ ساری باتیں میرے لئے بالکل نئی تھیں۔ میں نے غور سے ان کی ساری باتیں سنیں۔ بس آخر میں میں صرف یہی سمجھ پائی کہ ایسے بے سہارے مزدوروں کے پیچھے یونین کا سہارا ہے۔

ایک مہینے کے اندر ہی میرے شوہر کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ جس دن وہ ہسپتال سے پٹی کھلوا کر آئے اور ان ہاتھوں سے جب انھوں نے مجھے چھوا تو کچھ لمحے تک مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن میں جلد ہی سنبھل گئی۔ یونین والوں کی مدد سے میرے شوہر کی نوکری برقرار رہی ساتھ ساتھ ان کے لئے ایک اسسٹنٹ بھی مل گیا تھا۔ کمپنشیشن کے لئے دس ہزار روپے بھی ملے، چار مہینے کے بعد ہمیں لگا کہ پرانے دن واپس آ گئے۔ خوش قسمتی سے تبھی میں حاملہ بھی ہوئی۔ دو مہینے تک مجھے میرے شوہر کا بھرپور پیار ملا۔

لیکن اس کے بعد ایک دن شام کو میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔

میں نے اپنے پڑوسن کو آواز دی اور اس کے بعد بیہوش ہو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھی۔ جب میں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تو مجھے کچھ ڈر لگا۔ دھیرے سے ماں نے بتایا کہ ''میرا اسقاط ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور یہ بھی بتایا کہ اب زندگی میں میں کبھی بھی ماں نہیں بن پاؤں گی۔'' ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تیرا دوسرا جنم ہوا ہے، نہ جانے آگے کی تمھاری زندگی کیسے کٹے گی۔؟'' مجھے کچھ عجیب سا لگا۔

شام کو میرے شوہر آئے۔ تو میں ان کے سامنے رو پڑی۔ میں نے سوچا کہ وہ مجھے پیار سے تسلی دیں گے میرے آنسو پوچھیں گے اور کہیں گے۔ ''میں ہوں نا! تم غم زدہ مت ہو۔''

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انہوں نے روکھے پن سے کہا۔ ''اب رونے سے کیا فائدہ؟ نصیب میں یہی لکھا ہے۔'' میں نے سوچا وہ بھی میری طرح افسردہ دل ہیں۔ لیکن ان کا برتاؤ کچھ اور ہی تھا۔

دوسرے دن میری ماں نے بتایا۔'' تم بچوں کی ماں نہیں بن پاؤ گی۔ اسی وجہ سے تمہارے ساس سسر تم سے خفا ہیں۔'' تب مجھے معلوم ہوا کہ میرے شوہر کے روکھے پن کی وجہ کیا ہے۔ اس وقت سے میں ڈرنے لگی۔ میں نے گھبرا کر ماں سے پوچھا۔ ''ماں! اب میں کیا کروں۔''

ماں بھی پریشان تھی۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری بھی کتنی بدتر زندگی ہے۔ بچوں کو گود میں لینے کی قسمت ہی نہیں ہے تمہاری اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟'' وہ لوگ اب جو کچھ بھی کریں۔ یا کہیں اب ہمیں سننا ہی پڑے گا۔'' یہ کہہ کر میری ماں بھی رونے لگی۔

دھیرے دھیرے میری آنکھوں سے آنسو سوکھتے گئے۔ اب میں جان گئی کہ اس مصیبت کے دن میں میرا ساتھ دینے کے لئے کوئی نہیں ہے۔ بس میں اکیلی ہوں۔ مجھے افسوس ہوا کہ میری ماں بھی ایسا ہی سوچ رہی ہے۔ ایک دن اسپتال کی آیا نے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا۔ "کتنے بڑے حادثے سے گذری ہو بیٹی!"

تو فوراً ساس نے کہا۔ "کس کی فلاح کرنے؟ اب اس کے جینے اور نہ جینے سے کس کو فرق پڑنے والا ہے۔"

میں اسپتال سے گھر لوٹ آئی۔ ماں باپ بھی چلے گئے۔ مجھے میرے ماں باپ اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اس لئے ساس سسر مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے شوہر کے برتاؤ نے میرے غم کو اور بھی بڑھا دیا۔ میں سوچنے لگی کیا بچوں کے لئے ہی انھوں نے مجھ سے شادی کی ہے۔ پیار محبت کا زندگی میں کوئی مطلب نہیں ہے؟

پہلے کی طرح ہم دونوں پیار سے نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے ایسے ماں باپ ہیں جو بن بچوں کے ہیں۔

اچانک مجھے روکمنی پھوپھی کی یاد آئی۔ ان کے بھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ چالیس سال تک انتظار کرتے رہے۔ ہر مندر میں ماتھا ٹیکا، ہر مشہور ڈاکٹر کی صلاح لی، ایک طرف ڈاکٹر کی جانچ پڑتال تو دوسری طرف پوجا پاٹھ، برت وغیرہ... سب ان کو رحم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب انھیں پکا یقین ہو گیا کہ اب ان کے اپنے بچے نہیں ہوں گے تو پھوپھا جی نے اپنے بھائی کے لڑکے کو گود لے لیا۔

میں سوچنے لگی اس معاشرے میں زیادہ تر عورتیں خوش نہیں ہیں۔ میں جہیز دے کر شادی کر پائی لیکن بچے نہیں ہیں میری کچھ سہیلیاں جہیز نہ دے پانے کی وجہ سے کنواری رہ گئیں۔ معاشرے میں ان کا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ میری سہیلیاں نرملا، سروج نے شادی تو کر لی لیکن جہیز نہ ملنے کی وجہ سے سسرال والوں کے ظلم سے دکھی ہو کر خودکشی کر لی۔

کملا کو تو اسکے شوہر نے ہی مار ڈالا۔ میری پڑوسن کی دو لڑکیاں ہیں لڑکیوں کو پیدا کیا ہے، اس وجہ سے وہ کئی زیادتیاں سہ رہی ہیں۔

آخر اتنے دن تک میں نے اپنی آنکھ کیوں موند لی تھی؟ ایسے کئی سوال مجھے ستائے جا رہے تھے۔

اچانک ایک دن میری ساس مجھ پر برس پڑیں۔

''تیری ہی وجہ سے میرے بیٹے کی زندگی برباد ہوتی جارہی ہے۔ سبھوں کے ساتھ اپنا رشتہ توڑے جارہا ہے!'' میرا شوہر صرف میرے ساتھ رشتہ توڑ رہے ہیں۔ باقی سب لوگوں کے ساتھ وہ خوش ہیں۔ دفتر میں بھی کام کا بوجھ نہیں ہے۔ کافی تندرست بھی دکھائی دے رہے ہیں۔

میں کمزور ہوتی جارہی ہوں۔ آس پاس کی عورتیں بھی مجھے ٹوک رہی ہیں۔

ایک دن میری ساس نے کہا کہ میرے شوہر کے لئے وہ لوگ دوسرا رشتہ طے کرنے والے ہیں۔ میں کانپ اٹھی۔ ہمیشہ کے لئے مجھے میرے مائکے بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس گھر میں ایک ایسی عورت کو لانا چاہتے ہیں جو انہیں بچے پیدا کرکے دے سکے۔ شوہر کو بتایا تو جواب ملا۔ ''میں کیا کروں، میری ماں پوتے پوتیوں کی خواہش رکھتی ہے۔'' میں نے سوال کیا۔ ''اب میں کیا کروں؟'' تو انہوں نے کہا۔ ''تمہیں طلاق دوں گا۔'' پھر بولے ''چپ چاپ طلاق کے کاغذوں پر دستخط کردو ورنہ میں جانتا ہوں کس طرح طلاق لیا جاتا ہے۔'' ان کی باتیں سن کر میں کانپ اٹھی۔ میرے ماں باپ کو بلایا گیا۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔

ان کا کہنا ہے کہ اب یہ گھر میرا نہیں ہے۔ میں ان کی بیوی نہیں ہوں۔

بیوی وہی کہلائے گی جو بچے پیدا کر سکے۔ شاید شادی میں منتروں کا بھی یہی مطلب نکلتا ہے۔ مجھے لگا کہ شادی بیاہ میں بیوی اپنے کہلانے والے گھر میں ایک ایسی نوکری کرتی ہے جس کی وجہ سے شوہر کی نسل آگے بڑھ سکے۔ اب میں اس نوکری کے قابل نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے نوکری سے نکالا جارہا ہے۔

لیکن کوئی بھی لڑکی جب شادی کرتی ہے تو اس بات سے انجان ہی رہتی ہے۔ اس بات کے معنی کو چھپا کر میاں بیوی کے درمیان پیار محبت وغیرہ کی باتیں کہہ کر لڑکیوں کو دھوکے میں کیوں رکھا جاتا ہے؟ شاید اس لئے کہ نوکری کا لفظ فرض اور حق جیسی باتوں سے جڑا ہوتا ہے۔ کئی سوال اٹھ سکتے ہیں۔ ردعمل ہو سکتا ہے۔ بونس کا سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ بیوی کو تو خدمت کرنے کے لئے سسرال لایا جاتا ہے تبھی اسے شوہر پرستی کے جذبے پر یقین دلایا جاتا ہے۔ اس کو سب کچھ مان کر عورتیں بھی جی توڑ خدمت کرتی ہیں۔ بغیر کچھ مانگے اپنا سب کچھ نچھاور کرتی ہیں۔ سسرال میں بیوی اس لئے سہم کر رہ جاتی ہے کہ کہیں اسے معاشرہ لڑاکو نہ سمجھ بیٹھے۔ جب ہمارا ازدواجی نظام اتنے فائدوں سے جڑا ہوا ہے تو اسے کوئی نوکری یا تجارت کا نام ہی کیوں دے گا؟

آہستہ آہستہ میرے اندر کا غصہ بڑھنے لگا۔ جی چاہا کہ زور زور سے چلاؤں کہ یہ سراسر

ناانصافی ہے۔ میں حیران ہوئی کہ سب میرے درد کو جانتے ہیں لیکن کوئی بھی مجھے سہارا دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس دن میرے شوہر کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں تو اسے سہارا دینے یونین والے آئے، ہمت بندھائی، اسپتال کے خرچ کے لئے مالکوں سے بات چیت کی۔ پھر سے انھیں نئی زندگی دلوائی۔ کتنا اچھا لگا تھا۔ ان باتوں سے میرے شوہر کے اندر کا دکھ جیسے ایک ہی دن میں غائب ہو گیا۔ وہ ہاتھ کی انگلیاں جو دفتر میں کام کرتے کرتے حادثہ میں کٹ گئیں۔ اس ہاتھ کو نہ جانے کتنے فائدے ملے، کتنی مدد، اس چوٹ لگے ہاتھ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

میں بھی حادثہ کا شکار ہوئی۔ انہونی حادثے کی وجہ سے میں ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی۔ پھر میرے لئے اتنی لاتعلقی کیوں؟

یہ اکیلا پن کیوں؟ اس حادثہ کے پیچھے ان کا بھی تو ہاتھ ہے۔ انھیں کی وجہ سے میں حاملہ ہوئی۔ حادثہ کی وجہ سے میرے ماتھے پر بانجھ کا ٹھپہ لگایا گیا ہے۔ میرا وہ بچہ جو اس دنیا میں نہیں آسکا، ہو سکتا ہے مستقبل میں وہ فیکٹری کا مالک بنتا، بینک کا ملازم یا سماجی کارکن بنتا۔ ایسے بچے کی پیدائش کے وقت ہی تو میری زندگی میں یہ حادثہ ہوا، پھر بھی میرے لئے کوئی منافع نہیں ہے۔ مجھے کوئی سہارا دینے والا نہیں ہے۔ مجھے اپنی اس نوکری سے نکالا جا رہا ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ کیوں؟ کیوں؟ میرے اکیلے پن کے پیچھے جو سازش رچی گئی کب سے شروع ہوگئی ہے؟ عورتیں سب مل جل کر کیوں نہیں رہ پا رہی ہیں؟ ماں، بیوی، بیٹی، ساس، بہو، نند وغیرہ حصوں میں کیوں بٹ گئی ہیں؟ کن لوگوں نے انھیں الگ کیا؟ مادرانہ صلاحیتوں کی محرومی کے نام پر کیوں انھیں کیوں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اس دھوکے کی وجہ سے کسے کتنا فائدہ ملے گا؟ مجھے لگا اس بات کو جاننے کی ضرورت ہے۔ بند مٹھی کی طرح نہ رہ کر عورتیں کیوں کسی اپاہج بن کر جی رہی ہیں۔ اس نے سوچا مجھے ایسی عورتوں سے ملنا ہے جو مجھ جیسی اذیتیں سہ رہی ہیں۔ جو خودکشی کرنے کے لئے مجبور ہوتی جا رہی ہیں۔ اب میں نے جان لیا ہے کہ میری زندگی کی کامیابی میری سیندور میں نہیں ہے۔ شوہر کی خدمت میں نہیں ہے۔ میں نے جس بچے کو جنم نہیں دیا۔ اس میں بھی نہیں ہے۔ مجھ جیسی عورتوں کے ساتھ ہاتھ ملا کر چلنے میں ہے۔

☆☆☆

تیلگو قلم کار اولگا کی پیدائش ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ افسانوں کے مجموعے، ناول اور مرتب کردہ تقریباً ۱۵ کتابیں شائع ہوئیں۔ کئی اداروں سے ایوارڈ ملتے رہے ہیں۔

اعزاز

بندھو شرما

جس دن دربار گڑھی جی کو کلاسدن کا خط ملا۔ اسی دن سدن کے دو اہل کار بھی ان کے پاس آ گئے۔ Despatch کی تاریخ ایک ہفتے پہلے کی تھی۔ بیس کلومیٹر کی دوری طے کرنے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ حیرت کی بات ہے۔ ویسے آج کل تار بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں ایک ہفتہ لگا رہے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خط دیر سے پوسٹ کیا جا رہا ہو۔ لیکن ملازم اس دلیل سے متفق نہیں تھے۔ انھوں نے دربار گڑھی جی کو بتایا کہ خط پر Urgent مارک ہوا تھا۔ اور اسی دن لیٹر بکس میں ڈال دیا گیا تھا۔ آپ کی رضامندی نہیں پہنچنے پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ خود جا کر دربار گڑھی جی سے ملئے اور جلسے کے متعلق خبر دیجئے۔ اس لئے ہم حاضر ہیں۔ آپ نے تو پڑھا ہی ہوگا کہ پوسوں دوشنبے کو ۲۸ جنوری کو ایک جلسہ منعقد ہو رہا ہے اس میں عزت مآب گورنر اپنے دست مبارک سے آپ کا اور دوسرے فنکاروں کو منتخب شہریوں کے درمیاں اعزاز دیں گے۔ آپ ٹھیک پانچ بجے شام کلاسدن کے ہال میں تشریف لے آئیں۔ ہمارا کوئی آدمی جلسے کے خاتمے تک آپ کی سہولتوں کا دھیان رکھے گا۔ آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی، دوسرے اہل کار نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں زحمت صرف اتنی ہوگی کہ آپ کو خود کلاسدن میں آنا ہوگا، صاحب ٹیکسی پر آجائیں۔ ٹیکسی کا کرایہ سدن ہی دے گا۔ سدن کی صرف اپنے دو کاریں ہیں ان کی ڈیوٹی آگے ہی ادھر ادھر لگی ہوئی ہے۔" یہ بات سن کر دربار گڑھی جی مسکرا اٹھے۔ انھیں معلوم تھا کہ دفتر کی گاڑیاں کون سی ڈیوٹی دیتی ہیں۔ ہوسکتا ہے پروگرام دیر تک چلے، ٹھنڈ زیادہ ہو جائے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ سنگیت، شاعری اور تقریر وقت باندھتے ہی نہیں۔ وقت لیتے بھی ہیں۔ ہم اس بات کا دھیان رکھیں گے کہ واپسی کے وقت کوئی زحمت پیش نہ آئے۔"

ٹھکرائن نے اندر سے مٹھائی کی پلیٹیں بھجیں۔ دربار گڑھی جی کچھ رک کر بولے۔'' جو بھی ہے اسے سدھاما کی ستو سمجھ کر قبول کیجیے۔ ہاں! آپ نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔''

'' ان کے بزرگوں کا گھر جسر وٹا میں تھا۔ یہ ہے جسر وٹیا رام سنگھ جسر وٹیا۔ ہمارے سدن کے کلچرل آفیسر، میرا نام شیورام ہے۔ میں کلچرل آفس میں اسسٹنٹ ہوں۔''

جسر وٹیا ہمارا گاؤں آس پاس ہے۔'' دربار گڑھی جی بتانے لگے۔'' یہ جو پہاڑی دکھائی دے رہی ہے نا'' انھوں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' اسی کے اس پار جسر وٹا ہے۔ کیسی رونق والی بسی ہوئی بستی تھی کسی زمانے میں لیکن اس کی ترقی اور خوش حالی ہی اس کے اجڑنے کا سبب بنی، کہتے ہیں حملہ آور اسے کئی دن تک لوٹتے رہے، گھوڑے لاد لاد کر دھن دولت لے گئے۔ محلوں کو ویرانہ کر گئے۔'' دربار گڑھی جی جذباتی ہوا ٹھے، تھوڑا رک کر کہنے لگے۔ ''بستیاں بسانے میں عمر بیت جاتی ہے مگر اجاڑنے اور مٹانے میں لمحہ ہی لگتا ہے۔ تاریخ کے المیے پر کوئی بیس برس پہلے میں نے جسر وٹا نام سے ایک لمبی نظم لکھی تھی، اس کی ایک ایک لائن مجھے اب تک یاد ہے۔ ان کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔'' اپنی بہت ساری رچنا ئیں حالات کے گھنے سایوں میں گھرے ہوئے بھی مجھے یاد ہیں ۔ سمجھو کہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہیں۔'' انھوں نے بات ختم کی۔

آپ کی ادبی خدمات کو کون بھلا سکتا ہے، آپ کی شاعری کے ٹکڑے گھر گھر پہنچ گئے ہیں۔ صاحب تو عوامی شاعر ہیں۔ کچھ یاد کرتے ہوئے شیورام نے کہا۔'' مجھے یاد ہے آپ کی کویتا ''شورے کو کتنی شہرت ملی تھی۔'' دربار گڑھی جی کچھ پس وپیش میں پھنس گئے۔ 'شورے' نے ان کی نہیں' آوارہ' شاعر کی شاعری تھی۔ اگر شیورام جی غلطی بتاتے تو ناحق انھیں شرمندہ کرتے۔ چپ رہتے تو دوسرے شاعر کے کلام کے بوتے پر تعریف لینے والی بات تھی۔ نقلی واہ واہی انھیں قبول نہ تھی

۔

'' یہ کویتا میری نہیں، آوارہ جی کی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی انھیں کہنا پڑا۔ آوارہ جی کی فنی مہارت کے متعلق بتاتے ہوئے بولنے لگے۔'' آوارہ جی کے متعلق کچھ نقادوں کا ماننا ہے کہ وہ الفاظ کو پھولوں کی طرح شاعری کے ہار میں گوندھتے ہیں۔ مگر ان ہاروں میں متن اور معنی کی خوشبو اتنی نہیں جتنی الفاظ کے پھولوں کی چمک سے رنگ اور مہک سے بھنا، وہ تو صاحب عظیم شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک خاص فنی اسٹائل پیدا کی ہے۔ یہی فنی اسٹائل ان کی خاص پہچان ہے۔''

تھوڑا رک کر انھوں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔'' آوارہ جی نے ہی کہیں لکھا ہے 'الفاظ کو پھولوں کی طرح پروتے رہے۔ اپنے پاس یہی ایک ہنر تھا جو کام نہ آیا''

''واہ واہ کتنا خوبصورت شعر ہے'' یہ کہہ کر جسر وٹیا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اجازت دیجئے شام ہونے لگی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں آپ کو روکوں گا نہیں۔''

''اٹھیے شیو رام جی، خان صاحب کو رپورٹ بھی تو دینی ہے، وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔'' دربار گڑھی جی نے تجسس ظاہر کی۔'' دوستو! یہ خان صاحب کون ہیں؟''

''ہمارے کلاسدن کے ڈائرکٹر'' اسی سال انھوں نے چارج لیا ہے۔'' جسر وٹیا بولے۔

''سچ کہہ رہا ہوں، یہاں سے اٹھنے کا دل نہیں چاہتا لیکن اب چلنا ہی پڑے گا۔ پرسوں آپ کے درشن تو ہونگے ہی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔'' ذرا رکئے، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں، یہیں سڑک تک، آپ کو بس میں بٹھا کر لوٹ آؤں گا۔''

''نہیں نہیں، آپ تکلیف نہ کریں ہم خود ہی......''

''واہ تکلیف کس بات کی جی'' دربار گڑھی جی نے بات راستے میں روک لی۔'' ان درختوں کے گھنے چھاتوں کے نیچے سے گزرنا اور اپنے بزرگوں کی باوڑیوں کا ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر واپس آنے سے بڑا سکون کون سا ہے، آپ شہری ان لذتوں کو کیا جانیں؟'' انھوں نے دھیرے سے چٹکی لی۔ راستے میں انھوں نے پوچھا۔'' اور دو فنکار کون ہیں۔''

''مصور پرکاش چند سنہا، لوک گائک عاشق علی۔'' جسر وٹیا نے جواب دیا۔

''یہ انتخاب قابل تعریف ہے۔ اپنے علاقے میں دونوں نے ہی قابل تعریف کام کئے ہیں'' دربار گڑھی جی نے بتایا کہ سنہا جی کو تو پہاڑی قلم کی آخری نشانی ہی سمجھئے۔ عاشق علی نے ہمارے خطے کی کتنی ہی نایاب موسیقی کی بانگیں ٹیپ کروا کے رکھی ہیں۔ محققوں کو نئی راہیں سجھائی ہیں تاریخ کے گم ہوئے دھاگوں کو ڈھونڈ نکالا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر باریک سی لکیر کھینچ جاتی ہے جب وہ جسر وٹیا سے کہتے ہیں۔'' کلاسدا کو آپ سے ایک شکایت ہے۔'' دربار گڑھی دونوں اہل کاروں کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''تہذیب کے دیوں کی روشنی کو سنبھالنے میں اتنی دیر! ہم تینوں ہی اب عمر کی ڈھلان پر ہیں، شام کے چراغ ہیں، چلئے دیر سے ہی سہی، مگر آپ نے یاد تو کیا۔'' وہ یہ کہہ کر ہنس پڑتے ہیں

لیکن دوسرے ہی لمحے ان کا چہرہ سنجیدہ ہو جاتا ہے ہلکی سی آواز میں کہتے ہیں۔

''اب میرا گھر سے باہر جانا تقریباً چھوٹ ہی گیا ہے۔ جلسوں اور تزک بھڑک کی محفلوں سے دور رہتا ہوں۔'' کہتے کہتے وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں سے دکھ جھلکنے لگتا ہے۔

دونوں اہل کاروں کو اس اداسی کا سبب معلوم تھا۔ اعزاز عطا کرنے کے دوران بنیادی حقیقت اکٹھا کرتے وقت پتہ چلا تھا کہ دربار گڑھی کا اکلوتا بیٹا دنیا کی سب سے اونچی برفیلی چوٹیوں کے جنگی علاقے میں دشمنوں کے بنکر کے اوپر حملہ کرکے اور اسے تباہ کرکے خود شہید ہو گیا۔ ماحول بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ زندگی کے اس المیے کی بات کرنا ان دونوں نے ہی ٹھیک نہیں سمجھا۔ راستے میں چلتے چلتے انھوں نے اپنی چھڑی سے اشارہ کیا۔ وہ دیکھو شہر جانے والی بس آگئی ہے، پہلا کیلو میٹر راستہ کچا ہے۔ تھوڑی دھول تھوڑے دھکے۔ مجھے آپ کو میرے پاس آنے کا ٹول ٹیکس لگا ہے۔'' دونوں کھل کر ہنسنے لگے۔ ماحول پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ''معاف کیجیے آپ کو بڑی تکلیف دی۔'' انھوں نے بڑے آہستہ سے کہا۔

دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔ یہ ملاقات ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔!''

کلاسدن کا ہال دھیرے دھیرے بھر رہا ہے۔ باہر انھیں کوئی جان پہچان والا دکھائی نہیں دیا۔ اندر آنے سے پہلے انھیں اپنی جامہ تلاشی دینی پڑی۔ پہلی صف گورنر کے علاوہ بڑے بڑے اہل کاروں کے لیے تھی۔ دوسری صف ان کے محافظوں اور ذاتی اہل کاروں کے لئے بندھی۔ دربار گڑھی جی چوتھی صف کے سرے پر خالی پڑی کرسی دیکھ کر بیٹھ گئے۔ ''یہاں ٹھیک رہے گا۔'' انھوں نے سوچا۔ یہاں سے کوئی اٹھائے گا تو نہیں نا۔ نظر اندر آتے عاشق علی خان پر پڑی تھوڑی دوری پر تھے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مگر عاشق علی انھیں دیکھ نہ پائے۔ گورنر کہیں دوسری جگہ میٹنگ میں مصروف تھے۔ پروگرام میں دیر ہو رہی تھی۔

ہال میں ٹھنڈی بڑھ رہی تھی۔ انھوں نے بھی سردی محسوس کی، سر بھاری سا لگا۔ جسم کانپ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگے، کیا کیا جائے؟ مائک سے اعلان ہوا۔'' عزت مآب گورنر صاحب حفاظتی اقدامات سے متعلق ایک میٹنگ میں مصروف ہیں ان کے ذاتی سکریٹری کا فون آیا تھا کہ میٹنگ ختم ہی ہونے والی ہے۔ گورنر صاحب سیدھے یہاں آئیں گے۔'' ہال میں کھسر پھسر کے ساتھ تھوڑا شور بھی ابھرتا ہے۔ دربار گڑھی جی لاٹھی کے سہارے اٹھنے لگے، پھر کرسی پر ہی بیٹھ گئے۔

سر درد اور جسم میں کپکپاہٹ کم نہیں ہو رہی تھی۔ انھوں نے چھڑی پر زور ڈالا۔ پاؤں زور سے جمائے اور ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اپنے آس پاس دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ ہال سے باہر نکل گئے۔

ہال کے دروازے پر سرسوتی کا بت بنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں بینا لئے ہنس واہنی کی بہت خوبصورت مورتی کسی سنگ تراش نے بنائی تھی۔ مورتی کے نیچے تختی بھی لگی تھی۔ جس پر سرسوتی لکھا تھا۔ وہ بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ چشمے کو بار بار صاف کرنے پر بھی سنگ تراش کا نام نہیں پڑھ سکے۔ سامنے کی ڈھلان پر ہری گھاس بچھی ہوئی تھی۔ اس ہرے بھرے میدان میں بھی جیسے پانی کے دو لمبے سے فوارے بھی تھے۔ فوارے چل رہے تھے۔ نیچے جمع شدہ پانی میں رنگ برنگی روشنیاں فواروں پر پڑ رہی تھیں۔ جمع شدہ پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ایک دوسرے کے پیچھے پکڑا پکڑی کھیل رہی تھیں، مچھلیوں کے جسم سے ہری سیندوری سنہری کرنوں کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ آنکھیں صاف شفاف نگینے سی جڑی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے وہ اپنی ٹھنڈ، بے چینی اور بے زاری بھول گئے۔ دوسرے لمحے انھوں نے دیکھا۔ ہاتھ میں اسٹین گن لئے کالی وردی والے سپاہی ان کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ ایک طرف جانے لگے مگر ایک تگڑا سا ہاتھ انھیں ایک طرف ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا لیکن دھکا اچھا خاصا تھا۔ وہ گر گئے، سنبھل نہ پائے۔ ان کا سر زمین پر تھا اور پاؤں اوپر کی طرف ہل رہے تھے۔ ان کی لاٹھی ایک طرف پڑی تھی۔ ان کی پگڑی سرہانے کی طرف ان کے سر کے نیچے تھی۔ بانہوں کو زمین پر ٹیک کر وہ اپنے جسم کو سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر گھاس پر پھسلن اور ڈھلان ہونے کی وجہ سے وہ نیچے کی طرف لڑھکتے گئے انھوں نے دیکھا۔ اہل کاروں کے ساتھ گورنر آگے بڑھ رہے تھے۔

وہ فوارے کے کونے میں بیٹھ گئے۔ باہر گہما گہمی اور لوگوں کی آمد و رفت گھٹتی جا رہی تھی۔ رنگ اور روشنیوں کی لہریں بکھر رہی تھی۔ خاموش ماحول میں انھیں وینا کی جھنکار سمائی ہوئی لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے سنگیت کی لہریں صاف سنائی دینے لگیں۔

......خاموش ماحول میں آہستہ آہستہ عاشق علی کے درد یلے سروں میں اپنی سریلی اور دلآویز آواز ملا کر جسر وتا شاعر کی شاعری کے ٹکڑے گا رہے تھے۔ ......کچھ سامعین بھی عاشق علی کے ساتھ اپنے سر ملاتے ہیں۔ دربار گڑھی جی سنگیت کی مستی اور جسر وتا کی درد بھری آواز میں گم ہو جاتے ہیں۔ سر بدل کر اور نئی دھن کے ساتھ اس لوک گایک نے ان کی دوسری کویتا کے بول اٹھائے۔

''ملتے جلتے رہنا۔ ان سانسوں کا کیا وشواس جندے۔ ہمیں لگی رہے گی آس جندے۔''

شاعری اور سر نے مل کر عجیب کا سماں باندھ دیا۔ دربار گڑھی جی کی آنکھیں بھر آئیں جیسے وہ اپنی نہیں کسی اور کے کلام سن رہے ہوں۔ پہلی دفعہ —— عاشق علی کی آواز، رات کی خاموشی میں گھل جاتی ہے۔

کلاسدن سے باہر نکلنے سے پہلے انھیں خیال آتا ہے، جسر دیا اور شیو رام سے ملے بغیر انھیں واپس نہیں جانا چاہیے لیکن ان کا قدم ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ جلد ہی گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔ گھر کی کھڑکی میں ان کے انتظار میں دیے کی طرح جلتی ایک جوڑی آنکھیں انھیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ قریب ہی کھڑی ٹیکسی کی طرف وہ جلدی سے بڑھ جاتے ہیں۔

☆☆☆

بندھو شرما (۱۹۳۴۔ ۲۰۰۰) پرچھائیں، کینگرے، میل پتھر نام کے کہانیوں کے مجموعے۔ سردھرتی دے نام کی نثری تصنیف۔ جے اینڈ کے آف آرٹ اینڈ کلچر اکیڈمی ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے انعام یافتہ

راجستھانی کہانی

بھگوان کی موت

وجے دان دیتھا

ماروار میں بادل بارش کی کمی تو طے ہے لیکن ریگستان کی اس دھرتی پر لوک کتھاؤں، لوک گیتوں اور پھاگز، پہیلیوں اور کھاوتوں کی افراط ہے۔

یہ برسوں پرانی بات ہے کہ نو کوٹی مارواڑ کے کسی گاؤں میں تیڈا نام کا ایک برہمن رہتا تھا۔ بالکل اکیلا۔ گوبر مٹی سے لپی ہوئی جھونپڑی۔ چونے سے چھائی ہوئی۔ گھاس کی ٹٹی، جھونپڑی میں نہ چولہا چوکا اور نہ تو ہانڈی۔ پانی کی مٹکی، مٹی کا ڈھکن اور مٹی کا ہی لوٹا۔ ایکڑ سے بنی کھٹیا۔ رائی، گوودڑ اور ایک دوکھیس، ایک دھوتی کرتا کھونٹی پر ٹنگا ہوا اور ایک پہنا ہوا، سانگان نیری صافہ، ذات سے برہمن لیکن لکھنے پڑھنے کا نام — ایک دم ٹھیٹھ نرا جاہل۔ علم اور تعلیم کے نام پر کچھ ندیوں پہاڑوں کا نام جانتا تھا۔ علی الصباح اٹھتے وقت اور رات کو سوتے وقت ہونٹ پھڑ پھڑا کر پانچ سات نام گنگنا لیتا اور خوش۔ بالکل بھولا، معصوم اور آدھا باؤلا سا۔ نہ کسی کی برائی میں نہ کسی کی اچھائی میں۔ لیکن اچھی بری ساعتوں کا جانکار اور۔ کسی اچھے کام کے لئے آس پاس کے گاؤں یا سمت بھٹک جانے والے لوگ اس کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ بات شروع کرنے سے پہلے مسکراتا اور بعد میں بھی مسکراتا۔ اس لئے اس کے خالی اور بھرے پیٹ کا کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ بھوکے پیٹ بھی مسکراتا اور بھرے پیٹ بھی خوش رہتا۔ وقت پر نہانے کی جیسے اس نے قسم ہی کھائی ہو۔ جب برف جم جانے والی جیسی سردی میں بھی نہیں چوکتا۔ تب گرمی یا بارش کے موسم میں تو چوکنے کا سوال ہی نہیں۔ پوس کے مہینے میں فقط ایک کرتا کافی ہوتا، کئی بار بوریے کے کپڑے کے بٹن لگانا بھی بھول جاتا۔

اس کی نظر میں بھیک سے بہتر نہ دولت تھی نہ مذہب اور تیرتھ — دور یا نزدیک سبھی گاؤں والے اسے سداما کا ہی اوتار مانتے لیکن کرشن بھگوان نے تو ایک بار جنم لینے کے بعد کسی دوسری ماں کی کوکھ میں آئے ہی نہیں۔ بھوک کا کچا ہوتے ہوئے بھی خواہش ہوتی تو بھیک مانگتا ورنہ جنگل کے پھول پھلوں سے ہی کام چلا لیتا۔

ایک بار اتفاق سے بات ایسی ہوئی کہ گاؤں کی حد پار کرتے ہوئے ہی اسے گھبرایا ہوا

ایک کمھار سامنے ملا۔ سلام دعا کیے بغیر ہی وہ کہنے لگا، رات کو کھویا ہوا گدھا ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ چاروں طرف ڈھونڈ ڈھونڈ کر تو حیران ہو گیا۔ کہیں پتہ نہیں چلا۔ میرے لئے بازار ہاٹ سمجھو تو یہی گدھا، تجارت سمجھو تو یہی اور تجوری سمجھو تو یہی گدھا ہے۔ کیسی آفت ہوئی! اب کیوں کر کوئی دوسرا جانور پالوں، کنواں باوڑی کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں۔

پنڈت جی کی مسکراہٹ اسے زخم پر نمک جیسی لگی۔ طعنے دیتے روکھے لہجے میں بولا۔ ''پنڈت جی، تمھیں ایسا سنگی تو نہیں سمجھا تھا۔ میری تو ساری جمع پونجی اجڑ گئی اور تم ہنس رہے۔''

پنڈت کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ کسی سے ادھار تو لینا نہیں تھا۔ مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس بائی ٹیکری کے پیچھے دیکھا کہ نہیں؟''

کمھار ذرا اطمینان ہوا جلدی سے جواب دیا۔ ''نہیں پنڈت جی، وہاں بھلا کیوں جانا؟ میرے گدھے نے اس ٹیکری کی طرف منھ ہی نہیں کیا۔''

بھولے برہمن کی مسکراہٹ اور بڑھ گئی۔ ''باؤلے! گدھوں کا کیا بھروسہ۔ فکر مت کرو، ایک گدھی کے آگے پیچھے اسے پھسلاتا ہوا شاید وہ تیرا ہی گدھا ہوگا۔ جا جلدی بھاگ مستی مارتے مارتے بھٹک گیا تو دوگنا چکر کاٹنا پڑے گا۔''

پنڈت کی امید افزا باتیں سن کر کمھار کو تو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ اس بار پنڈت جی کے ہونٹوں کی اجلی مسکان اسے بادلوں کے بیچ چمکتی بجلی سی محسوس ہوئی۔ بچے کے جیسے مٹھیاں بھینچ کر ہوا کی رفتار سے اڑا تو گدھے کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ جیسے روبرو بھگوان کے درشن ہوئے ہوں بار بار پیٹھ سہلانے پر ہی اسے اطمینان ہوا کہ اس کا گدھا سچ مچ مل گیا ہے۔ اس نے تو بالکل امید ہی چھوڑ دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے واپس سدھ بدھ لوٹتے ہی اس نے گدھے پر سواری کرنے کے لئے اس پر بیٹھ گیا اور آناً فاناً پنڈت جی کے پاس آکر جوش سے اس طرح اترا جیسے ہوائی جہاز سے اترا ہو۔ اس کے پیروں میں گر کر نمسکار کرنے کے بعد کہنے لگا۔ ''آج پتہ چلا کہ آپ برہمن کے بھیس میں حقیقت میں پرمیشور ہیں۔ پرمیشور! آپ کی نظر کے آگے نہ رائی پہاڑ آتا ہے اور نہ میرو پربت!''

برہمن کی ایک سنک اور بھی تھی کہ وہ دو کے نام سے ہی اس کو بھاری پڑتی تھی۔ کمھار کی تعریف اسے بڑی الٹ پڑی گئی۔ پھر بھی ہونٹوں کی مسکراہٹ نہیں گئی۔ صاف منع کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں رے پرجاپت، یہ بات جہاں سے بھی اٹھی، ایک دم غلط ہے۔ پہاڑی تو بڑی بات ہے مجھے تو ہتھیلی کے پار بھی نہیں دکھتا۔ راہ چلتے تیرا گدھا دکھائی پڑا تو اس کا پتہ بتا دیا۔''

کمہار جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ '' بھگوان برا مانے تو ہزار بار مانا، لیکن میں آپ کی سراسر جھوٹی بات نہیں مانوں گا، جو اپنے آپ کو بھگوان یا اوتار مانتا ہے، وہ بھگوان نہیں ٹھگ ہے، شاطر ہے، آپ کی طرح جو انکار کرتا ہے وہی سچ مچ بھگوان ہے۔''

اس کی بھولی بات سن کر برہمن کو ہنسی چھوٹ گئی۔ چاروں طرف اِدھر ادھر دیکھا۔ شاید کسی پیڑ پر پھل پھول نظر آئیں تو۔ پیٹ کی آگ تو تھوڑا ٹھنڈا کر لیں، فی الحال تو جھڑتی ہوئی بیر سے ہی کام چل جائے گا۔ اندر تو جیسے لپٹیں سلگ رہی ہوں۔ پھر کمہار کی طرف ایک ٹک گھورتے ہوئے بولا۔ '' باؤلا کہیں کا، کیوں خواہ مخواہ باتیں جھونک رہا ہے۔ بھوک کی وجہ سے تو میری آنتیں کلبلا رہی ہیں اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے، یہ بھگوان وگوان تو بھوت ہیں بھوت، بھرم کے بھوت، میں نے پختہ جانچ پڑتال کر لی ہے، تو نہ مانے تو میں کیا کر سکتا ہوں! اپنی اپنی سمجھ ہے۔ آج پہلی بار کسی انسان بندے کو اپنے دل کا سچا راز بتایا ہے۔''

گدھے کا لمبا چوڑا سر سہلاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ '' اب چاہے جتنی گھما پھرا کر بات کریں، میں ماننے والا نہیں ہوں، کیوں، بھگوان کو کب بھوک لگتی ہے؟ وہ تو صرف شہوت کے بھوکے ہیں۔ شہوت کے۔ اپنے ملک میں مندر اور پرساد کی کیا کمی۔ اس کی شہوت ہی بے شمار ہے۔ ایک قدم بھی آگے نہیں جانے دوں گا۔ چلئے میرے ساتھ۔ گاؤں والوں کو جب تک آپ کی خصوصیات نہ بتا دوں مجھے چین نہیں پڑے گا۔''

اتنا کہہ کر اس نے بھلا سوچا نہ برا، پنڈت جی کی کلائی پکڑ کر انھیں کھینچتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ بھولے برہمن نے آگے کچھ بھی بحث نہیں کی۔ مسکراتا ہوا چپ چاپ اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اسے اتنی مسرت اور حیرت ہوئی کہ اپنی پیٹ کی آگ کو کچھ دیر کے لئے بھول گیا اور کمہار کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ '' اب تو میرا ہاتھ چھوڑ، بھاگوں گا نہیں، لوگ سمجھیں گے کہ چوری کرتے پکڑا گیا ہوں۔''

گدھے والے کمہار آس پاس کے گاؤں میں بھجن گانے کی وجہ سے مشہور تھا۔ مسکرا کر کہنے لگا، اس میں کچھ بھی بری بات نہیں، بھگوان تو پرانے وقت سے ہی لیلا رچتے آئے ہیں۔ کرشن کنھیا تو چوروں کے بھی استاد تھے لیکن اب انھیں کون چور مانتا ہے؟''

تیڑا برہمن بے وجہ جھنجھٹ میں پھنس گیا۔ ایسا پتہ ہوتا تو گدھے کا پتہ ٹھکانہ ہی نہیں بتاتا کبھی گدھی کا ساتھ چھوٹنے پر کہیں یہ گدھا من ہی من گالیاں دے رہا ہو، شاید گدھی کی بدعا بھی اس

کا پیچھا کر رہی ہو۔ گاؤں کے باڑے وغیرہ نظر آتے ہی گدھا چیپوں چیپوں کرنے لگا۔ کمہار کے پاؤں پر تو جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں کہ کب بستی کے بیچ پہنچے اور کب آنکھوں والے کرشمے کی بات سب کو بتائے۔ اس زمین میں اب بھی ایسے بیج بچے ہوئے ہیں۔

اس کمہار کا ایک سوتیلا بڑا بھائی تھا۔ وہ پہیا، ڈول، چاک مٹی، لید اور گدھے کے علاوہ دوسرے کسی مذہب یا دوسرے کسی دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا۔ چھوٹے بھائی کی طرح اس نے نہ تو اپنے گلے سے کوئی بھجن کیرتن گایا۔ اور نہ کسی رت جگے میں جھنجھے بجا کر جاگا۔

پنڈت جی کو بڑے بھائی کی جھونپڑی کے پیچھے کھڑا کر وہ کھوٹے گدھے کو ہانکتا ہانکتا کچے پکے بنے ہوئے برتنوں کو لانگھتا، بھاگتا کلیارے سے مڑا ہی تھا کہ اچانک پیٹھ پھیر کر سیڈا برہمن کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ ''یہیں کھڑے رہیے گا۔ ابھی واپس آ رہا ہوں۔''

اس نے کوئی بحث نہیں کی۔ بوکھلایا سا جھونپڑی کے پیچھے کھڑا رہا۔ اچانک اس کے کانوں میں سوگرے پوئے (کھانے کی چیز) کی تھپ تھپ کی آواز سنائی دی۔ بھلا اس سے بہتر کوئی سُر یلا ساز ہو سکتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر کیا دوسرا بھجن ہو سکتا ہے؟ اندر کا پورا شعور کانوں کے بیچ ہی مرتکز ہو گیا۔ انگاروں پر سینکے جا رہے سوگروں کی بھینی بھینی خوشبو اگربتی کی مہک کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ذرا جاہل ہونے کے باوجود اسے دس تک گنتی یاد تھی۔ ایک سے چھ تک کی گنتی میں جانے دنیا بھر کی مکمل گنتیاں سما گئی ہوں۔ پھر بھی اس نے پوری توجہ سے کان لگائے لیکن تھپ تھپ کا سنگیت سننے میں نہیں آیا۔ اگر اسی وقت کوئی انسان تازہ تازہ ایک ہی سوگرا لے آئے تو وہ اس کے لئے وہ بھگوان سے کم نہیں ہو گا۔

اس آدھی ادھوری سمادھی کے بیچ اچانک یہ کیا ہوا؟ جے جے کاروں کی گونج سے جیسے کانوں کے پردے ہی پھٹ جائیں گے۔ گدھے والا کمہار جب سے آگے تھا اس کے گلے میں جے جے کار کی آواز سما نہیں رہی تھی۔ اندھے، اپاہج، بڑے بوڑھے، مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کم نہیں تھیں۔ کمہار کے گھر والے تو منگے کے اگربتی دان میں جوت جلا کر لائی تھی۔ جب اس کے قدموں میں دھوپ دان رکھنے لگیں تب سیڈا برہمن کو ہوش آیا۔ چونک کر ایک دو قدم پیچھے سرک گیا۔ ہکلاتے لفظوں میں لگا۔ ''بھلے انسانو! یہ کیا کر رہے ہو؟ اس کے بجائے میرے سر پر جوتے مارتے تو اچھا تھا۔''

کمہار کی بیوی بولی۔ ''ایسا کرشمہ سننے پر سارا قبیلہ آپ کی جیتی آرتی اتار رہے ہم ہے۔''

''سچ مانئے، ابھی تک — '' سیڈا برہمن کو لگا کہ اس کی آواز کے بول ادھر ادھر چپک گئے ہیں

، آسانی سے باہر نہیں نکلیں گے زبان کو جیسے تیسے قابو میں کر کے کہنے لگا۔ میں خواب میں بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس میں میرا کوئی کرشمہ نہیں ہے۔ ٹیکری کے پیچھے میں نے اپنی آنکھوں سے گدھے کو دیکھا اور مالک کے پوچھنے پر اس کا ٹھکانہ بتا دیا جو ایک بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ اس میں کیا کرشمہ۔''

گدھے کا مالک آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ''یہی تو ایشور کی اصل پہچان ہے کہ وہ اپنے آپ کو چیونٹی سے بھی چھوٹا مانتے ہیں۔ اپنی ہی زبان سے اپنی بڑائی بگھارے تو دنیا اتنی بھولی نہیں ہے کہ ایشور کی طرح اس کی عزت کرے۔'' ایسے حیرت انگیز واقعے کے بیچ بے چاری بھوک ہی مر گئی۔ ''تیڈ ابرہمن کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اب کیا کرے کیا نہ کرے اور ایسی اس میں عقل بھی کہاں تھی۔ وہ تو ایک بچے کی طرح معصوم تھا۔ عمر کے حساب سے لمبا چوڑا ہوا تو کیا ہوا۔ اچانک آئی آفت میں کیسا پھنسا؟ ماتھے پر جیسے بے شمار چیونٹیاں رینگ رہی ہوں چاروں طرف بھیڑ بڑھنے لگی تو بڑھتی ہی گئی۔ اچانک گدھے کے مالک کا بڑا بھائی کب بھیڑ میں آ کر کھڑا ہو گیا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا، سبھی اپنا اپنا ہوش کھوئے بیٹھے تھے۔ کون کس کا خیال رکھتا۔ وہ بھیڑ کو ڈھکیلتا ہو آگے بڑھ کر زور سے گرجا۔ ''بیچ دوپہریا میں یہ کیسا تماشہ لگا رکھا ہے؟ اب اگر من میں بھی کسی نے جے کار کیا تو مجھ جیسا برا کوئی نہیں ہوگا۔ آنکھوں سے پرکھے بنا میں کوئی بات نہیں مانتا۔ بوڑم بھائی کے منھ سے بے سر پیر کی باتیں سن کر میرے کانوں میں جیسے چنگاریاں چیخ رہی ہوں۔ اس لئے سامنے رکھی ہوئی تھالی چھوڑ کر باہر آنا پڑا۔ اگر تیڈ ابرہمن میری جھونپڑی میں ابھی ابھی بنائے سو گرو کی گنتی بتا دے تو اس کے کرشمے کو مان لوں۔''

کچھ گہری فکر کئے بغیر ہی اس کے ہونٹوں سے اچانک یہی بات نکل پڑی۔ فقط چھ سو گرے۔

اس کے کانوں میں جیسے پٹاخہ چھوٹا ہو۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔؟ منھ سے نکلے بول پرائے۔ اب جو بات چل نکلی ہے اس کا خاتمہ نہیں ہونے گا۔ چنچل زبان سے کیسی دشمنی برتی، چرچی کے دانتوں پر چھنسنے پر چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ لیکن آفت کی اس گھڑی میں مسکراہٹ نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

آگے کچھ بھی بات سنے ایسا صبر بڑے بھائی میں تھا ہی نہیں۔ تیڈ ابرہمن کے منع کرتے کرتے بھی وہ بھاگ کر جھونپڑی کے اندر گیا۔ سو گرے گن کر اتنی ہی تیزی سے باہر آیا۔ پوری طاقت سے جے جے کار کرتے ہوتے اس نے برہمن کے قدموں میں گر کر پرنام کیا۔ جلتا ہوا دھوپ دان ہاتھوں میں اٹھا کر تین بار اس کی آرتی اتاری پھر تو چھوٹے بھائی کے پیروں میں گھنگرو بندھ گئے۔ بغلیں اچکاتا ہوا زور زور سے جے جے کار کرنے لگا تو رکا ہی نہیں۔

دونوں بھائیوں کا یہ جوش دیکھ کر ڈھولکیے پیچھے کیوں رہتا۔ ڈھول کا ڈنکا سنتے ہی تمام بھیڑ ناچنے لگی۔ جے جے کاروں کے گونج سے آسمان چھونے لگی۔ عقیدہ، جوش اور امنگ کے اس ماحول میں جیسے قدرت بھی ساتھ جڑ گئی ہو۔ گھبرایا ہوا میڈا برہمن ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ ایسا بے جا تو خواب بھی برا، سو وہ کھلی آنکھوں سے یہ حادثہ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ کیسی بھی بھوک اور کیسے بھی دکھ میں وہ بے چین نہیں ہو۔ لیکن ہوا کو چیرتی ان جے جے کاروں اور دھوپ دان کی لپٹوں کو وہ جھیل نہیں سکا۔ ایسے جینے کے مقابلے تو موت بھی بری نہیں۔ جنم جنم کی بھوگ اور غریبی کوئی لانچھن نہیں ہے لیکن اسے بے مطلب کی شہرت جھوٹی عظمت سے بڑھ کر گناہ یا بداعمالی کیا ہوسکتی ہے؟ منھ چھپانے یا پست ہونے سے یہ مسئلہ حل ہونا نہیں ہے۔ آج اسے پہلی بار بے حد دکھ ہوا کہ برہمن کے گھر جنم لے کر اگر وہ عالم ہوتا تو اس کی بہکی ہوئی بھیڑ کو لمحہ در لمحہ مغز ماری کر کے ضرور منالیتا۔ پھر بھی وہ اپنے دم بھر کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، تب وہ کتنی دور چل پائے گا۔؟ بڑی ٹیڑھی پہیلی میں وہ الجھ گیا۔ اس آدھی ادھوری نیند یا بے ہوشی کے درمیان اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بغیر کھائے ہی اس کی بھوک مٹ گئی ہو۔ اب تو یہ جھمیلا سلجھانے پر ہی بھوک کی فکر کرے گا۔ بھوک کی فکر کے مقابلے اس جھوٹی شہرت کی فکر ہزار گنا زیادہ ہے۔ جادوٹونے جیسی کوئی اثر دار بات کرنے کے لئے وہ اندر ہی اندر چھٹپٹانے لگا۔ لیکن ویسا ایک بھی لفظ اسے نہیں ملا۔

مگر گدھے والے کمہار کے سوتیلے بھائی کی زبان پر لفظوں کی بھرمار تھی۔ بھیڑ کی چک چک کو روکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''صبح سویرے بھوکے پیٹ ہی اپنے کھیت میں جھار جھنکار نکالنے کیلئے پہنچ گیا۔ بھوت کی طرح جٹ کر اس نے ساری جھاڑیاں اکھاڑ ڈالیں۔ محنت کا بھوک کے ساتھ جتنا میل ہوتا ہے اتنا کاہلی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ گھر کے قریب تک پہنچا تب تک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ چولھے کے سامنے بیٹھ کر آگ کا کرشمہ ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ خود دھودھو کر کے سلگتی ہے لیکن دنیا کے پیٹ کی آگ بجھاتی ہے۔ اپنے جلنے کی قطعی پرواہ نہیں کرتی ۔ ہم چنگاری کے چھپکنے سے ہی ہاتھ جھٹکنے لگتے ہیں۔ جیسے بڑے نے ڈنک مارا ہو۔ اس غور و فکر کے درمیان میری آنکھوں کے سامنے سوگرے پوئے اور سینکے گئے۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں اور جھونپڑے کے باہر کھڑے تیڈا برہمن نے صحیح گنتی بتادی۔ اب اسے سہدیو مانیں، اور تار مانیں یا بھگوان مانیں۔ بھگوان کے کوئی سینگ پونچھ تو ہوتی نہیں وہ تو انسان کے بہانے ہی لیلا رچتا ہے۔ میں تو خود حیران رہ گیا۔ بھوک جانے کہاں کھوگئی۔ کچھ ہوش حواس نہیں رہا۔ ایسے انسان کے ایک بار بھی درشن ہو جائیں تو برسوں

تک بھوک نزدیک ہوکر بھی نہیں پھٹکتی۔

اتنے میں نیم باؤلے ہوئے برہمن نے دونوں ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا تو بڑے بھائی کو رکنا ہی پڑا۔ بھگوان کا کہا بھلا کیوں کر ٹالتا۔ لوگوں نے صاف صاف دیکھا کہ اوتار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سما نہیں رہی تھی۔ ویسے ہی پاک مسکراہٹ تو آج سے پہلے کسی بندے کے ہونٹوں پر دکھلائی نہیں دی۔ سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔ آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں، میں تو خود سچی بات جانتا ہی ہوں کہ تین دن پورا بھوکا رہنے سے میں پست ہوگیا تھا۔ اچانک جھونپڑی کے اندر سوگرے پونے کی تھپ تھپ سن کر میرے کانوں کی قوت سماعت چوگنی بڑھ گئی۔ اگر اس وقت جھونپڑی کے اندر سوئی بھی گرتی تو میں اس کی آہٹ سن لیتا۔ مجھے لگا اس وقت میں باہر بھی ہوتا تو وہ میٹھی تھپا تھپ مجھ سے چھپی نہیں رہتی۔ یا تو بچپن میں ماں کی تھپکیاں بھلی لگتی ہیں یا اس وقت مجھے بغیر لفظوں کی وہ موسیقی بے حد اچھی لگی۔ مگر اب میرے لئے بھوک کے بجائے اس جھوٹے بڑ دنگ کو مٹانا ضروری ہوگیا ہے۔ اگر میرے دل کی سچی بات قبول نہیں کرو گے تو میری روح پرواز کر جائے گی۔ میرے خیال سے اب تو آپ کا وہم بالکل ہی مٹ جانا چاہئے کہ اس وقت زبردست بھوک سے پست ہوکر میں نے ایک ایک سوگرے کی گنتی کی تھی۔

بڑے بھائی نے بیچ میں ہی ٹوکتے ہوئے زور سے کہا۔ ''اس وقت مجھے آپ سے کم بھوک نہیں تھی۔ پھر میرے اندر کی سچائی کا کیا ہوگا۔ سارا علاقہ جانتا ہے کہ پرانے شاستروں کے پنڈت مجھے سمجھا سمجھا کر تھک کر ہار گئے لیکن میرے ملحد مزاج کی کور بھی ٹوٹی نہیں اور نہ ہی اس میں دراڑ ہی پڑی۔ فقط آج ہی میرے دل میں عقیدت جاگی اور آپ اس پر بھی کالک پوتنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم اتنے لوگوں کے من کی سچائی سے آپ کے اکلوتے من کی سچائی بڑھ کر ہوگئی۔؟ یہ تو انصاف کی بات نہیں ہے۔ میرا عقیدہ مٹانے سے آپ کو کیا ہاتھ لگے گا؟''

تیڈا برہمن کے دل میں کسمساتی نئی سمجھ نے جو پیچ پیدا کیا تھا اس سے جلد ہی کوئی جواب نہیں سوجھا مگر اس کی مسکراہٹ ذرا بھی پھیکی نہیں پڑی۔ اس اچانک آن پڑی آفت کے باجود اجلا ہوتے ہوئے بھی لوگوں کو اس مسکراہٹ کی رنگت کچھ بدلی بدلی سی نظر آئی۔

جب دونوں طرف سناٹا چھا گیا تو اس علاقے کے سیٹھ کی حویلی میں بجلی کی کڑک گونجی۔ جے جے کاروں کی ہوڑ بچی دیکھی تو وہ بھی چپ چاپ تیڈا برہمن کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ سارا جھگڑا غور سے سنا، بڑے بھائی کی طرف دو ایک قدم بڑھ کر کہنے لگا۔ ''آس پاس کے سب لوگ

، میں انسان ہو کر بھی اسی طرح جینا چاہتا ہوں۔ میرے ٹھس مغز میں ایسی سنک کیوں آئی۔ میں آج بھی اس کے معنی سمجھ نہیں پایا لیکن اپنے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں انسان کا ڈھرا دیکھتے دیکھتے میرے اندر انجانے ہی ایسا بیراگ پھیلا کہ اس طرح جینے میں کوئی تک نہیں ہے۔۔ پھر بھی میں نے خودکشی جیسی نیچ بات خواب میں بھی نہیں سوچی اور نہ مرنے ہی کی خواہش کی۔ اپنے جیسے تیسے دربے میں پوری طرح سے مگن ہوں۔ مجھے نہ تو سیٹھ جی کا ہار چاہئے نہ گیارہ سو مہریں اور نہ کسی کی مہربانی کے آسرے دو وقت پیٹ بھرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی گھر آنگن نظر نہیں آتا جس کے کٹھلے میں کو دانہ نہ ہو۔ زہر کے بجائے مجھے کو دانے کا ڈر زیادہ لگتا ہے۔''

اب تو بھیڑ کی انتڑیوں میں الجھی مسکراہٹ ہونٹوں پر آ کر ہی رہے گی۔ کب تک صبر رکھے۔ ایسی باؤلی باتیں تو پہلی بار ہی سننے میں وئیں۔۔۔'' کچھ نہ کچھ یا گہرائی تو نظر آتی ہے ۔ کبھی ایک دوسرے کا منھ تاکنے لگے اگر سچ مچ ہی اوتار ہوا تو بہت بری بتائے گا۔ سننے میں تو ایک دمڑی بھی خرچ نہیں ہوتی۔ تب سننے میں نقصان ہی کیا ہے۔ گدھے کا پتہ بتانے اور سوگروں کی گنتی کے لئے جھوٹی باتیں تو نہیں بگھاریں۔ کوئی دوسرا ٹھگ یا شاطر ہوتا تو بستی کے بھرم کا جانے کتنا فائدہ اٹھاتا! بے چارے برہمن کے ٹھس مغز میں کچھ دوسری چال تو نہیں سوجھی۔ بولتا ہے تو بولنے دو۔

تیڈا برہمن اب تک سدھ بدھ بھولا ہوا تھا۔ سیٹھ کی طرف نظر گڑا کر کہنے لگا، 'جب قدرت مجھے بھی بھوک کا لپھڑا عنایت کرنے سے نہیں چوکی تو کبھی کبھی کسی کھرے انسان کے اناج سے یا زیادہ تر قدرت کی رسوئی سے جس تس گزر بسر کر لیتا تھا۔ آج اس سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ عمر میں پہلی بار آج ہی جھوٹی شہرت کی بیڑیوں میں پھنسا ہوں۔ اس لئے سیٹھ جی کا ہار نہیں ملنے پر آپ سب کی آنکھوں کے سامنے اجاگر ہو جائے گا کہ میں نہایت معمولی انسان ہوں۔ مجھ میں کچھ بھی خاص بات نہیں ہے۔ فقط میرے جینے کا ڈھرا آپ سب سے میل نہیں کھتا تو بھلے ہی نہ کھائے ، اس سے کسی کا کیا بنتا گڑتا ہے۔ اب تو میں بھوک کے آسرے بھی نہیں ہوں۔ بھوک تو انتڑیاں چباتی ہیں لیکن جھوٹی شہرت کی لالچ تو روح کو ضرب پہنچاتی ہے۔ ایک لمحے گزارنا بھی میرے لئے پہاڑ سا بوجھل ہو گیا ہے۔ جینے کی یہ کیسی مجبوری کہ آج مجھے اتنا بولنا پڑا۔ جتنا ساری عمر بھر بھی نہیں بولا۔ جب کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں کی آپ لوگ پرواہ نہیں کرتے تو مجھے بھی میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ بس اتنی سی اجازت چاہتا ہوں۔'

پھر بھی مالک جانے کیوں سیٹھ جی سمیت سبھی کے دل میں ان بے تکی باتوں کی دہشت

چھاگئی ایسی نئی اور عجیب وغریب باتیں آج تک کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ کسی چھوٹے موٹے کرشمے کا جوش نہیں ہوتا تو یقیناً ایسے کھرے بول نہیں کہتا۔ سات دن کی مہلت بیتنے پر حضرت کی سب ہیکڑی ٹھنڈی پڑ گئی۔ تب تک اپنے حال پر جئے تو جینے دو۔ پھر تو بستی کے ہاتھوں ڈالی نکیل کے سہارے ادھر یا ادھر قدم اٹھائے گا۔ مسکان کے بجائے سکنے نہیں لگے تو بستی کی اہمیت ہی کیا ہے؟

باقی سب لوگ تو اپنی اپنی کھال میں دبک گئے تھے۔ بھیڑ کے جوش کا ابھان تو ٹھکانے لگا مگر سیٹھ جی کے مغز میں بے شمار دولت کا نشہ جوش بھر رہا تھا۔ جب انھوں نے بے حد نرم لہجے میں اپنی حویلی چل کر آرام سے سونے کھانے کی منت کی تو اس نے اسی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔'' میری جھونپڑی سے زیادہ آرام مجھے کسی دوسری جگہ نہیں مل سکے گا۔ میری فکر آپ مجھے ہی کرنے دیں تو آپ سب کا بے حد احسان مند رہوں گا۔'' یہ کہ وہ دھیرے دھیرے مسکرانے لگا۔ وہ مسکراہٹ تو بے جا ہی تیکھی تھی۔ جو بستی کے چند معتبر لوگوں کو کافی تکلیف دہ لگی جیسے ان کے ٹھاٹ باٹ کا مذاق اڑا رہا ہو۔ ایسی نہ مٹنے والی مسکراہٹ تو ساتوں سکھ والے کروڑ پتیوں اور راجا مہاراجاؤں کو بھی میسر نہیں ہوگی۔ مگر یہ غریب برہمن تو کبھی اداس یا مایوس نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس ایسی کون سی غیبی طاقت ہے، اس کی پختہ پڑتال کئے بغیر کسی کو بھی چین نہیں ملے گا۔ آ کر تو بستی کا محتاج تو اسے ہونا ہی پڑے گا۔ آج نہیں تو سات دن کی مہلت کے بعد۔۔ بھلا بستی کو نکار کر وہ اس طرح مسکراتے ہوئے کس طرح جی سکتا ہے؟ اتنے دن پرواہ نہیں کی، جس سے اتنی اکڑ آ گئی! ملک کی سرکار بھی ان سیٹھ جی کی عزت کرتی ہے۔ برابر بیٹھاتی ہے، یہ سیٹھ جی کوئی معمولی بنئے تھوڑی ہی ہیں کئی بار کمی پڑنے پر راجیہ کے خزانے کی عزت رکھی اور یہ کنگلا اپنی غریبی پر بھی اتنا مست رہتا ہے۔ ساتویں دن اس کی کھوکھلی ہیکڑی چور چور ہو جائے گی۔ بے شعور کہیں کا، حویلی میں آرام سے سونے کی منت تک نہیں مانی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہر ایک انسان کے دل میں ایسی ہی پھانس تھی۔ چیونٹی کے پر نکل جاتے ہیں تو مرنا ہی پڑتا ہے۔

سیٹھ جی کے دل میں کافی دیر تک اتھل پتھل رہی تو انھوں نے شام ہوتے ہی اپنے بیٹے کو تیڈا کے پاس سکھا پڑھا کر بھیجا۔ رٹے رٹائے لفظوں میں اس نے کہا۔'' بھائی جی کے پہنچنے سے پہلے ہی حویلی میں پلنگ پر نیا بچھونا لگوا دیا۔ سونی پلنگ نحوست ہوتی ہے۔ میری بائی (ماں) نے بہت عزت کے ساتھ عرض کیا، ان کی بات تو مانئے۔''

اس بار تیڈا کو اچانک ہنسی آ گئی ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں روٹھا تھوڑی ہی ہوں کہ آپ سے خوشامد کرواؤں۔

تب اس کے منھ سے دلی بات خود بخو نکل گئی ۔ جب معمولی نے یوں (کمھار کیلئے گالی) کو ہاتھوں ہاتھ پرچے دئے ہمارے تو ہمارے نو لکھے ہار کا پتہ لگانے میں کیا زور پڑتا ہے۔ تین مہینے سے حویلی میں کہرام مچا ہوا ہے۔

تیڈا برہمن نے بے باک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کتنی بار سننے پر آپ کو یقین ہوگا کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی میں نے گدھے کا ٹھکانہ بتایا اور بھوک کی شدت سے اپنے آپ ہی سوکروں کی گنتی ہوگئی۔ تمام بستی میں میرے کہنے کا کوئی بھی بھروسہ نہیں کرتا۔ جس کا تو کوئی حل میرے پاس نہیں ہے۔ جب ٹھاکر صاحب اور راجہ جی نے ہر طرح کی کوشش کرنے پر بھی چوروں کا پتہ نہیں لگا سکے تو مجھ غریب برہمن کی اوقات ہی کیا ہے۔

سیٹھ جی کے لاڈلے کو پیدائش سے ہی ایسی گھٹی دی گئی تھی کہ رشی منی، سنت مہاتما اور پہنچے ہوئے بھگت بھی جب روپئے کی جھنکار سننے پر بے چین ہوجاتے ہیں۔ تب اس دیوالئے برہمن کی کیا بساط؟ کبھی تک ہاتھ جوڑ کر شہد جیسی میٹھی آواز میں کہا۔

''بھلا بھگوان سے دنیا کی کوئی بات چھپی رہ سکتی ہے؟ میرے بھائی جی، قول کرنے کے بعد خواب میں بھی آگا پیچھا نہیں سوچتے میں انھیں کا بیٹا ہوں گھر والوں سے چھپا کر پانچ سو مہرے اور نذر کروں گا۔''

تیڈا نے گردن اٹھا کر بت کی طرح کھڑے ہو کر بغیر پلکیں جھپکائے ایک ٹک اسے دیکھتا رہا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ جانے کیا سوچ کر اس نے سامنے پوشیدہ باتوں کے فائدے کی بات چلائی۔ کچھ نہ کچھ بن گن تو اسے ضرور ملی ہوگی۔ اس کی مسکراہٹ لمحے بھر کیلئے بجھ گئی۔ پوچھا۔ ''کیا بھگوان کو بھی نو لکھے ہار اور مہروں کی ضرورت پڑتی ہے؟'' اس سوال کے ساتھ ہی تیڈا کو اچانک زور سے ہنسی آئی کہ سامنے والا انسان توپ کا دھماکہ سن کر بھی اتنا خوف زدہ نہیں ہوتا۔ الٹے پاؤں دھڑکتے دل سے بمشکل پیچھے کھسکتا کھسکتا حویلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ تب زمین پر بیٹھا ہوا تیڈا برہمن اکیلا رہ گیا۔ وہ اب تک ہمیشہ اکیلا ہی رہا لیکن آج پہلی بار اسے اپنے اکیلے پن سے تھوڑا خوف لگا۔ کبھی اپنے آپ سے باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ لیکن آج باتیں کئے بغیر وقت کا دباؤ ہٹنے والا نہیں ہے۔ پس وپیش کے ایسی دلدل میں وہ کبھی نہیں پھنسا تھا۔ اپنے آپ سے

جنگ کرتے کرتے وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو اپنے آپ سے پست ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لیکن کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ اس سے پہلے تو لیٹنے کے ساتھ ہی میٹھی اونگھ کی ترنگیں اس کی پتلیوں میں لہرانے لگتی تھیں مگر آج تو وہ چاہتے ہوئے بھی پاس پھٹکنا ہی نہیں چاہتیں۔ آخر اپنے آپ سے ہار قبول کر کے وہ نیند کو یاد کرنے لگا۔ ''آجا ری نندرا، آجا ری نندرا آجا'' درخت اور ندیوں کے بجائے تجھے یاد کرنے لگا ہوں۔ ''آجا ری نندرا آجا، آجا ری نندرا آجا''

آخر کئی بار نیند کو لگاتار پکارنے کے بعد اسے ایسی گہری نیند آئی کہ صبح کے وقت چڑیوں کی چہچہاہٹ سے نیند نہیں ٹوٹی جیسے پلکیں پتلیوں سے چپک گئی ہوں۔ شاید جھونپڑی کے چھاجن کو بھی حیرت ہوئی ہوگی کہ آج سورج نکلنے کے بعد ایسے میٹھے خراٹے کون بھر رہا ہے؟ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ کیا جھونپڑی کو بھی خواب آتے ہیں؟

اور ادھر حویلی کے مالکوں کا من ڈانواڈول ہو رہا تھا کہ اس برہمن سے ایسی چوک کر کیوں کر ہوئی۔ آج سے پہلے تو ہمیشہ دو گھڑی رات رہتے ہی اپنے روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہو جاتا تھا۔ زور زور سے ندیوں کو یاد کرتے ہوئے اس کی بولی کتنی سہانی لگتی تھی۔ گنگا، جمنا، کرشنا، کاویری، گومتی، گوداوری، نربدا، چمبل وغیرہ جیسی یہ تمام ندیاں اس کے اندر لہریں مارتی بہہ رہی ہوں۔ جب دل کرتا سیٹھ سٹھانی اکثر تیسری منزل کی چھت پر کھڑے ہو جاتے، سوچنے لگے کہ آج ناغہ کیوں کر ہوا؟ پول کھلنے کے ڈر سے کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟ سب کو اپنی اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ تیرس کی اجلی چاندنی میں پچاس قدم دور تالاب کا ایک کنارہ صاف دکھائی پڑ رہا تھا۔ سیٹھ جی کے پرکھوں نے سو سوا سو سال پہلے پانی کی قلت میں یہ عوامی تالاب کھدوایا تھا۔ ایک ہی عام برسات میں لمبی چوڑی کناروں والا تالاب پورا بھر جاتا۔ سال بھر مزے میں پانی نکلتا۔ بس ادھ باؤلے برہمن کے دل میں سنک آئی چاہئے اسنان وغیرہ سے نپٹ نپٹا کر کہیں تین گھڑی رات رہتے واپس نہ لوٹ گیا ہو۔

دو گھڑی دن چڑھنے پر اس کا صبر جواب دے چکا تھا تو ایک تابعدار کے ساتھ سیٹھانی، باپ اور بیٹا تینوں ہی سیدھا برہمن کے ٹھکانے پر پہنچے، ٹاٹ کا پردہ، آدھا کھلا ہوا تھا۔ زمین پر گہری نیند سوتے برہمن کے خراٹے باہر صاف سنائی دے رہے تھے۔ جھونپڑی کا دروازہ پورب کی طرف تھا۔ سامنے کہیں بڑے کمان یا لمبے پیڑ کی آڑ بنی تھی۔ اچانک سیٹھانی کی نظر زمین پر چمکتی کسی چیز پر پڑی۔ وہ بے حد جوش سے تیز تیز قدم بھرتی دروازے تک پہنچی، تو جوشیلے لہجے میں چیخی۔ ''یہ تو میرا ہی نولکھا ہار

جگمگا رہا ہے۔'' پھر تو باپ بیٹا دونوں ہی دوڑ کر اندر پہنچے۔ سیٹھ نے لپک کر ہار اٹھایا۔ سیٹھانی کو پہچاننے میں ذرہ برابر بھی دشواری نہیں تھی۔ شور وغل سن کر ہیڈ ابرہمن جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ سورج کی روشنی میں آنکھیں میچتے ہوئے بولا۔'' آج جیسی گہری نیند تو کبھی نہیں آئی۔ اتنی دھوپ چڑھنے پر بھی میری آنکھ نہیں کھلی۔ دیر سے ہی نیند آئی تو دیر سے ہی اٹھنا پڑا۔ آپ کے نولکھے ہار نے ہی یہ آفت مچائی۔''

سیٹھ نے تو جیسے اس کے بول سنے ہی نہ ہوں۔ خوشی اور غصے کے لہجے میں بولا۔'' میرا نولکھا ہار یہاں کیسے پڑا ہے؟ ایسی انہونی کیسے ہوگئی؟ ہیڈا کے ہونٹوں پر کرنوں جیسا اجالا تھا۔ مجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔'' پھر زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگا۔'' یہی سمجھ لیجئے کہ تین مہینے پہلے میں نے ہی اسے اٹھایا ہوگا۔''

سیٹھ ایک دم طیش میں آگیا۔'' یہ مذاق کا موقع نہیں ہے مجھے اس چنڈال کا نام بتاؤ، میرے دل میں آگ دھدک رہی ہے۔ چمڑی میں نمک بھروائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ پنڈت جی آخر نام تو بتانا ہی پڑے گا۔''

'' نا معلوم ہو تو بتاؤں، سچ مانئے اس ہار کا سراغ تو آپ کے منھ سے ہی سنا، جانے کون یہ ناٹک کر گیا۔؟'' کھاٹ سے اٹھتے ہی دمکتے ہار سے آنکھیں لگائے بستی اور سیٹھ جی کی وجہ سے نیند نہ آنے کا حال سنایا تو تینوں کا دل بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے تک کسی کے منھ سے کوئی بول نہیں نکلا تو سیٹھ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔'' یہ ندرا تو میری پاسبان کی بیٹی ہے سبھی جانتے ہیں۔ چار مہینے پہلے ہی پاس کے گاؤں میں ٹھاٹ سے اس کا بیاہ رچایا۔ اس جیسی سیدھی اور سمجھدار لڑکی کھوجنے پر بھی نہیں ملے گی۔''

اس بیچ سیٹھ کے چار پانچ نوکر آدھمکے۔ انھیں دیکھتے ہی سیٹھ جی نے گرج کر کہا۔'' میرا منھ کیا دیکھ رہے ہو'' گاڑی جوت کر ندرا کے سسرال جاؤ'' سیٹھ جی کے باقی الفاظ منھ میں ہی رہ گئے کہ گھبرائی ہوئی سی ندرا ہوا کی سی تیزی سے جھونپڑی میں گھستی ہوئی نظر آئی۔ ہیڈ ابرہمن کے پاؤں پکڑ کر زور زور سے چلائی۔'' ان داتا! کسی بھی طرح مجھے بچاؤ، غلطی تو مجھ سے بہت بھاری ہوئی ہے۔ مجبور ہوگئی تھی۔ آخر میرا من ڈانواڈول ہوگیا تھا۔''

کچھ دیر ٹھہر کر آگے کہنے لگی۔'' دوپہر رات ڈھلے پچھلے واقعے کی سچائی کی وجہ سے میری بے چینی بہت بڑھ گئی تو ننگے پاؤں آپ کے آسن کی اوٹ میں چھپ کر چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ آپ تو جیسے میرے نام کی مالا ہی جپنے لگے۔ کانپتے ہاتھ سے ہار رکھ کر واپس گھر میں دبک گئی۔ آج پہلی بار آپ کو ہی سچی بات بتاؤں گی۔''

سیٹھانی غصہ کے مارے کانپنے لگی۔ تھوکتے ہوئے بولی۔ "تو تو جانے کب یہی بات بتائے گی۔ اس کے پہلے ہی تیری ہاتھوں ہاتھ قلع قمع کروا دوں گی۔" پھر ایک مسٹندے نوکر کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "رانڈ کی چٹیا پکڑ کر پانچ سات لاتیں جماؤ۔ اپنے آپ سے باتیں نکل آئیں گی۔"

مسٹندے کی منشا بھانپتے ہی تیڈا کو پہلی بار معمولی سی چڑ ہوئی۔ مسکراہٹ سے خالی روکھے لہجے میں بولا۔ "خبردار اس بٹیا کو ہاتھ بھی لگایا تو میں کھڑا کھڑا سلگ جاؤں گا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی زور نہیں ہے، پہلے اس کی بات تو سنو۔"

باپ بیٹے دونوں ہی سوچ رہے تھے۔ وہ تو بغیر سنے ہی ندرا کی پیٹ کی یہی بات جانتے تھے۔ اگر وہ یہی بات پھیل گئی تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ راجہ جی کیا سزا دیں گے یہ وہی جانیں۔ یہ بچ تو ہنڈیاں میں ڈھکا رہنا ہی ٹھیک ہے۔ اور پھر سیٹھ تو پورا حسابی تھا۔ دل ہی دل میں سب جوڑ گھٹانا کر چکا تھا۔ اس بیچ لگ بھگ آدھا گاؤں تیڈا برہمن کی جھونپڑی کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا۔ جگمگ جگمگ کرتا نولکھا ہار سیٹھ جی کے داہنے ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔ دوسرا کوئی بھی راستہ نظر نہیں آیا تو گلے کی پوری طاقت سے تیڈا برہمن کی جے جے کار کرنے لگے۔ تو پھر رکے نہیں۔ پھر تو کہنا ہی کیا؟ بستی کے لوگ کیوں پیچھے رہتے۔ ایک ایک گلے سے تین تین گلوں کے برابر جے جے کاروں سے ہوا میں بھنور پڑنے لگی۔ تیڈا برہمن بار بار انھیں منع کرتا رہا، روکتا رہا۔ لیکن جوش میں چڑھی بستی اس کے روکنے سے کب رکتی۔ چمتکاروں کی حامی بھرنے والا تو کپٹی جعلساز اور شاطر ہوتا ہے۔ ایشور کے اونچے آسن تک پہنچا بندہ ہی خود کو چھوٹا کر کے مانتا ہے۔ سامنے تین تین کرشمے بتائے تب بھی انکار کر رہا ہے۔ شہرت سے بچنا چاہتا ہے۔

سیٹھ کا بیٹا تین چار حاشی موالی کے ساتھ حویلی تک بھاگتے بھاگتے پہنچا اور گاڑی دوڑاتے ہوئے لوٹا۔

بیلوں والی تھال میں گیارہ سومہریں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ جب سیٹھ نے اپنے تول کے مطابق نولکھا ہار اور مہرے تیڈا برہمن کو بھینٹ کرنے کی منشا ظاہر کی تو پورا گاؤں، بچے بچیاں جوان، بڑے بزرگ اور عورتیں سب کے سب جے جے کار بولنے لگے ناچنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ میراثنیں ڈھول بجانے لگیں۔ تیڈا برہمن کا منہ اتر گیا جیسے ماں کے انتقال کی خبر ابھی ابھی آئی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں آنسوؤں سے زیادہ درد اجاگر ہو رہا تھا۔ وہ دکھ آنسوؤں میں ظاہر ہونے جیسا تھا ہی نہیں۔ اس نے بار بار گذارش کی تب کہیں بھیڑ خاموش ہوئی۔ عمر بھر میں پہلی بار بھکاری

کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ''پہلے میری بات تو سنو پھر مرضی۔ وہ تو مجھے بھگوان مانو یا کوئی اوتار! مجھے عنایت کرنے کے بعد یہ نولکھا ہار اور مہریں میری ہو چکیں میں بہت خوش ہو کر یہ دونوں چیزیں ندرا کو سونپتا ہوں، آپ بھی جانتے ہیں کہ ندرا سیٹھ جی کی بیٹی ہے تب ان کی دولت میں اس کی اتنی ہی حصہ داری ہونی ہی چاہئے۔''

اس کے بغل میں ندرا جذباتی طور پر بولی'' آپ نے ایک دم انصاف کی بات کہی ہے باپ جی، اسی خاطر مجھے ایسی ترکیب سوجھی، میں سامان، جہیز اور گہنوں کی حقدار ہوں لیکن ان کے گھر والے تنکے جتنی بھی میری پرواہ نہیں کرتے، الٹے مجھے ہی برا بھلا کہتے ہیں۔ دھتکارتے ہیں، ایک بات اور ... ''

سیٹھ کا بیٹا بھی باپ کی طرح دل و دماغ لئے ہوئے تھا۔ اسی طرح کی سوچ رکھتا تھا۔ ندرا کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پھس پھسایا۔ ''اب چپ بھی رہ لکشمی۔ تیڈا جی بھگوان جو بھی حکم کریں گے، وہی کروں گا۔ زیادہ کھینچنے سے ٹوٹتی ہے۔''

''ٹوٹنے دو،'' پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے پنڈت جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔'' باپ جی یہ دونوں باپ بیٹے ایک ہی ہنڈیا کی ٹھیکریاں ہیں بستی کے پنچوں کو جیب میں رکھتے ہیں، جیب نہیں، مجھے بھروسہ صرف آپ کا ہے۔''

''نہیں بٹیا، میں تو غریب برہمن ہوں، تو بھروسہ کرے میری ایسی اوقات نہیں۔ سیٹھ کے ہاتھ سے عنایت کی ہوئی پونجی تجھے سونپی، ساری بستی کے سامنے، اب اس میں کچھ بھی جھنجھٹ نہیں ہے تو بالکل فکر مت کر۔''

اس بار گدھے والے کمہار کا بڑا بھائی بھاری گلے سے بولا۔ ''اب یہ فکر بستی کی ہے۔ کسی دوسرے کی پنچایتی یہاں نہیں چلی گی۔ لیکن آپ کا آسن تو بھگوان سے بھی اونچا ہو گیا۔ اتنی پونجی کے لئے موٹے موٹے دیوتا بھی مرنے مارنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پانچ گیارہ روپے کی بولواں (پرساد) نہیں چڑھاتے تو بے حد برا مانتے ہیں اور آپ نے ایک تنکے کی طرح سے تیاگ دیا۔ پھر ایشور یا پرمیشور کا طرہ تو لگا نہیں رہتا۔ اور طرہ کلغی لگے بھگوان تو مجھے پھوٹی آنکھ بھی نہیں سہاتے۔ جے بولو تیڈا بھگوان کی جے !''

لوگ باگ تو اتنی دیر کی خاموشی سے ہی اکتا گئے تھے۔ اس طرح کی منہ مانگی مراد ملتے ہی کون کس سے پیچھے رہنے والا تھا۔ منہ اور پاؤں بھلا کس دن کے لئے ہیں۔ جیسا جوش ویسے ہی

جے جے کاروں کی آواز تو رجواڑے کے یوم بنیاد کے دن میں بھی سننے میں نہیں آیا۔ اور دوسری طرف تیڈا برہمن جیسا۔ "دکھیا اور لاچار انسان دنیا کے وجود میں آنے کے بعد آج تک پیدا نہیں ہوا ہوگا، وہ اب کرے تو کیا کرے۔ نہ ویسی سوجھ بوجھ تھی نہ ویسی سمجھ۔ جب اپنے بل بوتے پر جو کے مرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے تب اس کے خلاف منشا کے مطابق سکھ کی امید کرنا کتنا مناسب ہے۔ اگر ہیرے موتی اور سونے میں سکھ ملتا ہے تو وہ اسے حاصل تو نہیں لیکن جھوٹ کے عوض میں ان کے لئے اپنے من کو کیوں کر بے چین ہونے دیتا۔ یہ تو بغیر سوچے ہی سمجھنے کی بات ہے۔ جب یہ چھوٹی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو اپنی عقل کا کیا چارہ الٹا۔ یہاں تو بولے پر بھی کوئی حل نکلتا نظر نہیں آیا۔ تب اس کے اندر کی خاموشی سے سنائی دے گی۔ آخر وہ اپنے من کی بات دوسروں کو سنانا ہی کیوں چاہتا ہے۔ وہ خود تو ہر لمحہ اس خاموشی کو سنتا ہی ہے۔ پھر خاموش رہنے میں کیسی گھبراہٹ، کیسی الجھن؟

اچانک اس بے پناہ شور اور جے جے کاروں کی آواز پر ایسی روک لگی کہ چاروں طرف سناٹا پھیل گیا۔ تیڈا نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ٹھکانے کے کامداری دھمکی سے جیسے چپ ہوگئی تو وہ سیٹھ جی کے پاس آکر کر کہنے لگا۔ "اتنی دیر کان پھاڑ دینے والی آواز سے ان داتا کا نشہ اتر گیا۔ وہ کب سے ہم پر آگ بگولہ ہو رہے ہیں۔ وہ بار بار غصے میں بلبلا رہے ہیں۔ کہ یہ اتنی سنتا تیڈا برہمن کب سے کرشمے بتانے لگ گیا؟ مٹی کے لئے اسے کہیں ٹھکانہ ملا۔ سر پر پانچ سات جوتے پڑتے ہی کرشموں کی پول کھل جائے گی۔ جب تک ان داتا اپنی آنکھوں سے سچ اور جھوٹ کی جانچ پڑتال نہ کرلیں وہ کسی شاطر کے بہکاوے میں نہیں آئیں۔ اگر حضور کے منشا کے مطابق چمتکار کر دیا تو ٹھکانے کے چند وسولہ گاؤں عنایت کر دیں گے۔ ورنہ کالے منہ اور نیلے پاؤں گدھے پر بٹھا کر دوسرے راجیہ میں بھگا دیں گے۔ کون نہیں جانتا جھوٹ اور مٹی کے نام سے ان داتا کی آنکھوں میں انگارے دہکنے لگتے ہیں۔ منھ لگا خواص کب سے مسالے لگا لگا کر تیرے کرشموں کا بکھان سنانے لگا تو چپ ہونے کا نام نہیں۔ حضور بار بار پوچھتے ہیں تو وہ بار بار دہرا تا رہتا ہے۔

تمام لوگوں کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ تیڈا برہمن کی بجھی بجھی مسکراہٹ واپس لوٹ آئی۔ میرے خیال سے جھوٹی شہرت کی بجائے ویش نکالا بہتر ہے۔ مجھے کچھ بھی اعتراض نہیں ہے۔ اب ایک پل کی ڈھیل مجھے کلیجے پر نشتر سی لگ رہی ہے۔ میرے کرشمے کی سچائی مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے؟ پھر بھی آپ نہ مانیں تو آپ کی مرضی۔"

اتنا کہہ کر وہ سیٹھ جی کے رتھ پر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ اب تو اس جھوٹ موٹ کی شہرت کی قابی تو کمل کر ہی رہے گی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑھنے لگی جیسے اس کی خواہش کے مطابق ساری مرادیں پوری ہوگئی ہوں اس طرح کے سرپھرے بندے تو پیدا اسی دنیا میں ہی ہوتے ہیں لیکن ایسا نرالا سانچہ تو مالک نے پہلی بار آزمایا ہوگا۔

گدھے والے کمھار کا بڑا بھائی بھیڑ کو سمجھانے لگا۔ ''بڑے انسانوں کی بڑی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ایک کے بعد ایک تین کرشموں کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر ان پر ہم یقین کیوں نہ کریں۔ ہماری اپنی سچائی ہمارے سامنے ہے۔ ان داتا کی سچائی ان داتا مانیں۔ ہمیں چپ رہنے کی ضرورت کیا ہے۔'' ڈھول بجاتے ناچتے کودتے چلو، اس ٹھکانے کی بنیاد کے بعد آج تک ایسے کرشمے سننے کو نہیں ملے۔ بولے۔ زور سے بولو۔ تیڈا بھگوان کی جے، جے، جے،.....''

لوگ باگ تو جیسے اس کے کہنے کی راہ ہی دیکھ رہے تھے۔ ہر انسان کی زبان پر جیسے پنکھ نکل آئے۔ حضور کا حکم ماننے کے بعد بڑے بھائی کو خواب میں بھی ایسی امید نہیں تھی کہ وہ دکھیا برہمن اتنا مطمئن اور بے خوف ہو جائے گا۔ بھیڑ کی جوش کو بھلا کون پہنچ سکتا ہے؟ رتھ کے پاس آکر دوگنے جوش کے ساتھ جے جے کار کرنے لگا۔ آپس میں ایک دوسرے کی آنکھیں ملتے ہی ایک دوسرے کی مسکراہٹ کا راز کسی سے چھپا نہیں رہا۔ انسان انسان کی سمجھ میں فرق ہوتا ہے کیا۔ تیڈا برہمن دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

قالین بچھی سنگار چوکی پر ٹھاکر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ جے جے کاروں کا آسمان چھوتا شور قریب آتا سنائی دینے لگا۔ حضور کے غصے کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ کیسی گنوار رعیت سے پالا پڑا ہے۔ سمجھتی نہیں سنتی نہیں، پوچھتی نہیں، آنکھیں بند کر کے کسی انہونی بات پر یقین کر لیتی ہے۔ ایسی سمجھ میں نہ آنے والے ڈھور بھی نہیں ہوتے۔ آج اس فقیر برہمن کی خیر نہیں ہے۔ اگلے جنم میں بھی کرشموں کی سنک کا ہٹ بھی کرلے تو ان کا نام جانتا ہی ہے۔ مگر مایا پتی سیٹھ جی کو ناراض کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ وہ تو ضرورت پڑنے پر دیش کے راجہ کا بھی کام کرتے ہیں۔ جب تب تنگی کی گھڑی میں اچھی خاصی عزت بچائی ہے۔ نولکھے ہار کا تکا پار پڑ گیا تو پڑ گیا۔ لیکن وہ تو اپنی آنکھوں کے سامنے صحیح بھید جاننے پر ہی بھروسہ کریں گے۔ جس کے کبھی دھوکے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اب دیر ہی کیا ہے۔ مگر صحیح جانکاری سے پہلے قالین پر بٹھانے سے سیٹھ جی خوش ہوں گے۔

گڑھ کے اندر داخل ہونے پر بھی جے جے کاروں کی آواز دھیمی نہیں پڑی مگر حضور کے

ہاتھ کا اشارہ ملتے ہی لوگوں کے ہونٹ جیسے چپک گئے۔ سیٹھ اور تیڈا برہمن تخت سے اتر گئے تھے۔ تیڈا تو ایک دم بدھو تھا۔ لوک بیوپار سے بالکل نابلد۔ لیکن سیٹھ جی تو سولہ پاٹھی پڑھے ہوئے تھے ان سے تو خواب میں بھی ایسی چوک نہیں ہوتی جس سے بڑے آدمی ناراض ہوں۔

کام دار کے کہتے ہی سیٹھ جی کے ساتھ ساتھ تیڈا برہمن بھی پاٹھ کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ کچھ بولنے کے لئے سیٹھ جی کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے تو حضور نے بے تابی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے ایک بھی کرشمے کی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ کمہار کے گدھے سے لے کر نوکھے بار تک۔ مگر تیڈا نے ایک بھی کرشمے کے لئے حامی نہیں بھری۔ وہ تو برابر منع کرتا رہا۔ جس کی وجہ سے مجھے وہم ہوتا ہے۔ ہر لمحہ چوکس رہے بغیر اتنا بڑا ٹھکانہ سنبھالنا آسان نہیں ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک سب کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔۔ تھوڑا صبر رکھا بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

ہر طرف سے ایک ساتھ گھما گھری (نمستے) کی آواز اٹھی۔ پھر سیٹھ جی پیچھے رہنے والے کب تھے۔ ان سے جانے انجانے کوئی چوک ہوتی ہی نہیں تھی۔۔ لیکن سرپھرے برہمن کے ہونٹ اسی طرح بند رہے۔

گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اچانک یہ کیا تماشہ ہوا! حضور کو اس کا مزاج بہت بے ہودہ لگا۔ بے چارے کا شاہی شان و شوکت سے کب واسطہ پڑا تھا۔ اندھے یا انجانے پر کیا غصہ کرنا۔ ایک لمبی کھنکار کے بعد ڈھکن لگے چاندی کا لوٹا ہاتھ میں لے کر کہنے لگے۔ ''ڈھیر سارے موجود لوگوں کے بارے میں میرے علاوہ۔ چڑیاں کے بچے کو پتہ نہیں کہ اس میں کیا ہے۔ ہاتھی گھوڑا اونٹ تو شاید ہی، اتنی سمجھ تو جنم سے دھیارے برہمن کو بھی ہونی چاہئے۔ اس طرح مزیدار باتیں سنا کر ٹھا کر صاحب زور زور سے ہنسنے لگے تو کافی دیر تک ہنستے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ ''اگر یہ کنگال اور مورکھ برہمن لوٹے میں چھپی چیز کا نام بتا دے تو سولہ گاؤں کی وصیت کردوں گا ورنہ کالا منھ نیلے پاؤں کرنے پر گدھے کی سواری کے لئے تو تیار رہے۔''

اسے تو کچھ جواب دینا ہی نہیں تھا۔ دوسرے کے طعنوں تشنیع اور بدنامی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اپنی مرضی کے مطابق ہی جینے کا عادی تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح بند کرلیں۔ پھر بھی بے حد تعجب کی بات ہے کہ حضور کے کڑوے بول سن کر بھی اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑنے کے بجائے اور چمکنے لگی۔ جیسے کسی نئے سورج کی کرن اس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی ہو۔ ٹھا کر صاحب کے غصے کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ جیسے وصیت کے مطابق ایک سو آٹھ گاؤں

ایک ساتھ ہی اجڑ گئے ہوں لیکن لوٹے کا راز کھولے بغیر وہ اپنے قول سے بندھے ہوئے تھے۔

اور ادھر آنکھیں بند کرنے کے بعد تیڈا برہمن اندر ہی اندر گرجتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں سے الفاظ اپنے آپ ابھرنے لگے جس کا اسے کچھ بھی احساس نہیں تھا۔ تیڈا اب تو مرنے کے سوا تیری آفت مٹنے والی نہیں ہے۔ کیسے میرے جال میں پھنسا ہے!۔

اس کے الفاظ سن کر حضور عالی ایکدم چونک اٹھے جیسے دونوں کانوں میں بڑوں کے ڈنک چبھے ہوں یا بری خبر ملی ہو۔ ایک ہلکی کھنکار کے بعد دھیمے سے پوچھا۔ ''کیا کہا تو نے؟ ایک بار پھر سے کہنا۔!''

ٹھاکر صاحب کے بول جیسے اس نے سنے ہی نہ ہوں مگر اس نے بالکل انجانے میں وہ الفاظ پھر دہرائے۔ ''تیڈا! اب تو مرنے کے سوا تیری آفت مٹنے والی نہیں ہے، کیسے برے جھمیلے میں پھنسا ہے۔''

وہ بول سنتے ہی ٹھاکر صاحب نہ جانے کیا سوچ کر جلدی سے پاٹ پر کھڑے ہوئے اور زور زور سے کہنے لگے۔ ''یہ پگا برہمن تو سچ مچ سہدیو جی سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ تمام اہلکار سے چھپا کر ایک ٹیڈ (ٹڈا) کو پکڑا اور میں نے ہی اس لوٹے میں ڈال کر ڈھکن بند کر دیا۔ میرے علاوہ اور کسی کو اس بھید کا پتہ نہیں ہے۔ میرے دل میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں ہے۔ بھگوان کے علاوہ ایسا کرشمہ بھلا کون کر سکتا ہے؟''

یہ آخری جملہ سنا کر ٹھاکر صاحب نے اپنے ہاتھ سے لوٹا اوندھا کیا، ایک ادھ مرا سا ٹیڈ (ٹڈا) قالین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ ہلکے سے پنکھ بھی نہیں پھڑ پھڑا سکا۔ ان داتا نے پھر کھنکار کر حکم سنایا۔ ''کامدار جی اب ایک لمحے کی بھی ڈھیل مت کرو، پاپ کا بوجھ لگاتار بڑھتا ہی جائے گا۔ سولہ گاؤں کی وصیت اسی وقت لکھ ڈالو، تب تک یہاں کے لوگ سیٹھ جی اور میری رعیت میرے ساتھ جے بولنے میں کسی طرح کی کمی نہیں رکھے۔ سبھی مل کر ایک ساتھ جے بولو۔ ......تیڈا بھگوان کی جے۔ ایسی چھوٹ ملنے پر کون چپ رہتا؟ علاقے کے چاندنی چوک میں اس آسمان چیرتے جے جے کی آواز سن کر ٹھاکر خوشی کے مارے ایسا گمان ہوا جیسے آج ہی انھیں یہ جاگیر عنایت ہوئی ہو۔ مگر غریب برہمن کی آنکھیں بھر آئیں ان کے چہرے پر کسی انہونے حادثے کی گہری پرچھائیں چھائی۔ جیسے تیسے بڑی مشکل سے کھڑا ہو کر علاقے کے سوامی سے روبرو بات کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میری بات کا مطلب سمجھنے میں آپ سے بڑی بھول ہو گئی لوٹے کے اندر چھپے ٹیڈا (ٹڈا) کا مجھے خواب میں بھی علم نہیں تھا۔ میں تو اپنی ہی مصیبت کی آگ میں سلگ رہا تھا کہ

جھوٹی شہرت کے اس فریب سے زندگی کے بجائے مرنا بہتر ہے۔ مجھے پختہ جھنک لگ گئی تھی کہ موت کے بغیر اس سرانڈ بھری زندگی سے چھٹکارا نہیں ہے۔ میں بستی کے ناسمجھ لوگوں کے نہ دکھائی دینے والے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ نہ مجھے بھگوان کی برابری کی جھوٹی شہرت چاہئے اور نہ ہی سولہ گاؤں کی بجائے ایک بھی کھیت کی بخشش۔ مجھ سے زیادہ سکھی انسان دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن بستی کے لوگوں نے میرا جینا حرام کردیا۔ میں جسے سکھ مانتا ہوں اس میں نہ سولہ گاؤں کے علاقے سے اضافہ ہوگا نہ نو لکھے ہار سے اور نہ ہی گیارہ سومہروں کی چمک سے اس کی عزت بڑھے گی۔ انسان تو اپنے اجالے کی جگمگاہٹ سے ہی سہانا لگتا ہے۔''

بھولا برہمن منع کرے تو کرنے دو، اس کی اپنی موج ہے۔ بے چارے نے اس زندگی میں سکھ کی چاشنی کا ذائقہ ہی کہاں چکھا۔ اگر کیچڑ کے سور نے کھیور کا ذائقہ لیا ہوتو وہ بدبودار گندگی میں اپنی تھوتھنی گھسائے ہی کیوں؟ ساری دنیا بے وقوف اور یہ اکیلا ہی سمجھدار کی پونچھ بنا ہوا ہے۔ اپنی مرضی سے مان لیا جائے تو اچھا ہے ورنہ بستی منوانا جانتی ہے، اچھی طرح جانتی ہے۔ اس سے پہلے بڑے بڑے طاقتوروں کو منوا کر چھوڑا ہے۔ ٹھاکر صاحب کو تو اس بے مثال انصاف کے بدلے جیسے چک ورتی راج مل گیا ہو۔ پورے جسم کی طاقت لگا کر وہ چیخے۔ ''بولو، بھلیو، بیڑا بھگوان کی جے!'' بھیڑ کے الگ الگ گلے جیسے ایک ہی بڑا درہ بن گئے ہوں جس کی بے تحاشا اونچی آواز پوری فضا میں بازگشت کرنے لگی۔

اپنا ذرہ برابر بھی بس نہ چلتے دیکھ کر بے چارے برہمن نے پورے زور سے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر واپس کھلی ہی نہیں لیکن اسے اس بات کا پورا اطمینان تو ضرور ہوا کہ اس اچھی ساعت کے بعد جھوٹی شہرت کی جے کاریں دوبارہ کبھی سنائی نہیں دیں گی۔ وہ اپنی موج میں اپنے حساب سے جیا اور لوگوں کی ناسمجھی کے نتیجے میں اسے اپنی مرضی کے خلاف انسان کی زندگی چھوڑنی پڑی مگر وہی اس کا اپنا نروان تھا۔

☆☆☆

سنتھالی کہانی

آخری امتحان

کرشن چندر ٹوڈو

ایک دن ڈاکٹر مدن ٹوڈو ایک برتوہار کے ساتھ لڑکی دیکھنے سگاڈیہہ گاؤں گیا۔ لڑکی دیکھنے کے بعد گھر لوٹتے وقت ڈاکٹر مدن نے کہا۔ ''اس دنیا کو بنانے والے بھگوان ہی جانتے ہیں کہ کون سا انسان کس طرح سجانے سے خوبصورت لگتا ہے۔ وہ اسے اسی حساب سے سجاتے، بناتے، سنوارتے اور شکل وصورت عطا کرتے ہیں۔''

اس بات کو سن کر رائے بار نے کہا۔ ''اس دنیا کو بنانے والے نے سبھی کو الگ الگ شکل و خوبی دی ہے۔ زندگی دی ہے لیکن کچھ لوگ اپنی شکل اور خوبی کی قطعی پرواہ نہ کرتے ہوئے برا کام کرتے ہیں اور آخر میں انھیں سزا بھی ملتی ہے۔''

رائے بار اور ڈاکٹر مدن بڑی بڑی باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے راستے چلے گئے۔ ڈاکٹر مدن اپنے گھر جانے کے لئے جھوراڈیہہ بس اسٹینڈ گیا۔ بہت دیر تک بس اسٹینڈ پر کھڑے رہنے کے بعد بھی وہاں ایک بھی گاڑی نہیں آئی تب ڈاکٹر مدن بس اسٹینڈ کے پاس واقع ایک موڑا دکان کے پاس گیا اور دکاندار سے پوچھا۔ ''ٹاٹا جانے لئے بس کب آئے گی؟''

موڑا دکاندار نے بتایا۔ ''آج گاڑی نہیں چلے گی۔''

ڈاکٹر مدن نے کہا۔ بھائی ذرا یہ تو بتایئے آج گاڑی کیوں بند ہے؟''

دکاندار نے کہا۔ ''بابو آپ اس پرچے کو پڑھئے، آج ویر جنگل سنتال نے گاڑی بند کا اعلان کیا ہے کہ سبھی گاڑی بند رہیں گی۔''

یہ کہہ کر دکاندار نے ڈاکٹر مدن کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھمادیا۔ ڈاکٹر مدن نے پرچہ پڑھا۔ پرچہ میں لکھا تھا۔ ''سبھی بھائی بہنوں کو نمستے! اس ہندوستان میں ہم سب آدی باسی، ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی، بودھ بھائی بھائی ہیں ہم سبھی بھارت ماں کی اولاد ہیں۔ ہم سبھی ہندستانی زمین کے باشندے ہیں، ہماری نہ کوئی ذات ہے نہ چھوا چھوت، نہ بھید بھاؤ، اس دیش میں ہم لوگوں کو

کوئی نہیں بانٹ سکتا، اس لئے بھی بھارت واسیوں کو نام کے ساتھ گوتر نہیں لکھنا چاہئے۔ اس بات کو سرکار سے منوانے کے لئے آج گاڑی بند رہے گی۔''المعلن: پدوی اُن مولن سنگھ ونا نچل''

کچھ دیر بعد مائنوں بھی ایس جھوراؤ یہ بس اسٹینڈ پر آئی ڈاکٹر مدن کو دیکھتے ہی مائنوں نے حیرانی سے کہا۔ کیا آپ لوگوں کو ابھی تک گاڑی نہیں ملی؟'' دکھی من سے ڈاکٹر مدن نے کہا۔'' ہاں ابھی تک گاڑی نہیں ملی، شاید آج گاڑی بند ہے۔!''

یہ سنتے ہی جھٹ سے مائنوں نے کہا۔'' تب آج میں ماما کے گھر نہیں جاؤں گی، گھر واپس چلی جاؤں گی۔'' اس کی بات سن کر ڈاکٹر مدن نے کہا۔'' تم تو اپنے گھر لوٹ جاؤ گی لیکن میں کہاں جاؤں گا؟'' مائنوں نے کہا۔'' مجھے کیا معلوم آپ کہاں جائیں گے؟ کہاں رہیں گے؟ میں کیسے بتا سکتی ہوں؟''

ڈاکٹر مدن نے کہا۔'' کیا آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں گی؟ کیسا رہے گا؟''

'' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر آپ میرے ساتھ میرے گھر جائیں گے تو سماج کے لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ کیا سوچیں گے؟ سماج کا آپ کا کیا کہہ کر تعارف کراؤں گی۔؟'' مائنوں نے کہا۔

مائنوں کی بات سن کر ڈاکٹر مدن بولا۔'' جو جی میں آئے وہی کہہ دینا۔''

مائنوں بولی۔'' ایک راستہ نکل سکتا ہے۔''

'' کون سا راستہ؟'' ڈاکٹر مدن نے تجسس سے پوچھا۔

'' راستہ تو آپ کے تعارف کا ہی ڈھونڈنا ہے۔، آپ کا تعارف میں ایک رشتہ دار کی حیثیت سے، ایک نوکر کی حیثیت سے یا ایک شوہر کی حیثیت سے کرا سکتی ہوں، اب آپ ہی بتایئے ،سماج کے سامنے آپ کا کیسا تعارف دوں؟''

مائنوں کی بات سن کر ڈاکٹر مدن چپ رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔'' یہ میرا آخری امتحان ہے۔'' ایم بی بی ایس امتحان میں کامیاب لڑکا مائنوں کے سوال کا جواب دینے کے لئے سوچنے پر مجبور تھا۔ آخر کار وہ بولا۔'' مائنوں میں تو تمھارا کوئی رشتہ دار نہیں ہوں اس لئے تم سماج کے سامنے ایک رشتہ دار کی حیثیت میں میرا تعارف نہیں دے سکتی۔ بغیر رشتہ داری کئے، خاندان کا فرد کہلانا سماج کے لئے ایک کلنک ہے۔ اور پھر میں تو پڑھا لکھا لڑکا ہوں۔ میرے پاس ڈاکٹر کی ڈگری بھی ہے۔ ایک نوکر کی شکل میں میرا تعارف کرانے کا مطلب ہے ڈگری کی ذلت کرنا''

اب مائنوں کا آخری سوال بچا تھا ۔ایک شوہر کی حیثیت سے تعارف کرانا، کچھ دیر سوچنے کے بعد ڈاکٹر مدن نے کہا۔''مائنوں تم میرے دل کی بات جاننا چاہتی ہو تو سنو، میں تمھیں اپنی بیوی کے روپ میں قبول کرنا چاہتا ہوں، تم میرا تعارف ایک شوہر کی حیثیت سے دے سکتی ہو ؟''

ڈاکٹر مدن کی بات سنتے ہی مائنوں نے کہا۔''بغیر شادی کئے آپ شوہر کیسے ہو سکتے ہیں ؟ آپ تو پڑھے لکھے ہیں آپ کے پاس ڈگری ہے لیکن میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔ پھر بھی مجھے معلوم ہے بغیر شادی کئے کوئی میاں بیوی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو چلئے اس پیپل کے پیڑ کے پاس وہاں ایک دیواستھل ہے، وہاں ایک پجاری بھی ہے، پجاری ہماری شادی کرا دیں گے اور بھگوان کو گواہ مان کر آپ میری مانگ میں سیندور بھر دیجئے۔''

ایسی بہت سی باتیں ہوئیں۔ آخر میں وہ دونوں پیپل کے پیڑ کے نیچے واقع دیواستھل گئے اور پجاری سے کہا۔''پجاری جی! آپ ہم دونوں کی شادی کرا دیجئے۔''

پجاری نے کہا۔''ٹھیک ہے، تم دونوں کی شادی کروا دیتا ہوں۔''

تینوں دیوالے میں داخل ہوئے۔ پجاری نے ڈاکٹر مدن اور مائنوں کو ایک صف میں کھڑا کیا اور دونوں کے ہاتھوں میں اروا چاول اور پھول کی مالائیں رکھ دیں۔ پوجا ارچنا کی، پوجا ختم کرنے کے بعد پجاری نے ڈاکٹر مدن اور مائنوں کو اپنے اپنے گاؤں، نام، گوتر، ذات اور مذہب کے بارے میں پوچھا۔ یہ بات سنتے ہی ڈاکٹر مدن نے کہا۔''پجاری جی، آپ تو اس دیوالے کے پجاری ہیں، آپ تو برہمن ہیں۔ آپ کے پاس تو دھرم ادھرم کی بات ہونی چاہئے تھی، لیکن آپ ہم سے ذات اور گوتر کا نام پوچھ رہے ہیں۔؟ یہ کتنی حیرت کی بات ہے۔ اس دنیا میں مذہب ذات کے نام پر ہم اور کتنے دن تک لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔''

ڈاکٹر مدن نے مائنوں سے کہا۔''مائنوں یہاں سے چلو۔ اس پجاری کے سامنے ہمارا دواہ نہیں ہو سکتا چونکہ یہاں ابھی بھی ذات پات، چھوا چھوت، مذہب کی باتیں ہوتی ہیں۔ چلو ہم دونوں اپنے گاؤں چلیں، وہیں ہمارے گاؤں کے پردھان اور پنچ کے سامنے شادی ہوگی۔''

مائنوں بولی۔''ہاں آپ کی بات صحیح ہے لیکن اس دیوتا کے سامنے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے اروا چاول ار پھول مالائیں ہم کیسے پھینک دیں۔ میں اس بھگوان کو گواہ مان کر تمھارے گلے میں پھول مالا پہنا رہی ہوں۔ میں تمھیں پتی کے روپ میں قبول کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مائنوں نے ڈاکٹر

مدن کے گلے میں پھول مالا پہنا دی۔ تب ڈاکٹر مدن نے بھی مائنوں کے گلے میں پھول مالا ڈال دی، بھگوان اور پجاری کو سلام کر کے دونوں نے رخصتی لے لی اور وہاں سے وہ لوگ چلے گئے۔

راتوں رات دونوں جنگل کی پگڈنڈی کے راستے سے راج دوہا گاؤں پہنچ گئے۔ صبح ہوتے ہی ڈاکٹر مدن مائنوں کو اپنے گھر لے آیا۔ ڈاکٹر مدن نے اپنی ماں کو مائنوں کے ساتھ اپنی شادی کی ساری بات بتائی۔ اس کی ماں نے ڈاکٹر مدن کی بات سن کر کہا۔ ''بیٹا جو کام تمھارے باپ کے ساتھ مجھے کرنا چاہئے اس کام کو تم نے پورا کیا، یہ کتنی خوشی کی بات ہے، پھر میں بھی جاننا چاہتی ہوں بیٹا، بہو کس گاؤں کی ہے اور وہ کس کی بیٹی ہے؟''

ڈاکٹر مدن نے کہا۔ ''ماں! لڑکی ۔گاہ ڈیہ گاؤں کی ہے۔ ان کے باپ کافی مالدار ہیں۔ ان کے گھر کئی گائے بیل ہیں۔ چاروں طرف کھپریل گھر ہیں۔ زمین جائداد بھی کافی ہے۔''

ڈاکٹر مدن کی ابت سن کر اس کی ماں نے کہا۔ ''کیا لڑکی سادھو بابا گھر کی ہے؟''

''ہاں ماں! لڑکی سادھو بابا کی چھوٹی بیٹی ہے۔'' یہ سن کر روتے ہوئے اس کی ماں نے کہا۔ ''بیٹا تم نے کیا کیا؟ یہ لوگ تو گونڈوار گوتر کے ہیں گونڈوار گوتر سے ہمارے ٹوڈو گوتر کی شادی نہیں ہوتی۔''

ماں بیٹے کی بات سن کر مائنوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آنچل میں اپنا منھ چھپالیا۔ تب ڈاکٹر مدن دوڑ کر مائنوں کے پاس گیا اور بولا۔ ''مائنوں کہو اماں نے جو بات کہی وہ سچ ہے؟'' تب مائنوں نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یہ بات سچ ہے، ہم لوگ سنتال سماج میں گونڈوار گوتر کے ہیں۔ گونڈوار گوتر کے نام سے سماج میں جانے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں سے درسرے گوتر والے شادی کا رشتہ نہیں جوڑتے، آپ تو پڑھے لکھے ہیں میں آپ سے دو سوال پوچھتی ہوں۔ پہلا سوال ہے۔ سنتال سماج میں کتنے گوتر ہیں اور ان کے نام کیا کیا ہیں؟ سماج میں بیسرا کے ساتھ کس کو، ٹوڈو کے ساتھ بیسرا اور چنیڑ ے کے ساتھ ٹوڈو کے بیچ شادی کا رشتہ کیوں نہیں ہوتا ہے؟ دوسرا سوال ہے کہ سنتالوں کا جنم کہاں اور کیسے ہوا تھا؟ انسان کا جنم ہنس ہنسی چڑیا سے ہوا تھا یا مُرغیوں سے یا دوسرے جانوروں سے۔'' مائنوں کے ان سوالوں کو سن کر ڈاکٹر مدن کی ماں نے کہا ۔''بیٹا مدن! بہو آج جو سوال تم سے پوچھ رہی ہے، یہ بہت اہم سوال ہے بیٹا، ہم نے تمھیں بڑی تکلیف اور لاچاری سے پالا ہے اس لئے میں تمھیں پھر سے پڑھنے کے لئے اور تحقیق کے لئے اجازت اور موقع دیتی ہوں اور تحقیق کر کے یہ ثابت کرو کہ سماج میں ایسے حالات کب تک بنے

رہتیں تھے۔ ایسے برے رسم ورواج سماج کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے بد دعا ہے۔ بیٹا یہی تمہارا آخری امتحان ہے۔"

ماں نے پھر کہا۔ "بیٹا جاؤ بہو کو میرے سامنے لے آؤ! آج سماج کے سامنے بہو اور بیٹا کے روپ میں میں تم دونوں کے پاؤں دھوؤں گی اور گونڈوار کی بیٹی کو بہو کے روپ میں قبول کروں گی۔"

ان باتوں کو سن کر گاؤں کے پردھان اور پنچ نے ماں کی باتوں کو سراہا۔ ماں نے ڈاکٹر مدن اور مائنوں کے پیر دھوئے اور دونوں کو گھر کے اندر لے گئیں اور خوشحال دنیا بسانے کے لئے اسے دعائیہ کلمات کہے۔

☆☆☆

سنتالی تخلیق کار کرشن چندر ٹوڈو کی پیدائش ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ ان کے ناٹک کہانی، شاعری مستقل اہم رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

دل دیجئے دل والوں کو

گوبند مالہی

پہلی لوکل ٹرین کے آنے میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔ میرا میزبان مجھے الہاس نگر کے اسٹیشن پر چھوڑ کر چلتے بنا۔ رات کا تیسرا پہر گذرنے پر اس طرح مجھے اکیلا چھوڑ جانے کے لئے اس سے زیادہ ذمہ دار میں اپنے آپ کو مانتا تھا۔ اس نے تو بہت کہا تھا۔ "رات بھر یہیں رہ جاؤ صبح اٹھ چلیں گے لیکن میں ہی نے نہیں مانا، اس سے کہا مجھے جگہ بدلنے سے نیند نہیں آتی۔ اس کے سوا کل صبح نو بجے کوئی آدمی جو جبلپور سے بمبئی آئے ہیں۔ مجھ سے ملنے میرے گھر پر آرہے ہیں۔" اسٹیشن پہنچ کر اس نے چاہا تھا کہ جب تک گاڑی آئے تب تک میرے ساتھ رہے۔ مگر میں نے ہی اسے جیسے دھتکار کر واپس بھیج دیا۔ اس سے کہا۔ " تم کیوں میری وجہ سے آدھ پون گھنٹے کے لئے اپنی نیند خراب کر رہے ہو۔ یہ تو سنٹرل ریلوے کی ٹرین ہے، آدھا پون گھنٹے لیٹ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے بالکل رد ہو جائے۔ اس کے علاوہ تمھاری اور میری دوستی کی سزا بھابھی اور بچے کیوں بھگتیں۔" آخر میں وہ "آسرو نام جی" (آسرا نام کا) کہہ کر چلا گیا۔

اس کے پہلے پتہ نہیں کتنی بار الہاس نگر سے گاڑی پکڑی ہوگی مگر اس دن وقت سے کافی پہلے اسٹیشن پہنچ گیا تھا اس وجہ سے اسٹیشن لگ بھگ سنسان تھا۔ کچھ تھوڑے سے لوگ جو پہلے ہی وہاں موجود تھے ان میں سے کچھ تو بیٹھے بیٹھے جھپکی لے رہے تھے۔ یا لیٹے ہوئے تھے۔ دو چار تو خراٹے لے رہے تھے۔

میں لیمپ پوسٹ کے نیچے بنے ہوئے گول چبوترے پر بیٹھ گیا۔ پہلے سوچا کہ چائے پی لی جائے، پھر خیال آیا کہ اس سے تو وہسکی کا ذائقہ اور اثر کم ہو جائے گا، اس کے علاوہ گاڑی میں بھی تو بیٹھے بیٹھے تھوڑی بہت اونگھ لوں گا۔ چائے سے تو   اچانک میں چونک اٹھا۔

"یہ! اس وقت! یہاں!!! اس حال میں   "

وہ چبوترے کے پیچھے والی بینچ پر سوئی ہوئی تھی۔ وہاں روشنی اتنی صاف نہیں تھی کہ جتنی اس چبوترے پر، اور اس کے چہرے میں بہت فرق آ گیا تھا۔ اسے پہچاننے کے لئے مجھے اس کے چہرے کو دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ چہرہ کالا کلوٹا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی کچھ سوجا سا بھی لگ رہا تھا۔ سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں پھر بھی بڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ پہلی جیسی کشش کرنے والی چمک اب بھی ان میں؟ لیکن پختہ طور پر کہہ نہیں سکا۔ لیکن وہ ایسی نہیں لگ رہی تھی جس سے کہ کوئی بھی یہ یقین کر سکے کہ جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ سارے گاؤں کی ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کی حسینہ جانی جاتی تھی۔ وہ گوری چمڑی، خوبصورت نین نقش اور سڈول جسم کا انوکھا سنگم تھی۔ اس نے کروٹ بدلی۔ اس پتلی تنگ بینچ پر جیسے تیسے کروٹ لی تو وہاں کی دھیمی مدھم روشنی میں اس کی گردن کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا اس پر ایک سفید داغ تھا، کافی بڑا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

اور میں جب چھوٹا تھا، ابھی بچہ ہی تھا، ہر ایک مجھ سے یہی پوچھتا تھا۔ ''شادی کروگے؟'' میں جواب میں کہتا تھا۔ ''میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔'' اور میرے اس زوردار انکار کی وجہ سے ہی ہر ایک یہی سوال دہراتا تھا لیکن جب بھی اسے دیکھتا تھا تو اس سے شادی کا نہیں مگر اس کے پاس بیٹھا اسے ایک ٹک نہارنے کی خواہش ضرور ہوتی تھی۔ وہ میری بہن کی پکی سہیلی تھی، ساتھ پڑھتی تھی، اسکول ساتھ جاتی تھی اور وہاں سے لوٹتی بھی ساتھ ساتھ تھی۔ دونوں کے ماں باپ نے دونوں کو پانچویں درجے تک پہنچتے ہی ایک ساتھ اسکول سے نکلوا دیا تھا۔ میں دونوں کے بیچ قاصد تھا۔ روز ہی ان کے درمیان چٹھیوں کا آنا جانا ہوتا تھا۔ مجھے خط پڑھنے کا دل کرتا تھا لیکن میں نے کبھی امانت میں خیانت نہیں کی۔ شام کے دھندلکے کے بعد میری بہن سر پر دوپٹہ ڈال کر اور مجھے ساتھ لے کر اس کے گھر جاتی تھی۔ دونوں سہیلیاں گھنٹوں بک بک کرتی رہتی تھیں۔ میں ساتھ والے گھر میں اپنے ہم مکتب کے ساتھ لوڈو کھیلتا تھا یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔

اسٹیشن پر لوگوں کی بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔ وہ پہلی گاڑی مچھلی بیچنے والوں کی گاڑی مانی جاتی تھی۔ میرے پاس بھی مچھلی کی ایک ٹوکری پہنچ گئی اور ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اس ٹوکری کا مالک۔ ویسے تو میں وہ چبوترہ ہی چھوڑ کر چل دیتا لیکن اس دن صرف تھوڑا سا ہٹ گیا۔

اس نے پھر کروٹ لی۔ دو چار بیڑیاں گر پڑیں۔ اس کے بلاؤز کی پھٹی ہوئی جیب میں سے سینے کا کچھ حصہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ بچپن میں میں نے من ہی من میں اس

کے تن کرتے کے اندر جھانکا تھا پتہ نہیں کتنی بار!

وہ کپڑے اونچے چمک دار اور اچھے سلے ہوئے پہنتی تھی۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ کپڑا میرے باپ نے بھیجا ہے...... یہ دوپٹہ بھی میرے باپ نے بھیجا ہے...... کون سا کپڑا مجھ پر جچتا ہے، یہ میرے باپ کو پتہ ہے۔

لیکن برسوں اس کے باپ کو اس کے گھر جاتے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اور جب میں نے اسے دیکھا تو پھر اکثر روز ہی دیکھتا تھا۔ تب وہ اپنے گھر میں نہیں بلکہ اپنے گھر سے دو چار مکان دور شاہ کی حویلی کے سامنے والی بیٹھک میں ہوتا تھا۔ وہ بیڑی پیتا تھا۔ اپنی عقلمندی ظاہر کرنے کے لئے کبھی بھی حقہ نہیں پیتا تھا وہ اس بیٹھک سے باہر ہی نہیں نکلتا تھا۔ اس کے پاس ایک نوکر تھا۔ وہ کام کاج کے ساتھ اسے گھر سے روٹی بھی لا کر دیتا تھا۔

وہ گاؤں میں ابھی آیا بھی نہیں تھا کہ میرے ایک ہم مکتب نے مجھے بتایا تھا کہ ''روکی کا باپ انجینئر ہے، بیوی سے ان بن ہے کئی برسوں سے، اسی سے وہ یہاں نہیں آتا۔ اس کے نین نقش زیادہ تر روکی سے کافی ملتے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی روکی کی طرح بڑی اور چوڑی چمکتی آنکھیں، جہاں وہ روکی کی آنکھوں میں کشش کے باعث تھیں وہیں وہ جیوت رام کے سنہرے فریم والے چشمہ کے اندر سے بھی شرارتی لگتی تھیں۔

وہ شرارتی تھا بھی۔ ہر روز سنتے تھے کوئی نہ کوئی ہریانوی عورت اس کی بیٹھک میں کچھ گھنٹوں کے لئے آیا ہی کرتی۔

ہندو عورتوں اور لڑکیوں نے تو اپنے آپ ہی خود پر پابندی لگا کر اس کی بیٹھک کی طرف سے گزرنا ہی بند کر دیا تھا۔ مہاراج بھگتن داس کا گھر اس کی بیٹھک سے ملا ہوا تھا۔ وہ جنم پتریاں بھی پڑھتا تھا اور ٹونے ٹوٹکے بھی بتاتا تھا۔ وہ زیادہ تر گھر ہی بیٹھا رہتا تھا اور زیادہ تر عورتیں ہی اس سے پھونکے ہوئے دھاگے یا تعویذیں لیتی تھیں۔ اس زمانے میں عورتیں بازار سے نہیں گزرتی تھیں لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں جیوت رام پر نظر نہ پڑ جائے آنکھیں نکالے اس لئے بچ بچا کر بازار پار کر کے بڑا سا چکر کاٹ کر مہاراج کے پاس جانے لگی تھیں۔

روزانہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جب گھر کے دوسرے سب جھلی (کپڑے کا پنکھا جو نوکر رسی کھینچ کر جھلاتے تھے۔) کی ہوا میں سوتے تھے۔ میں گھر سے نکل کر جیوت رام کی بیٹھک لانگھ کر شاہ کی بیٹھک میں جا کر اکبر علی سے باتیں کرتا تھا۔ شاہ کی بیٹھک میں گھسنے سے پہلے جیوت

رام کی بیٹھک کی کھڑکی کے اندر ضرور جھانکتا تھا۔ وہ مونڈے پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہوتا اور بیٹھک کے باہر آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں بھی شرارت ہوتی تھی۔ ایک قسم کی دعوت ہوتی تھی، میں تیز قدموں سے شاہ کی بیٹھک میں گھس جاتا تھا۔ شام کو جب روکی کو دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں اور مسکراہٹ میں کشش ہوتی تھی لیکن شرارت یا دعوت نہیں ۔

ایک دن........

اسٹیشن پر شور مچ گیا۔ ایک جیب کترا دور کسی کی جیب کاٹ کر ریل کی پٹری لانگھ کر دوسرے پلیٹ فارم کی طرف دوڑتا جا رہا تھا۔ لوگ چلائے۔ '' پکڑو! مارو! '' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی اس کا سر تھوڑا سا بینچ سے نیچے لٹک رہا تھا۔

میرا دھیان رونے کی آواز کی طرف چلا گیا۔ کئی سال پہلے اور کئی کوس دور اکبر علی بولا۔ '' جیوت رام نے کسی چھوکری کو زبردستی پھانس لیا دن دھاڑے، اٹھو! '' وہ دوڑ پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ شاہ کی بیٹھک کے سامنے والی کھڑکی بند تھی ۔ ہم دونوں بائیں طرف والے دروازے کی طرف دوڑے۔ دروازہ بند تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہماری نولکھی کے کنارے والی زمین سے سٹی ہوئی کونگو کی زمین کا ہرواہا خیسا آنگن کی دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ وہ آنگن میں کود پڑا۔ زور زور سے عورت کی چیخیں اب بھی گونج رہی تھیں۔ علی اکبر نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اونچی آواز میں کہا۔'' میں شاہ ہوں، دروازہ کھولو' دروازہ نہیں کھلا۔ علی اکبر دروازہ کھٹکھٹا رہا۔ اور '' میں شاہ ہوں، میں شاہ ہوں'' کہہ کر چلاتا رہا۔

بھیڑ جمع ہونے لگی۔ گاڑی شاید آنے والی تھی۔

دروازہ جیوت رام کے نوکر گولڑ نے کھولا۔ وہ علی اکبر کے پیروں پر گر پڑا۔ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ '' قبلہ میں بے قصور ہوں۔ ''

علی اکبر نے اسے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ باہر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سامنے خدیجہ رو رہی تھی خیسا سے لپٹ کر۔ اس کی شلوار کھینچ کر پھاڑ دی گئی تھی۔ جیوت رام اپنی پتلون کا ازار بند باندھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ '' میں پیسے بھی دوں گا اور ڈاکٹر کا علاج بھی کراؤں گا۔ ''

علی اکبر نے اسے زور سے دھپ مارتے ہوئے کہا۔ '' بدمعاش تجھے پیسوں پر ہی گھمنڈ ہے''۔

''تم نے مجھے مارا'' دیوان بولا۔ ''ٹانگیں جتنے چھورے نے مجھے مارا۔''

علی اکبر نے دوسری دھپ جماتے ہوئے کہا۔ ''چپ رہو نہیں تو جان سے مار دوں گا۔''

خدیجہ شلوار کو ہاتھوں میں لئے اپنے آپ کو ڈھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خون سے شلوار لال اور زیادہ لال ہوتی رہی۔ وہ خمیسا سے لپٹ کر کھڑی رہی۔ وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ گولڑ جبراً لے آیا، دیوان نے پانچ روپے دئے، میں نے پھینک دئے۔''

پانچ روپے کا نوٹ زمین پر پڑا تھا۔

علی اکبر گولڑ سے بولا۔ ''تھانے سے سب انسپکٹر کو لے آؤ، اس سے اور کچھ مت کہنا، صرف اتنا کہنا شاہ نے بلایا ہے۔''

جیوت رام ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ''علی اکبر تم مجھ پر اتنا ظلم مت کرو، میں کہیں کا نہیں ہوں گا۔''

گولڑ رک گیا۔ علی اکبر بولا۔ ''یہ ٹانگ جتنا چھورا تجھے جیل بھیجے گا۔ گولڑ جاؤ۔'' گولڑ چل پڑا۔

خمیسا بولا۔ ''قبلہ! پولیس کی ضرورت نہیں ہے، مجھے اپنی غیرت ہے۔ میں پولیس کے بدلے ہی اپنی عزت کا بدلہ چکاؤں گا۔'' گولڑ رک گیا۔ خمیسا چلایا۔ ''میں بھی دیوان کی بیٹی سے زبردستی کروں گا، بہن کا بدلہ چکاؤں گا۔''

میرا دھیان خدیجہ کی حالت کی طرف گیا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ بینچ پر گہری نیند میں تھی، اس کے منہ سے تھوڑی تھوڑی رال ٹپکنے لگی تھی۔ علی اکبر نے خمیسا کو بہن کی دہائی دی۔ آٹا کھایا کنویں نے مار پڑی بچھڑے کو، کا واسطہ دیا۔ خمیسا پھر بھی بڑبڑاتا رہا۔ جیوت رام ہاتھ جوڑ کر منت مانگتا رہا خمیسا سے اور علی اکبر سے۔

علی اکبر نے خود دروازہ کھولا اور مجمع کو چلے جانے کے لئے کہا۔ اس نے ڈاکٹر مول چندر کی نرس کو آنے کا پیغام بھیجا۔ پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ جیوت رام اپنے گھر کے برآمدے میں سونے لگا۔ گھر کے آنگن میں گولڑ اور اس کا ہرواہا سومر بھی سونے لگے۔ وہ ابھی تک رال ٹپکاتی ہوئی سو رہی تھی۔

گاڑی آگئی۔ لوگ چڑھ گئے۔ اسے کوئی پتہ نہیں چلا۔ میں ماضی میں کھویا ہوا بیٹھا رہا۔

گاؤں میں ایسے ہی خاموشی تھی جیسے پلیٹ فارم پر تھی۔

اچانک ہی اسی وقت سارا گاؤں جاگ اٹھا۔ پورے گاؤں میں ہائے توبہ مچ گئی۔ خمیسا پانچ چھ ساتھیوں کے ساتھ آیا تھا۔ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور سب کے پاس درانتی اور لاٹھیاں تھیں۔ میں اپنے اور روکی کے گھر کے بیچ والے میدان تک پہنچا تو دھول کے غبار میں پھنس گیا۔ گھوڑ سوار میدان لانگھ کر گاؤں سے باہر جا رہے تھے۔ دور سے روکی کی چیخیں چلاہٹیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اب بھی گویا ماضی اور حال کے درمیان کی سرحدی لکیر ایک لمحے کے لئے مٹ چکی تھی۔

ایک ہی وقت میں دو روکیاں میرے سامنے تھیں۔ ایک خاموش گہری نیند میں، دوسری روتی ہوئی، چلاتی ہوئی جو میری بہن سے کہہ رہی تھی۔ ''لوگ کچھ بھی کہیں میں گنگا جل کی طرح پاک ہوں۔ خمیسے کو میں نے بہن کی دہائی دی اور عین موقع پر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھیوں نے ہوس بجھانی چاہی، بولا بہن ہے میری، میری لاش کا منھ کالا کرنا۔''

خمیسا کی بہن خدیجہ نے حق بخشا دیا (حق بخشانا یعنی خدا سے شادی کرنا، ساری عمر کنورا رہنا) خمیسا کو بھی کوئی لڑکی نہیں ملی۔ پھر بھی اس نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ سارے وقت تسبیح پھیرتا رہا، خدا سے دعائیں مانگتا رہا۔ رب جو تیری رضا۔

اس کے ڈر کے مارے، جیوت رام گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس طرح وہ تو بچ گیا، روکی پھنس گئی۔ گنگا جل کی طرح پاک ہوتے ہوئے بھی کوئی بھی خاندان اور اچھا لڑکا بھائی بند یا عامل یا لونڈا، اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

برسوں بعد وہ مجھے کراچی میں برنس روڈ پر ملی، بہت پتلی ہوگئی تھی۔ اس نے خود ہی مجھے روکا اور پوچھا۔ ''پہچانتے ہو؟'' اور جواب بھی اپنے آپ ہی دے دیا۔ ''میں ہوں روکی۔ سن دھنی سکی (نکمی)'' اس نے قہقہہ لگایا۔

میری بہن اسے 'روکی سن دھنی سکی' کہہ کر ہی بلاتی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''جمنا کیسی ہے؟''

میں جواب دیا۔ ''اس دنیا میں نہیں ہے۔''

اس کی چیخ نکل گئی۔ ''کیا کہا؟''

میں نے پوچھا۔ ''جیوت رام کیسے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''میری شادی سے پہلے ہی چل بسے تھے۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''شکر ہے''۔ شکر میں نے جیوت رام کے مرنے پر بھی کیا

تھا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر روکی کی شادی پر۔

پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ پھر سے بڑھنے لگی تھی۔ شاید اگلی گاڑی آنے والی تھی۔ اچانک ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ پھٹے ہوئے دوپٹے سے اپنی رال پونچھی۔ ہاتھ سے بال سنوارے، جیب سے باقی بچی ہوئی بیڑی نکالی، اٹھی، میری طرف بڑھی میں نے سمجھا، مجھے پہچان لیا ہے۔ بولی۔'' ماچس ہے؟''

میں نے ماچس نکال کر اسے دی۔'' پہچانتی ہو؟ جھلو؟''

'' ہاں'' اس نے بیڑی سلگانے کے لئے تیلی جلاتے ہوئے کہا۔

میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

ایک لمبا کش لے کر بولی۔'' جاڑو بھگت ہوتا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ بینچ کی طرف بڑھنے لگی۔'' تم گاؤ میرے گانے میں ابھی دیر ہے بھورا بھی نہیں ہوئی ہے۔''

وہ بینچ پر بیٹھ گئی، لمبا کش کھینچا۔ بیڑی ہاتھ میں لے کر وہی ہاتھ کان پر رکھ کر گنگنانے لگی۔'' نہ تو لیکھ ہی تھا اور نہ دل لگی تھی، لیکن لوگ ایسا کہتے ہیں اس نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔'' لوگ ایسا کہتے ہیں۔ عمر کے ساتھ لگی تھی۔''

میں حیرت زدہ ہو گیا۔ میں اسے تاکتا رہا۔

'' پچھلے پانچ چھ سالوں میں کیا ہوا ہے؟'' میں اپنے سے پوچھنے لگا۔

وہ ملند کالونی میں رہتی تھی۔ میرے بیرک سے دس بارہ منٹ کے فاصلے پر ٹیکری کے نیچے۔ میں پنچایت کے چندے کے لئے ایک بار گھر گیا تھا۔

اس نے دور سے ہی مجھے پہچان لیا۔ پیار سے کہا۔'' آؤ''

وہ اور بھی دبلی ہو گئی تھی۔ ظاہر تھا کہ گھر کا سارا کام وہی کرتی تھی۔ اب وہ ادھیڑ ہو چکی تھی۔ پھر بھی آنکھوں کی چمک اور کشش مزاج کی خوش خلقی سلامت تھی۔ اس کا شوہر نہیں تھا۔ چندا نہیں دیا۔ شوہر کو پنچایت آفس میں چندہ کو بھیجنے کا وعدہ کیا۔ زبردستی چائے پلائی۔ اس کا شوہر بدصورت تو نہیں تھا لیکن اس کا جوڑ نہیں تھا۔ گوردوارے کے سامنے سبزی بیچا کرتا تھا۔ میں نے اس سے سبزی لینی شروع کی۔ دو تین بار راستے جاتی روکی بھی ملی۔ اس مہذب انداز سے پیش آئی۔

اچانک ہی سبزی والا غائب ہو گیا۔ روکی بھی ملند میں پھر دیکھنے میں نہیں آئی۔

گاڑی آئی، میں نے وہ گاڑی بھی چھوڑ دی۔

اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی۔'اب میری باری ہے۔''

کان پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔'' آنسر کو رام رجھالے بندے'' اور پھر بھگت کی طرح ناچنے اور جھومر لینے لگی۔

میں ٹی اسٹال کی طرف بڑھا۔ چائے کا آرڈر دیا اور اسٹال والے سے پوچھا۔''یہ عورت روز ہی یہاں بھگت مچاتی ہے؟''

''یہاں؟! یہاں نہیں لیکن الہاس نگر میں کہیں نہ کہیں اس کی آواز گونجتی ہے، اس کی آواز کافی سریلی ہے، جوانی میں قہر ڈھایا ہوگا۔''

میں نے پوچھا۔'' کب سے اس کا پاگل پن شروع ہوا؟''

''جب سے اس کے شوہر نے گھر میں سوت کو لا بیٹھایا ہے''۔ میں حیران رہ گیا۔

اس نے لڑکے سے کہا۔'' بھگت صاحب کو چائے تو دے آ، چھورے، ابھی تک اسے نیند کا خمار ہے، آواز میں چستی غائب ہے۔''

میں بھی لڑکے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

گیت بھی اس بیچ بدل چکا تھا۔

دل دیجئے دل والوں کو کیا قدر رہو گی بے قدر یاروں کو

لڑکے نے چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' بھگت صاحب چائے''

اس نے چائے لے کر کہا۔'' لگتا ہے قدر دانوں کی کمی نہیں ہے۔'' لڑکے نے قہقہہ لگایا۔ میرا دل رونے لگا۔ پلیٹ میں آدھی چائے انڈیل کر میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔''پیو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی بھگت ملا۔'' میں نے بے اختیار اس سے پلیٹ لی، ہاتھوں میں لئے کھڑا رہا۔ وہ چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔'' بیڑی ہے؟''

میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھائی۔

اس نے کہا۔'' میرا باپ سگریٹ نہیں بیڑی پیتا تھا۔''

☆☆☆

گوبند مالہی کی پیدائش ۵ اگست ۱۹۲۱ء، سندھ (پاکستان) میں ہوئی۔ ان کی ۲۶ ناول، چالیس ناٹک، مضامین کا ایک مجموعہ، لگ بھگ چالیس کہانیاں شائع ہوئیں۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، مہاراشٹر گورو انعام، بھارتیہ بھاشا پریشد، کولکتہ اور کئی انعامات۔ حال مقیم ممبئی۔

سنسکرت کہانی

جینے کی آرزو

راجندر مصرا

وہی رات۔ وہی دن، وہی شام اور وہی دوپہر.... آسمان کے ہرے میں چکر کاٹ کر جنبش کی شکل بنانے والی وہی پرندوں کی ٹولی ہے۔ دروازے پر بندھی کسی وقت بچھڑے کے لئے رم بہاتی بھورے رنگ والی گائے بھی وہی ہے۔ گھر جنگل سب کچھ ویسا ہی ہے۔ صرف میں بدل گئی ہوں، خموش سانسیں اور خواب..... آہستہ آہستہ بدلتے جارہے ہیں۔ زیادہ کیا کہیں مجھے پورا یقین ہے کہ میرا پورا وجود ہی بدلتا جا رہا ہے۔ رات میں چین سے سو نہیں پاتی۔ آنکھیں بند کرتے ہی میری بدقسمتی کے کانٹوں سے بندھے بیٹے کی طرح پالا پوسا گیا میرے ہی خوابوں کی ہری کے کھانے کی امید میں میرے پاس آ بیٹھتے ہیں۔ میں بدنصیب کیا کروں؟ ناؤ ڈوبنے پر بھی میں نے پار نکلنے کی کتنی بار کوشش کی۔ ہائے، میری قسمت ہی مجھ سے روٹھ گئی۔ رسی کے ٹوٹ جانے پر بھلا گھڑے کو کون سنبھال سکتا ہے؟

بستر پر نڈھال پڑی تپتی کچھ سوچتی ہوئی آنسو بہاتی رہتی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ دن بھر آفس میں کام میں من لگا کر اپنے دکھوں کے کانٹوں کی چبھن کو بھلا کر جب وہ گھر پہنچتی تو اپنے کو بدلا ہوا محسوس کرتی۔

"بیٹی تپتی! سو گئی کیا؟" بغل کے کمرے سے ماں کی شفقت آمیز آواز سنائی دی۔

"ماں! نیند نہیں آرہی ہے، پلکیں بند کرنے پر بھی آنکھیں سونا نہیں چاہتیں، لگتا ہے آنکھوں میں ہی سویرا ہو جائے گا۔"

"پریشان مت ہو بیٹی، اگر اکیلے اچھا نہیں لگتا تو تھوڑی دیر کے لئے ادھر آجاؤ۔"

تپتی دھیرے سے اٹھ کر ماں کے پلنگ پر جا کر چپ چاپ لیٹ گئی۔ پیٹھ پر ماں کی ہتھیلیوں کے سکون بخش لمس سے ہلکا پن محسوس کرتی ہوئی وہ گزرے ہوئے بچپن کو یاد کرنے لگی۔ پلکوں کے دائرے کو پار کرکے گرم آنسوؤں کی دھار چپ چاپ گال پر بہ آئی۔ کون کہتا

ہے؟ گھنے اندھیرے میں بے چاری ماں کیا دیکھیں گی۔ تپتی نے سوچا۔ وہ دن تو بیت گئے''

اس گھر کے چھوٹے سے آنگن میں اندر کی 'نندن' بگیا سجی رہتی تھی۔ یہاں کیا نہیں تھا؟ شام کے چار بجتے ہی کلپ برچھ سے بھی زیادہ منھ مانگی مرادوں کو پورا کرنے والے باپ آفس سے لوٹتے تھے۔ ان کے آتے ہی سبھی اپنے اپنے نام پکارے جانے کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ ''بیٹی شیلا، یہ تمھارا لکڑی کا کھلونا ہے، اسے لے لو۔''

''بیٹا سوم، ادھر آؤ، میں تمھارا منھ چوم لوں۔ (چوم کر) یہ ہوئی نا بات، اب اپنا بستہ لے لو، یہ تمھیں اچھا لگا؟''

''ارے، میرے دل کی گڑیا تپتی بیٹی کہاں چلی گئی، تپتی بیٹی، تپتی بیٹی، ہے بھگوان۔ یہ چوہیا نہ جانے کہاں چھپ گئی؟ دیوی تپتی کہاں ہے؟'' بے حد بے چینی سے باپ نے پوچھا۔

''یہ آپ کی دلاری بیٹی، ٹوٹے ہوئے دیوار کے کونے میں بیٹھی ہے۔'' ماں نے جلدی سے جواب دیا۔

''میری بٹیا، اپنے آپ کو کیوں چھپا رہی ہے؟''

''آپ ہی پوچھیں، چودہ سال کی ہوگئی ہے، پھر بھی دودھ موہی بچی بنی رہتی ہے۔''

باپ بونے کی طرح جھکتے ہوئے چپ چاپ میرے پاس آکر مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہتے تھے۔ ''تپتی بٹیا! دیکھو تو تمھارے لئے کیا لایا ہوں؟'' میں نے دیکھا۔ باپ کے ہاتھ میں دھانی رنگ کی ریشمی ساڑی تھی۔ بنارسی ساڑی دیکھتے ہی میرا الھڑپن جانے کہاں چلا گیا۔ اور میں اچانک سیانی ہوگئی۔ اچھلتی کودتی میں نے باپ کے پاس آکر کہا۔ ''پتا جی! پتا جی! کیا یہ ساڑی میرے لئے ہے؟''

''ہاں بٹیا''

'' پتا جی! کیا میں اسے پہنوں!

''اور کیا''

''پتا جی! کیا میں ماں کی طرح بڑی ہوگئی ہوں؟''

''نہ صرف بڑی بلکہ پوری نانی ہوگئی ہے۔'' بانہیں اٹھا کر ہنستے ہوئے باپ کہتے تھے۔ ماں کو آواز دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ''دیکھو بملا! نا سمجھی میں تمھاری بیٹی تم سے بڑھ کر ہے۔ میں جانتا ہوں اس کے دماغ میں گوبر بھرا ہے۔''

''کیا کہا، میرے دماغ میں گوبر بھرا ہے؟'' ماں نے غصے میں جواب دیا۔

''اگر یہ بیوقوفی میں مجھ سے بڑھ کر ہے تو آپ کس خوبی سے بڑھ کر ہیں؟''

''چپ ہو جائیے دیوی! چپ ہو جائیے!''

''شیلا اور سوم آپ کے ہیں اور تپتی میری ہے۔ آپ نے سنا ہے یا نہیں؟''

''سنا ہے، اچھی طرح سنا ہے، اپنی تختی کو اپنے گلے سے لٹکا کر گھومئے، میں رسوئی میں جاتی ہوں۔'' غصے سے بھری ماں رسوئی میں چلی گئی۔

میں کیا کروں کیا نہ کروں، یہ سوچتی ہوئی ٹھوٹھ کی طرح کھڑی رہی۔

پاپ نے مسکراتے ہو چپکے سے کانوں میں کہا۔ ''تم نے دیکھا تپتی، تمھاری ماں کتنی خراب ہے؟ اب وہ یقینی طور پر چائے میں چینی زیادہ ملا دے گی اور چینی کی جگہ نمک ملا دے گی۔'' اس طرح مذاق کرتے ہوئے باپ اپنے کمرے میں لے گئے۔

'ہائے ری قسمت! وہ سونے جیسے دن اور چاندی جیسی راتیں کہاں چلی گئیں؟''

کنول کے پراگ میں بند فکر مند بھنورے کو متوالے ہاتھی نے اکھاڑ دیا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی امرت کی بارش کرنے والا چاند کمزور ہو گیا۔ مکھن نکالنے سے پہلے ہی دودھ پھٹ گیا۔

تپتی اپنی اندرونی اذیتوں کو تحت الثری میں چھپاتی ہوئی اسی طرح آنسو بہاتی رہی جس طرح سورج کے نکلنے شفالی کے پھول جھڑتے رہتے ہیں۔ آنکھوں میں باپ کی تصویر ابھر آئی۔

''تپتی بٹی! کچھ بولتیں کیوں نہیں؟ کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟''

''نہیں ماں''

''تو پھر چپ کیوں ہو؟''

''ماں! مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو چپ چاپ سو جا۔''

بے چاری ماں تو مطمئن ہو کر سو گئی لیکن تپتی کو نیند کہاں۔ چلتی ہوئی فلم کی طرح واقعات ادھ مندی آنکھوں میں ظاہر ہونے لگے۔ باپ دل کا مریض تھا، ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا۔ سیندھ لگانے والے چور کی طرح یہ مرض کہاں سے آ گیا۔ دوز دعا سے پہلے ہی ابدی نیند سو گئے۔۔ زمانے کی غیبت کے ڈر سے ناطے رشتادار لمحے بھر کے لئے جیسے تسلی دینے آئے

تھے ویسے ہی چلے گئے۔ باپ کی موت کا دکھ تپتی کو اکیلے ہی سہنا تھا۔ آنسوؤں سے سینچی تپتی اپنے ماضی کو یاد کرنے لگی۔

سولہ سال کی کومل لڑکی ماں کی بے چارگی، دودھ موہے بھائی کی پرورش، چھوٹے بھائی کی تعلیم کا انتظام اب یہ سب کچھ تپتی ہی کو کرنا تھا۔ تپتی نے کیا کیا کوشیں نہیں کیں لیکن کون سنتا؟ خوبیوں اور کردار کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سب جگہ پر کشش جسم کی ضرورت ہے۔ سونے جیسا چمکتا، سنہرے جسم وہ کہاں چھپائے۔ کھلے کنول جیسی بڑی بڑی آنکھیں، پکے بمبا پھل جیسے سرخ ہونٹ، دو گداز دلا آویز پستان، دیوی جیسی حسین تپتی اپنے بے پناہ حسن کو کہاں چھپائے؟

گھر میں مٹھی بھر دانہ نہیں۔ شیلا کی پڑھائی بیچ میں ہی رک گئی۔ دودھ کی کمی سے سوم بھی مرجھا گیا۔ ابھی اور کتنا سہنا ہے؟ نوکری تو نوکری ہی ہے۔ نہ جانے بھگوان کب مہربان ہو۔ غم سے بدحال تپتی نے نوکری ڈھونڈنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے ہی دن ماں کے ہاتھوں میں سو روپئے رکھ کر تپتی بولی۔ ''ماں مجھے کام مل گیا ہے، یہ پیشگی تنخواہ ہے۔ شیلا پھر سے اسکول جائے گی، تم بھی پہلے کی طرح سوم کے لئے دودھ لے آؤ۔'' ماں نے بے حد بے صبری سے پوچھا۔ ''لیکن بیٹی!''

''بس ماں، اب کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہتی ہوں ویسا ہی کروگی۔''

بملا چپ چاپ دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ مگر اس کے اندر اٹھتے سوالوں نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ اتنی آسانی سے پیسے کیسے مل گئے؟ تپتی نے کون سی نوکری کرلی ہے؟ کیسا کام کرتی ہے؟ بملا کے دل میں طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ دیر نہیں کرنی چاہئے، اس کا حل ضرور تلاش کرنا چاہئے۔ بھائی، بہن اور ماں کی محبت نے ایسا کیا بگاڑ دیا کہ تپتی جینے کی للک سے بےزار ہوگئی ہے۔

پھول جیسی نازک میری لڑکی ہے۔ سورج کی کرنوں نے بھی میری بیٹی کے عضو کو نہیں چھوا ہے۔ کیسے وہ دس بجے سے چار بجے تک آفس میں بغیر کھائے پئے اپنوں سے الگ رہ پائے گی؟ غرض میں ڈوبی مجھ بے رحم پر لعنت ہے۔ میں تو برائے نام ماں ہوں۔ ماں ہونے کی کیسی قیمت لے رہی ہوں۔ تپتی کی تنخواہ سے تو اچھا ہے بھیک مانگ کر گزارا کرلینا۔

''بیٹی تپتی! تمھارا آفس کہاں ہے؟ کل میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔'' بملا نے دوسرے دن شام کو کہا۔

تپتی کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ کیا ماں کو شک ہوگیا، کیا کسی دیکھنے والے چغل خور نے راز

کھول دیا؟ سوچتی ہوئی تیجتی بولی۔ ''ماں میرے آفس میں تمھارا کیا کام؟''

''بیٹی کیسے کام نہیں، میں تمھاری ماں ہوں''

''ماں! کیا کسی نے اونچ نیچ کہہ دیا؟''

''نہیں بیٹی! میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی مگر تمھیں اتنی گھبراہٹ کیوں ہو رہی ہے؟ ارے تمھارے گال سوکھ گئے ہیں، ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ تیجتی! میں جانتی ہوں تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو، میں بھی تمھارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ بغیر سچائی جانے پانی بھی نہیں پیوں گی۔''

تیجتی کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ وہ بے چاری کس زبان سے سچائی کہے۔ کیسے بتائے کہ وہ کسی ہوس پرست آفیسر کی بھوک پیاس مٹا کر سو روپے میں نوکری پانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

جوانی کے علاوہ کون سی شے تھی اس کی، اب وہ ماں کی گود میں سونے والی بچی نہیں رہی۔ وہ کسی دوسرے کے ساتھ ہم بستر ہو چکی ہے۔ ٹوٹے دل والی، ٹوٹے خوابوں والی تیجتی غم زدہ ہو کر روتی رہی۔ ماں کے شانے پر سر رکھ کر جیسے بغیر کچھ بولے ہی اس نے سب کچھ کہہ دیا۔

''ماں، میں کلنکنی ہوں، مجھ پر لعنت بھیجو، مجھے دھتکارو، مجھے مارو، مجھے گھر سے نکال دو! ماں میں نے تمھاری گود کو داغدار کیا ہے لیکن سوم کا مرجھایا چہرہ، شیلا کی آنکھوں کا دکھ دیکھ کر میرے پاس اور کیا چارہ تھا۔ کیا پاک دامنی بھائی کا پیٹ بھرنے سے بڑھ کر ہے؟

آنسوؤں سے رندھے گلے سے ماں کچھ نہ کہہ سکی۔ پچھتاوے کی آگ سے جلتی ہوئی وہ بے رحم ایشور کو کوسنے لگی۔''سب کچھ جاننے والے اے مالک! میں نے آپ کا انصاف دیکھ لیا ہے۔ تھوڑا سا سکھ نہیں دے سکے۔ اٹھتے ہوؤں کو گراتے ہو، پاپ کو بڑھاتے ہو۔ یقیناً تم شریف انسانوں کو برا بنا دیتے ہو۔ ارے بے رحم، بے درد پرمیشور۔ تیجتی کے دل کے بے پناہ دکھ کو بھی نہیں سمجھا۔ تم نے گنگا جل کو شراب بنا دیا۔ ایک پاک دوشیزہ کو ہوس پرست کے حوالے کر دیا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ کسے اپنا داغدار چہرہ دکھاؤں، لوگ کیا کہیں گے۔

بملا نے سوچا۔ کل ہی وہ دیک آئے گا۔ بڑی کوششوں سے تیجتی کے لئے میں نے یہ رشتہ تلاش کیا ہے۔ بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے ہی سکھ کا سانس لے سکوں گی۔ لیکن بیٹی کی بدترین حالت ہونے پر الزام لگانے والے معاشرے میں کیا ہو سکتا ہے؟

''کھٹ.....کھٹ.....'' کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

شام کے وقت کون ہوگا۔ بملا اندازہ نہ لگا سکی۔ تپتی سے شفقت سے بولی۔ ''دیکھو بیٹی کون آیا ہے؟ تپتی کے جانے سے پہلے ہی بغیر چٹخنی چڑھے دروازے کھول کر کوئی خوبصورت مرد کمرے میں آپہنچا۔ حیرت زدہ بملا سے کہا۔ ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں یقیناً وقت سے پہلے آگیا ہوں، بنارس سے ابھی لوٹا ہوں۔''

''بیٹا تم دویک ہو؟''

''ہاں، آپ نے ٹھیک پہچانا ہے۔''

اس نوجوان نے محبت اور چاہت بھری نظروں سے تپتی کو دیکھ کر پوچھا۔ ''ماں! کیا یہ تپتی ہے؟''

''ہاں بیٹا!'' بملا نے کہا

''ماں، آپ بڑے خراب پڑوس میں رہتی ہیں، آپ کے گھر کے متعلق میں نے ان سے پوچھا تھا۔ کیا کہوں؟ پتہ نہیں وہ نیچ کیا کیا بک گیا۔ بکنے دو، اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تپتی اچھی لگتی ہے۔''

بملا کی جان میں جان آئی۔ تپتی شرم سے جھکی ہوئی تیز چال سے کمرے کے اندر چلی گئی۔

نوجوان پھر بولا۔ '' ماں! کیا میں نے غیر مناسب کیا ہے؟ ایسا ہو تو مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بچپن سے ہی زیادہ بولتا ہوں، رات میں ہی چلا جاؤں گا۔ کیا مجھے کھانا نہیں کھلائیں گی؟''

بملا جذباتی ہو کر رونے لگی اور بولی۔ ''بیٹا! اب ماں کے کہنے پر ہی جاؤ گے۔ مجھے تو جینے کی آرزو مل گئی۔''

☆☆☆

راجندر مشرا ۲ جنوری ۱۹۳۳ء کو جون پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ سنسکرت میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ جن کے نام ہیں 'جانکی جیونم' 'وامنا وترنم' 'شتابدی کاویم' 'اک شکندھا' 'شاستریہ پوجنم' وغیرہ۔ سنسکرت، ہندی اور انگریزی میں ۸۵ کتابیں ہیں۔ ان کو کالی داس سمان، واچسپتی سمان، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ کے علاوہ کئی اور اعزاز اور انعام ملے ہیں۔

کشمیری کہانی

ڈھائی گھنٹے

ہری کرشن کول

ہم اسٹیشن پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہم نے پہنچتے ہی ریزرویشن چارٹ پر نظر ڈالی، لیکن یہاں بھی بدقسمتی کا ہی سامنا ہوا۔ ویٹنگ لسٹ میں جن خوش نصیبوں کے نام میرے دوستوں سے پہلے درج تھے ان کا ریزرویشن ہو چکا تھا۔ لیکن میرے ہی دوست کو جانے کس جرم کی سزا میں لٹکا کر رکھا گیا تھا، بدقسمتی نے اسے اور اس کا ساتھی ہونے کی وجہ سے مجھے ایک اور طرح سے پریشان کیا تھا۔ پونے سے آنے والی جس گاڑی میں اسے جموں جانا تھا وہ ڈھائی گھنٹے لیٹ تھی۔ اس دوسری پریشانی کا اثر اس سے زیادہ مجھ پر پڑا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر گاڑی عادت سے مجبور ہو کر لیٹ ہی آنا چاہے گی تو بھی نو بجے تک آ ہی جائے گی۔ دوست کو رخصت کر کے میں آسانی سے دس بجے کی آخری بس سے اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ مگر اب بات نہیں رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دوستی اور لحاظ کا چولا اتار کر دوست کو اس کی قسمت کے حوالے کر کے اسٹیشن پر چھوڑ جاؤں اور خود وقت پر اپنے گھر لوٹ جاؤں یا پھر مدت بعد ملے دوست کے تئیں اپنا فرض نبھاتے ہوئے تب تک اسٹیشن پر ہی ٹھہروں جب تک پونے سے آ کر گاڑی اسے لے کر جموں کے لئے روانہ نہیں ہو جاتی۔ اپنے آپ کو اپنی قسمت کے نہیں بلکہ اپنے خدا کے حوالے کروں۔ اگر اس کی خواہش ہو گی مجھے بخیر و عافیت گھر پہنچا دے گا۔ خواہش نہ ہو گی تب بھی میرا سر اس کے آگے جھکا رہے گا۔

''اس ملک کا کچھ نہیں ہو گا۔ نہ ٹرین وقت پر آئے گی نہ جہاز وقت پر ٹیک آف کرے گا۔'' میرے دوست نے یہ بات تلخ لہجے میں کہی اور بینچ سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر بے مقصد گھومنے لگا۔ میں اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گاڑی آتے ہی ہمیں ٹی ٹی سے بات کرنی چاہئے۔ اگر اس کے پاس کوئی برتھ خالی ہو گی تو وہ برتھ ہمیں ہی ملے گی۔ جس طرح کوئی مرغی چونچ میں دانہ لے کر چوزے کے پاس جاتی ہے اسی طرح میں یہ اچھی خبر لے کر اپنے دوست کے پاس گیا۔ سن کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے پر اس

کی ناس مسکراہٹ ایک بار پھر میرا مذاق اڑانے لگی۔ اسکول ماسٹر سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک بھی جھوٹی تعلیم اور جھوٹی تسلی دیتے ہیں۔ اس ملک کا کچھ نہیں ہوگا۔

میرا دوست کشمیر کا معروف اور جانا پہچانا دانشور تھا جو انسانی قدروں کے موضوع پر منعقدہ ایک آل انڈیا کانفرس میں حصہ لینے دلی آیا تھا۔ دو دن کی یہ کانفرنس کل شام کو ہی اختتام پذیر ہوگئی تھی۔ آج سویرے وہ ہوٹل چھوڑ کر میرے یہاں آیا تھا اور سارا دن میرے ساتھ گزارا تھا۔ سب سے پہلے ہم انڈین ایرلائنس کے دفتر گئے تھے۔ وہاں اس نے منت سماجت کر کے ٹکٹ واپس کر کے ''ریٹرن ایرفیر'' کے روپئے جیب میں ڈالے تھے۔ وہاں سے ہم کرول باغ گئے تھے جہاں اس نے بیوی بچوں کے لئے کپڑے اور کچھ دوسرا سامان خریدا تھا۔ کرول باغ سے آ کر اس نے میرے گھر پر میرے ساتھ کشمیری کھانا کھایا تھا اور میری بیوی کے پکانے کی بہت تعریف کی تھی۔ میرے بچوں کے ساتھ بھی وہ خوب کھیلا تھا اور اس بات کے لئے صرف انھیں ہی نہیں، مجھے اور میری بیوی کو بھی شاباشی دی تھی کہ اتنے برس دلی میں رہنے کے باوجود ہم اور ہمارے بچے کشمیری ہی بولتے ہیں۔ کھانا کھانے اور پھر نمکین گلابی چائے پینے کے بعد ہمارے بیچ کئی مسئلوں پر بحث چھڑی تھی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ اسے ہر شخص اور ہر نظریے سے نفرت ہے۔ مگر ویسی ہی نفرت جیسی ایک باپ کو اپنے پیارے بیٹے سے اس کی بدکاری دیکھ کر ہوتی ہے۔ یا پھر کسی نیاز مند اور مذہبی بیٹے کے دل میں اپنے باپ کا کوئی ذلت آمیز کام دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ماننا تھا کہ بنیادی طور پر آدمی کتے سے زیادہ ذلیل اور بھالو سے زیادہ وحشی ہے۔ اس کی رائے میں وہ دن کائنات کا سب سے تاریک دن تھا جس دن چار ٹانگوں والے جاندار نے دو ٹانگوں پر چلنا سیکھا تھا اور اس طرح اپنی ذات کو ابھار کر باقی مخلوقات کو ڈبو دیا تھا۔ یہ سب کہنے کے بعد اس نے آہ بھری تھی۔

''اس دنیا کا کچھ نہیں ہوگا۔''

چار بجے کے آس پاس میری بیوی نے اس کی فرمائش پر کشمیری قہوہ بنایا تھا۔ قہوہ پی کر ہم نے اور بھی بہت سارے ادبی، علمی اور آفاقی مسئلے پر بحثیں کی تھیں۔ سوا سات بجے وہ اور میں ٹکسی سے اسٹیشن کی طرف چل پڑے تھے اور اس وقت سوا نو بج رہے تھے۔

پلیٹ فارم نمبر دو سے ایک گاڑی نہ جانے کہاں کے لئے نکل پڑی۔ پلیٹ فارم نمبر تین پر کوئی گاڑی جانے کدھر سے آئی۔ لیکن خالی پٹری لئے پلیٹ فارم نمبر ایک پونے سے آنے والی اس گاڑی کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا جس سے میرے دوست کو جموں جانا تھا۔ میں نے دائیں

بائیں دونوں طرف دور تک نظر ڈالی۔ خالی پٹری پر جلدی گاڑی آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میرے خالی دماغ میں جلد ہی یہ سوال آیا کہ کیا دوست کو اس کی قسمت کے بھروسے چھوڑنا میرے لئے اور ہماری دوستی کے لئے اچھا ہوگا؟ نہیں، مجھے گاڑی کے آنے اور پھر اس کے چلے جانے تک انتظار کرنا ہوگا۔ گاڑی کے آنے اور چلے جانے کے درمیانی وقفے میں دوست کے سونے کے لئے برتھ کا کوئی نہ کوئی انتظام بھی کرنا ہوگا۔ اسے خوشی خوشی رخصت کرنے کے بعد ہی خود گھر واپس جانے کی فکر کرنی ہوگی۔ ٹھیک دس بجے کے بعد کوئی بس نہیں ملے گی لیکن تھری ویلر تو مل جائے گا۔ تبھی یہ دھیان آنے سے میرے جذبات سرد پڑ گئے۔ اسٹیشن سے میرے گھر تک تھری ویلر کا کرایہ دس پندرہ روپے سے کم کیا ہوگا؟ مگر میری جیب میں صرف پانچ روپے کا ایک نوٹ تھا۔ آدھی رات کو گھر پہنچ کر بیوی کو جگانا اور اس سے تھری ویلر والے کو دینے کے لئے روپے مانگنا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں اس نئے مسئلے سے کس طرح نپٹوں۔ جب میری بیوی کی نیند نوٹے گی بلکہ توڑی جائے گی تب وہ میری ہڈی پسلی توڑنے میں کوئی کسر نہ باقی رکھے گی۔ پوچھے گی کہ یہ کون سا چہیتا بھائی بہنوئی آیا تھا جس کے لئے تم نے پورا دن اور آدھی رات برباد کردی؟ اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر روغن جوش، مکھنی شامی کباب سے اس کا جہنمی پیٹ بھر دیا اور اس پر تھری ویلر کے کرائے کے طور پر جرمانہ بھی ادا کیا۔

میں نے اپنی بیوی کے ان چاہے مہمان کی طرف نظر ڈالی۔ اس نے وقت بتانے کے لئے ایوننگ نیوز اخبار خریدا تھا۔ اس کے پاس جاکر میں نے بھی اس پر نظر ڈالی۔ ''پانچ کروڑ'' میرے منھ سے چیخ سی نکل پڑی۔ سرخی والی خبر بڑی سنسنی خیز تھی۔ پانچ کروڑ روپے کا ایک بڑا بھاری اسکینڈل ننگا ہوا تھا جس میں بڑے بڑے لوگوں کے ہاتھ ہونے کا امکان تھا۔

''پانچ کروڑ پڑھ کر تمہاری رال اس طرح کیوں بہنے لگی؟ آج کل کروڑ کوئی بڑی رقم نہیں ہوتی۔'' اس نے میری بیوقوفی پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ پتہ ہے، آئے دن ہونے والے ان سی میناروں، کانفرنسوں، جشنوں پر کتنے کروڑ خرچ ہوتے ہوں گے؟ کتنی دولت ضائع ہوتی ہوگی؟ اس ملک کا کچھ نہیں ہوگا۔''

مطلب جس کانفرنس کے لئے تم یہاں آئے تھے اس پر خرچ کیا گیا سارا پیسہ بھی اصل میں ضائع ہوا ہے'' میں نے کہا۔ ''بالکل ضائع ہوا۔ اتنے لوگوں کے لئے فرسٹ کلاس یا ہوائی جہاز سے آنے جانے کا انتظام کیا گیا۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ان کے کمرے بک کئے گئے۔ لنچ، ڈنر،

پارٹی، پکنک پر ہزاروں نہیں لاکھوں روپے اڑائے گئے۔ پہلے بے مطلب کی ان مجلسوں کے بارے میں فارسی میں کہا جاتا تھا۔ نشستن، گفتن، برخاستن، مطلب بیٹھنا، باتیں کرنا، اور اٹھ کر چلے جانا۔ مگر اب ان تین تنوں کے ساتھ ایک چوتھا تن بھی جڑ گیا ہے۔ ''خوردن'' یعنی کھانا پینا۔

''اس ملک کا کچھ نہیں ہوگا'' جانے کیسے اس بار اس کا تکیہ کلام میرے ہی منہ سے نکل پڑا۔

''ملک کا کچھ ہوگا یا نہیں، مجھے فائدہ ضرور ہوا ہے۔''

''کیا فائدہ؟''

''مجھے دس سال بعد اپنے دوست سے ملنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔''

اس نے پہلے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر مجھے گلے سے لگایا۔ پھر میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک اسٹال تک لے گیا اور دو اورنج جوس کا آرڈر دیا۔ قاعدے اور شرافت سے بل کی ادائیگی مجھے کرنی چاہئے تھی مگر میرے پاس صرف پانچ روپے کا ایک نوٹ تھا۔ میں نے نظر بچا کر مائک پر ہونے والے اناؤنسمنٹ سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دوست جب پرس نکال کر بل ادا کرنے لگا تو میں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے میرا داہنا ہاتھ پکڑ کر میرے دوسرے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھما دیا۔ ٹھنڈا جوس پیتے پیتے پشیماں چہرے سے پسینے کی سرد بوندیں بہنے لگیں اور دیکھتے دیکھتے ڈھائی گھنٹے گزر گئے۔ پورے ساڑھے دس بجے داہنی طرف کا سگنل ڈاؤن ہوا۔ دور پٹری کے سرے پر لال بتی کی جگہ ہری بتی جلی اور کچھ دیر بعد ہی پلیٹ فارم کو جھکجھورتی ہوئی قدیم عہد کے ڈائنا سور سے بھی بھیانک روپ میں چنگھاڑتی ریل گاڑی ہمارے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ پلیٹ فارم پر سوٹ کیس کے لئے مردوں، بچوں کے ہاتھ تھامے عورتوں اور سر پر سامان لادے قلیوں کی بھاگ دوڑ اور دھکا مکی شروع ہوئی۔ نہ اترنے والے اندر جانے والوں کو داخل ہونے دیتے اور نہ ہی داخل ہونے والے اترنے والوں کو باہر آنے دیتے تھے۔ یہ پاگل پن دیکھ کر میرا دوست ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کی انوکھی مسکراہٹ اس وقت جیسے اس کے ہونٹوں سے غایب ہوگئی تھی۔

اچانک کالا کوٹ پہنے ٹی ٹی پلیٹ فارم پر خومی کی طرح پھوٹ پڑا اور سامنے والے کاونٹر کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ درجن بھر مسافر سامنے اکھٹے ہوکر اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگے۔ لیکن اس نے ان پر کوئی رحم نہ دکھا کر بے رخی سے اعلان کیا کہ کسی بھی کمپارٹمنٹ میں سونے کے لئے کوئی برتھ خالی نہیں ہے۔ میرے دوست کا چہرہ پیلا پڑ گیا لیکن میں بے شرم بن کر ٹی ٹی کی طرف بے چارگی سے

دیکھنے لگا۔ وہ سامنے کھڑے لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جانے کس ضرورت کے تحت ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ لیکن میری طرف ایک دو بار اس نے عجیب نظروں سے ضرور دیکھا تھا۔ یا تو اسے مجھ پر اور مجھ سے زیادہ میرے ساتھ چپکے میرے دوست پر رحم آیا تھا۔ یا پھر اس نے ہمیں ٹکڑا آسامی سمجھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے سامنے کھڑے لوگ ادھر ادھر ہٹنے لگے تو اس نے بغیر کسی ہچک اور جھجک کے مجھ سے بیس روپے مانگے۔ میرے دوست نے فوراً دس دس کے دو نوٹ میرے ہاتھ میں دیے جو میں نے مسکرا کر ٹی ٹی صاحب کے حوالے کیا۔ جذبات سے عاری چہرہ بنا کر ٹی ٹی نے نوٹ اپنی جیب میں رکھے۔ میرے دوست کا زرد چہرہ پھر سے کشمیری سیب کی طرح لال ہو کر چمکنے لگا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کشمیری زبان میں کہا۔ ''اب شیطان کا پیٹ بھر گیا۔ مجھے برتھ مل گیا اور میرا کام بن گیا۔ البتہ اس ملک کا کچھ نہیں بنے گا۔''

ٹی ٹی نے پھر اسی جذبات سے عاری چہرے سے ٹکٹ مانگا۔ میرے دوست نے اپنا ٹکٹ میرے ہاتھ میں رکھا جسے میں نے ٹی ٹی کے حوالے کیا۔ اس نے کمپارٹمنٹ اور برتھ کا نمبر لکھ کر ٹکٹ لوٹایا۔ میرے دوست نے اپنا ٹکٹ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور اپنا کمپارٹمنٹ تلاش کرنے دوڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے جانے لگا کہ ٹی ٹی نے آواز دی۔ ''دوسرا ٹکٹ کہاں ہے؟''

''ہم میں سے ایک کو ہی جموں جانا ہے جسے جانا وہ اپنا ڈبہ ڈھونڈ رہا ہے۔'' میں نے اسے اصلی بات بتادی۔

بات سن کر ٹی ٹی کا چہرہ نفرت سے تن گیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں سکنڈ کلاس کے ایک برتھ کا دس روپے لیتا ہوں۔ نہ ایک پیسہ زیادہ نہ ایک پیسہ کم۔ یہ میرا اصول ہے اور میں اصول چھوڑ کر بے ایمانی نہیں کرتا۔''

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نفرت سے میری طرف دیکھ کر دس کا ایک نوٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے نوٹ لیا اور اپنے دوست کی طرف نظر ڈالی۔

وہ جہلم ایکسپریس کے ڈبوں کے نمبر پڑھ کر اپنا ڈبہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر نوٹ چپکے سے اندر کی جیب میں ڈال دیا۔ اب میرے پاس پندرہ روپے تھے۔ ایک پانچ روپے کا نوٹ جو میں گھر سے لایا تھا اور دوسرا دس کا نوٹ جو اوپر والے کی مہربانی سے ابھی ابھی مجھے یہیں ملا تھا۔ ایسا میں بغیر کسی پریشانی کے تھری ویلر میں آرام سے اپنے گھر جا سکتا تھا اور گھر سے دس بیس گز پہلے ہی کرایہ چکا کر تھری ویلر والے کو چھٹی کر سکتا تھا جس سے میری بیوی کو شک کرنے کا

موقع ہی نہیں ملتا کہ میں بس سے نہیں تھری وہیلر سے گھر لوٹتا ہوں۔

میں نے ایک بار پھر پٹری پر کھڑی ریل گاڑی کی طرف نظر ڈالی۔ میرا دوست ابھی تک اپنا ڈبہ ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔ دوستی اور شرافت کا تقاضا پورا کرنے کی نیت سے اس کی مدد کرنے کے لئے میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔

☆☆☆

ہری کرشن کول کی پیدائش ۲۲ جولائی ۱۹۳۴ء میں سری نگر، کشمیر میں ہوئی۔

کشمیری زبان میں 'پت لاران پر بتھ، حالس چھورو تل، تھ راز دانے' نام کے افسانوی مجموعے ہے۔ ناٹک 'کریو بند' نام کا ناٹک بھی لکھا ہے۔ ہندی میں 'اس حمام میں' 'نوکری بھر دھوپ' 'ارتھی' نام کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ 'پھنیشور ناتھ رینو کی کہانیاں: شلپ اور سار تھکتا' نام کی تنقیدی کتاب بھی ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی سے انعام یافتہ افسانہ نگار۔ ☆☆☆

تبر کی کہانی

کے۔ پی۔ پورن چندر تیجسوی

تبر شیٹی پاگل ہوگیا ہے۔ پڈ وگیرے کے لوگ آپس میں یہی چہ میگو ئیاں کر رہے تھے۔ پورے پڈ وگیرے بازار میں رہنے والے پاگلوں میں تبر شیٹی چھبیسواں تھا۔ پڈ وگرے میں کوئی پاگل ہو جاتا تھا تو کسی کو حیرت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ وہاں لوگ بے وجہ ہی اچانک پاگل نہیں ہوتے تھے۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ بغیر کسی غیر معمولی حالات کے پاگل ہو جاتے تھے۔ لوگ ان کے پاگل پن کی جانچ پڑتال کر کے ان کے پاگل ہونے کے بعد 'ہائے بے چارا' کہہ کر اپنی ہمدردی دکھا کر سماج کی منظوری دے دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان پاگلوں کی اپنی ہی ایک تاریخ ہوتی تھی۔

تبر شیٹی کو پڈ وگیرے گاؤں میں سبھی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ انگریزوں کے زمانے میں سرکاری نوکری میں لگا تھا۔ انگریزوں کے اصولوں اور ضابطوں کی تعریف کرتے ہوئے پرانی یادوں کی جگالی کرتے ہوئے لوگ اس تاریخ کو تازہ بنائے رکھتے تھے۔ ان ہی میں ایک تھا ڈاکٹر ہلو اا اور دوسرا تبر شیٹی۔ دونوں ہی اپنی یادوں کو دہراتے وقت سچائی کی گواہی کے لئے ایک دوسرے کا حوالہ دیتے تھے۔

انگریزی راج میں تبر کو چنگی وصولی کا کام ملا تو اسے لگا جیسے اس کے سینگ اُگ آئے ہوں۔ سب اسے عزت سے دیکھنے لگے۔ پڈ وگیرے جانے والے لوگ ساگ سبزی مچھلی وغیرہ پر چنگی کے ساتھ ساتھ اسے بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

انھیں دنوں ملک میں کوئی تحریک شروع ہوئی۔ لوگ اسے آزادی کی جنگ کہتے تھے۔ پہلی جنگ کی گرمی ختم ہونے سے پہلے ہی یہ ایک نئی گرمی شروع ہوئی تھی۔ تبر شیٹی کی انھیں دنوں شادی ہوئی تھی۔ اپی یا اپما نام کی منگلور کی طرف کی لڑکی سے۔ کئی بار دونوں چنگی چوکی کے پاس بیٹھ کر جنگ آزادی کے بارے میں بات کیا کرتے تھے۔ انگریزوں سے جدوجہد کرنے والوں میں کسی گاندھی کا نام انھیں بار بار سنائی پڑتا تھا۔ تبر اور اس کی بیوی کو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جدوجہد

ہو کیوں رہی تھی۔ لیکن اتنی بات ضرور سمجھ میں آ گئی تھی کہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنا ہی ان کا مقصد تھا۔ تبرکوئی محبِ وطن تو تھا نہیں۔ لیکن وہ یہ ضرور کہتا تھا کہ ان کالوں کے بیچ میں ایک غیر موافق کی طرح یہ گورے کیوں رہتے ہیں! انھیں اپنوں کے بیچ جا کر بسنا چاہئے۔ جو بھی ہو، اسے ایسا لگتا تھا کہ گاندھی جی کی بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے لیکن ستیہ گرہ کرنے والے ستیہ گرہیوں کے ذریعہ ٹیلی فون وغیرہ کے تار کاٹنے پر تبر فکر مند ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا احتجاج جتائے بغیر نہیں رہ پاتا۔ اسے کسی ایک جانب دار کا ہی تو کام کرنا تھا نا۔ لوگ چنگی دیئے بغیر نکل جائیں یہ تبر سہہ نہیں سکتا تھا۔ ایسے موقع پر اکثر اس کے منھ سے نکل پڑتا۔ ''بیڑا غرق ہو اس گاندھی کا!'' دوڑ دھوپ کر کے اس نے پڈوگیرے کے سرکٹ میں میٹ کے کام کا جوگاڑ کر لیا اور چنگی کے کام سے آزادی پالی۔ گورے عہدے داروں کی خدمت کرتے ہوئے قریب سے انھیں دیکھا اسے ایسا لگا کہ وہ لوگ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں۔

اس بیچ ستیہ گرہ کی گرمی بڑھ چلی۔ بار بار سننے میں آتا کہ کس کس بڑے گھرانے کے بچے گھر بار چھوڑ کر گاندھی جی کے ستیہ گرہ میں جا ملے ہیں۔ لاٹھی چارج، گولی باری وغیرہ ہونے پر بھی ستیہ گرہ تحریک جاری ہی رہی۔ ٹیلی فون وغیرہ کے تار کٹنے پر اسے گاندھی پر غصہ آتا۔ گولی باری اور لاٹھی چارج کی خبریں سن کر اسے انگریزوں پر غصہ آتا۔ تحریک آزادی کی گرمی بڑھتے بڑھتے گاؤں گاؤں اور مضافات تک جا پہنچی۔ تب انگریزوں کی خدمت پورے دل سے کرنے میں اسے تھوڑا تکلف ہونے لگا۔ برٹش عہدے دار جب دورے پر سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرنے آتے تو اینگلو انڈین بٹلر ساتھ لاتے۔ وہ لوگ تبر کو بالکل حقیر سمجھ کر شک کی نظر سے دیکھتے۔ تب تبر کو کراہت سی ہونے لگتی۔ اپی نے تبر کی اس تشویش کو دیکھ کر صلاح دی کہ وہ تعلقہ کچہری میں اپنا تبادلہ کرالے۔

تبر کو تعلقہ آفس میں چپراسی بن کر پہنچنے تک بھارت آزاد ہو چکا تھا۔ گوروں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھی۔ ہندوستانیوں اور ملکی عوام کی تحسین آفرینی شروع ہو چکی تھی۔ تعلقہ آفس کے ساتھ تعلقہ وکاس منڈل، کافی بورڈ، آب کاری و بھاگ وغیرہ کے آفس کھل گئے تھے۔ تبر کو کس آفس میں جانا چاہئے؟ اس کی تنخواہ کیا ہونی چاہئے اسے کس عہدہ پر ہونا چاہئے۔ اس کے بارے میں چرچا شروع ہو گئی۔ کئی آفس میں تبادلے ہونے کے بعد آخر میں 'میونسپلٹی کا نوکر ہے، یہ فیصلہ ہوا۔ اسے یونیفارم ملنے میں کئی برس لگ گئے۔ تبر کی اب اپنی نوکری سے سبکدوشی کی عمر آ پہنچی۔ تبر کی زندگی میں آنے والی فکر کی کوئی جھلک نہیں دکھائی دی۔ تبر کی سبکدوشی کے آخری دنوں میں اسے

پر چیونٹیاں رینگتی دیکھی۔ اس نے سوچا یہ کوئی پیشاب کا مرض ہوگا۔ تبر کو حیرت ہوئی کہ کیا وہ سچ مچ اپّی کو اتنا پیار کرتا ہے۔ بیوی کے بیمار پڑنے سے پہلے اسے اس بات کا علم ہی نہ تھا۔

تبر جب ڈاکٹر ہلور کو اپّی کو دکھانے لے گیا تو انھیں شک ہوا کہ ڈائیبٹیز (شوگر) ہو سکتی ہے۔ کچھ جانچ کے بعد اس کا یہ شک درست نکلا۔

اس نے کہا۔ '' کیا بات ہے، یہ تو راج روگ ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک دو انگریزوں کو یہ بیماری ہوئی تھی۔ یہ تمھاری بیوی کو کہاں سے لگ گئی۔ کہیں تمھارے مقدر میں امیری تو نہیں لکھی ہے؟'' کہہ کر مذاق کرتے ہوئے چار پانچ قسم کی دوائیں لکھ کر دے دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جوڑا۔ ''اگر زیادہ ہو گیا تو انجکشن لینے پڑیں گے۔'' تبر نے بیوی کو بتایا۔ '' دیکھ ری، تجھے تو راجہ اور رانی کو ہونے والی بیماری لگی ہے۔ چلو گوروں کی طرح راج پاٹ نہ سہی، ان کی بیماری مل گئی، یہی کیا کم خوشی کی بات ہے۔''

ڈاکٹر ہلور اور تبر بہت دیر تک انگریزوں کی بیماری سے لے کر ان کے راج چلانے اور ان کے دربار کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اپّی کو اس میں کچھ بھی پلّے نہیں پڑا۔

تبر حیرت سے سوچنے لگا۔ اس بیماری سے پیسہ آنا تو دور کہیں بھیک مانگنے کی نوبت نہ آ جائے۔ پڈوگیرے کی میونسپلٹی کی مقررتاریخ ختم ہو جانے سے منڈلی توڑ دی گئی تھی۔ اگلا چناؤ ہونا تھا۔ اس بیچ میونسپلٹی کی دیکھ ریکھ کا کام تحصیلدار کر رہے تھے۔ تبر کو تعلقہ کچہری سے نوٹس ملا کہ اس نے دو تین رسیدوں کا پیسہ جمع نہیں کرایا ہے۔ وہ کرا دے، ورنہ اس کی تنخواہ روک دی جائے گی۔'' تبر نے تحصیلدار کے پاس جا کر سارا قصہ کہہ سنایا۔ تحصیلدار نے تبر کے احوال سننے کے بعد کہا کہ یہ پیسہ اسی کو وصول کرنا تھا اور اس نے پیسے کا غلط استعمال کیا ہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ تبر کو تین سو ساٹھ روپے بھرنے پڑیں گے۔

تبر پہلی بار زندگی میں اس بےعزتی سے دکھی ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ اس نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی کام کیا ہے۔ اس نے جن جن صاحبوں کے ماتحت کام کیا تھا ان کی ایک فہرست بھی پیش کی تھی۔ اس زمانے میں اس طرح کا ایک جھوٹا الزام لوگوں پر لگایا نہیں جاتا تھا۔ تبر کے افسروں نے اس کی نیت اور با اصول ہونے کی خوب تعریف کی ہے۔ '' آپ چاہیں تو ڈاکٹر ہلور سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس بوڑھے کی بات سچ ہے یا جھوٹ۔''

تحصیلدار کو اس بوڑھے کی پرانی داستان سننے کی فرصت نہ تھی۔ اس کے دماغ میں تو

عرضیاں، کالم، دستخط، تکرار نوٹس وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ کسی بھی عرضی کا کالم نہ بھر سکنے والے اس بوڑھے کی یادوں کی کسے ضرورت تھی۔

انگریزوں کی حکومت کی تعریف کر کے تمر نے انجانے میں ہی موجودہ سرکار کی برائی کر ڈالی تھی۔ تحصیلدار نے پتہ نہیں کیا کیا کہا لیکن نتیجہ یہ رہا کہ تمر کی تنخواہ روک لی گئی۔ تمر کے پاس پیسے نہ تھے یہاں تک کہ بیوی کی دوا کے لئے بھی پیسے نہ تھے۔ ادھر ادھر سے مانگ چانگ کر بیوی کے لئے راگی کی کنجی کا انتظام کیا۔ کسی نے اسے سمجھایا کہ یہ پتہ لگاؤ کہ تمھیں پنشن ملے گی یا نہیں۔ تمر تحصیلدار کے یہاں پھر سے بھاگا۔ تحصیلدار ''عرضی دو اوپر والوں کو بھیجوں گا!'' کہہ کر آگے کچھ نہ کہتے ہوئے فائلوں میں ڈوب گیا۔ میونسپلٹی کا انتخاب جیسے جیسے قریب آتا گیا ویسے ویسے امیدواروں کی بھاگ دوڑ بھی بڑھتی گئی۔ بن ٹپا نام کے ایک امیدوار نے کہا۔ 'تمھیں پنشن نہیں ملی؟ چلو دیکھتے ہیں۔ سرکار پر مقدمہ کر دیں گے۔' اس طرح تمر نے اسے بھی سماج سیوا کا موقع دیا۔

بن ٹپا کے ساتھ تمر جب تحصیلدار کے یہاں پہنچا تو وہ بولے۔ ''یہ واضح نہیں کہ تمر پروویڈنٹ فنڈ اسکیم میں آتا ہے یا پنشن اسکیم میں، اس لئے اوپر کے افسروں سے مراسلت کر رہا ہوں۔'' سب حساب لگا کر بن ٹپا نے تمر کو بتایا کہ اسے پروویڈنٹ اسکیم کے حساب سے چھ سات ہزار روپے ملیں گے۔ بن ٹپا کی بات سے تمر کو خوشی ہوئی۔ اسے لگا کہ اس کی بیوی کو راج روگ ہی لگا ہے کیونکہ پیسے آنے کا حساب کتاب نظر آ رہا ہے۔ اگر پیسہ مل گیا تو اچھی دوا دارو کر کے بیوی کا مرض اچھا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح امید کی ایک کرن چمک اٹھی۔

پنشن ملنے کی امید میں تمر نے جہاں جہاں سے مل سکتا تھا وہاں وہاں سے چھوٹا موٹا ادھار بھی لیا۔ روز تحصیلدار کے آفس کی راہ دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی کی حالت آہستہ آہستہ بگڑنے لگی۔ پہلے اسے لگا پیشاب میں شکر جانے کو ہی تو شکر کی بیماری کہتے ہیں۔ اس سے کیا ہو جائے گا؟ یہ سوچ کر وہ تھوڑی لاپرواہی کرنے لگا۔ آخر میں بیوی نے بستر ہی پکڑ لیا۔

اِپّی کے پاؤں کے انگوٹھے میں کچھ کام کرتے وقت ٹھوکر لگنے سے گھاؤ ہو گیا تھا۔ جب تمر گھر لوٹا تو پاؤں کے انگوٹھے پر کچھ پتیاں پیس کر باندھے، وہ لنگڑا رہی تھی۔ اس دن تمر کچھ خوش ہی تھا۔ تعلقہ کچہری کے ایک بابو نے تمر کو بتایا تھا کہ اوپر سے جواب آیا ہے اور اسے کوئی سترہ ہزار روپے پروویڈنٹ فنڈ مل سکتا ہے۔ تحصیلدار نے تمر سے کہا تھا کہ اس نے جس جس سرکاری وبھاگ میں کہا تھا، وہاں سے صحیح کاغذات لے آئے۔ اس کام کی مشکلوں کا اندازہ نہ کر سکنے والا تمر

سترہ ہزار روپے پانے کی بات سے ہی خوش تھا۔

بیوی کو اس نے ساری بات تفصیل سے بتائی۔ ڈاکٹر ہلور نے کہا ہے۔ ''کوئی انجکشن دینے سے تیری بیماری لمحے بھر میں بھاگ جائے گی۔ دیکھیں تیرا نصیب کیسا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سترہ ہزار کی بات بتا کر خوش تھا۔

اس نے جس جس شعبے میں خون پسینہ ایک کیا تھا، وہاں جا کر درخواست کی۔ ''سر میں نے یہاں کام کیا تھا۔ اس بات کا ایک سرٹیفکیٹ بنا دیجئے۔ گھر میں کھانے کو ایک دانہ بھی نہیں، ساتھ ہی بیوی بیمار ہے۔ میرا پیسہ ابھی سرکار میں ہی اٹکا ہے۔''

ایک ایک سرٹیفکیٹ کے ساتھ ساتھ تبر کی فائل موٹی ہوتی گئی۔ وہ جہاں بھی جاتا وہاں اپنے بیتے زمانے کی یاد تازہ کرتا۔ اور انگریزوں کی حکومتی اصول کی تعریف کرتا۔ ہر ایک اس کی بات ہمدردی سے سنتا۔ سب ان دنوں کی بات سن کر لمبی سانسیں بھرتے۔

نگر پالیکا کے امیدوار بن پٹا نے تبر کو بتایا کہ سرکار سے روپے آنے میں دیر ہو تو وہ خود خرچ کر کے اسے منتریوں کے پاس بنگلور لے جائے گا۔ لیکن تبر کے لئے یہ مسئلہ تھا کہ اگر وہ بنگلور جائے تو اس کی بیوی کے لئے گنجی کون بنائے گا۔ کیونکہ اپّی کے پاؤں کا گھاؤ سوکھا نہیں تھا۔ اب وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھی۔ سرکاری اسپتال میں جب تبر نے اسے دکھایا تو انھوں نے کہا کہ اپّی کے پاؤں کی انگلی میں گینگرین ہو چکا ہے۔ انگلی کاٹنی ہی پڑے گی۔

تبر گھبرا گیا۔ ان کا بیڑا غرق ہو۔ ایک انگلی میں گھاؤ ہو جانے سے پاؤں ہی کاٹنے کی بات کر رہے ہیں۔ اگر سر میں چوٹ لگ جائے گی تو گردن ہی کاٹ ڈالیں گے کیا؟ کسی حکیم کے پاس بھی تو دوا ہو سکتی ہے۔ ذرا اسے بھی دیکھیں، یہ سوچ کر ''چلو'' کہہ کر واپس گھر لے آیا۔ تبر کی فائل اب پوری ہونے کو تھی۔ اس کی دوڑ دھوپ اور لگن دیکھ کر تعلقہ آفس کے چپراسی اور دوسرے گماشتے وغیرہ آپس میں کہنے لگے۔ ''اس بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اسے شیطان کی طرح پیسوں کی چاہ نے اسے جکڑ لیا ہے۔''

تبر نے پڈوگیرے کے ایک مہاجن شنبا شیٹی کے پاس جا کر درخواست کی۔ ''مجھے سرکار سے پیسہ ملنے والا ہے۔ مہربانی کر کے اس کے ادھار پر تھوڑا قرض دے دیجئے۔ میری بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''ارے بھیا! سرکار کے پیسے اور شمشان کی لاش دونوں ایک ہی چیز ہے۔ اپنی بیوی کی

بات چھوڑو۔ پہلے یہ پکا تو کرلو کہ ہو پیسے تمھارے مرنے سے پہلے تو مل جائے گا؟'' شگن بتانے والے کی طرح اس نے کہا لیکن تمر کا سوکھا منھ دیکھ کر وہ سہہ نہیں پایا۔ چنانچہ آگے بولا: ''یہ لو بوڑھے'' کہہ کر چار روپے تھمانے لگا، جو بھی ہاتھ لگے اسے پکڑلو۔ یہ سوچ کر چار روپے لے لینے کا لالچ تمر میں نہیں تھا۔

''بھگوان کی قسم مہاراج میں بیوی کے لئے بھیک مانگنے نہیں آیا۔ یہ چار روپے لے کر میں کیا کروں؟ تھوڑی رحم دلی سے دے سکتے ہی تو دیجئے۔'' کہہ کر وہ لوٹ آیا۔ تمر کو شیٹی کی بات میں ایک سچ جھلکتا دکھائی دیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ فائل کے ساتھ اس کی بیوی کے پاؤں کا گھاؤ ہوڑ کررہا ہے۔ انگوٹھے کے گھاؤ نے پورے پاؤں کو گھیر لیا تھا۔ اور اپنی درد سے تڑپنے لگی۔ تحصیلدار نے کہا تھا کہ اس نے تمر کی فائل اوپر بھیج دی ہے۔

''دوسرے دن تمر جب ان سے ملنے گیا تو وہ غصے میں آکر لڑکھڑاہٹ سے بولا: ''کل کی بھیجی آج واپس آجائے گی؟ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میں نے فائل چپڑاسی سے بھیجی ہے؟ اسے تو بنگلور جاکر واپس آنا ہے۔'' بن پٹا نے کہا: ''بھلے ہی کچھ بھی ہو جائے، چلو بنگلور تک جاکر آتے ہیں۔ تمھیں ایک نیا پیسہ بھی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں، میں ہی سنبھال لوں گا۔ میرے اس کام کے بدلے میں تم اپنے محلے والوں کے ووٹ بھر مجھے دلا دینا بس۔''

تمر کے گاؤں سے باہر جانے پر اپنی کے لئے کنجی بنا کر دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ خیر بن پٹا اور تمر نے یہ فیصلہ کیا کہ بنگلور جانے سے پہلے یہ پتہ لگا لینے میں کیا حرج ہے کہ فائل کس مقام پر ہے چک منظور کیوں نہ ہو آئیں۔ سو تمر اور بن پٹا چک منگلور میں ڈی سی آفس گئے۔ تمر کے اپنے فائل کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے پر گماشتے نے چیخ کر کہا: ''تم لوگ یہاں کیوں چلے آئے؟ تھرو پراپر چینل آنا چاہئے۔'' تب وہیں کھڑے چپراسی نے انھیں کھدیڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو نکلو یہاں سے!''

یہ دونوں جب آفس سے باہر نکل رہے تھے تب ہیڈ کلرک نے چپراسی کے ہاتھ صرف تمر کو ہی بلوا کر کہا: ''بن پٹا جیسے نیتا کو ساتھ لے کر گھومو مت۔ یہ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ چھیسواں یوم آزادی منایا جارہا ہے۔ اس وجہ سے کام ذرا دھیمے سے ہوگا۔'' کہہ کر ذرا اپنے پن سے ہی پیٹھ تھپتھپا دی۔

گھر پہنچتے ہی شام کا دھندلکا ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی نے بری طرح روتے ہوئے کہا: ''

میں زہر کھا کر جان دے دوں گی۔''

بے چارے تبر کو پتہ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ تب اس نے یہ کہہ کر تسلی دی۔ ''اب فائل کے سارے کام پورے ہو چکے ہیں، اب پیسہ آیا ہی سمجھو، بھلے ہی کتنے پیسے کیوں نہ لگیں، تمھیں منگلور لے جا کر علاج کراؤں گا۔''

تبر اور بن تیا اپّی کو اسپتال لے گئے، وہاں کے ڈاکٹر نے اپّی کا پاؤں دیکھ کر کہا۔ ''اسے فوراً سک لیشور کے اسپتال لے جانا ہوگا، وہاں اگر اس کا پاؤں گھٹنے تک نہیں کاٹا گیا تو اسے بچایا نہیں جا سکتا''

ذہنی طور پر پست ہو کر تبر جب بیوی کو لے کر واپس آ رہا تھا اور راستے میں تحصیل دار کے چپراسی نے کہا۔ ''تمھاری فائل لوٹ آئی ہے اور تحصیل دار نے تمھیں بلایا ہے۔''

اپّی کو بچا پانے کی ایک ہلکی سی امید نے تبر کو تحصیل دار کے یہاں جانے کے لئے اکسایا۔ تبر کی فائل چک منگلور سے آ چکی تھی، کسی کلرک نے ایک اعتراض کا نوٹ لگا کر لوٹا دی تھی۔ اس پر لکھا تھا ''شان باغ اور پٹیل کی طرف سے یہ سرٹیفیکٹ لگنے چاہئے کہ تبر ہمارے گاؤں کا باشندہ ہے۔'' گھر میں تبر کی بیوی چیخ رہی تھی۔ اب جلن سہی نہیں جاتی، دوا دوا کچھ نہیں چاہئے، چار آنے کا زہر لا دو۔''

تبر کے منھ سے نکلا۔ ''انگریزوں کے زمانے میں کتنا اچھا تھا، کھڑے ہی کھڑے انھوں نے زمین منظور کر دی تھی۔ کتنے بھلے لوگ تھے، خوش ہو کر انعام بھی دیتے تھے۔ اس طرح اس نے انگریزوں کے زمانے کو یاد کیا۔ ایسا لگا۔ اس وقت حکومت آج کی حکومت سے سچ مچ بہت اچھی تھی۔ ''حرامی، بے ایمان کہیں کے، چلے ہیں راج چلانے! نہ یہ دینا جانتے ہیں اور نہ لینا اور انھیں ریکارڈ چاہئے اور سرٹیفیکٹ چاہئے، اس طرح اس نے سودیشی سرکار کی مذمت کی۔

فائل اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر گھوم رہی تھی۔ اسی طرح کئی دن بیت گئے۔ دھیرے دھیرے شنّی کی کہی باتوں کا سچ تبر پر صاف ہونے لگا۔ بیوی کو بچا پانے کی امید کے ساتھ ہی دولت پانے کی امید گھل گئی۔

کچھ دن بعد تحصیل دار نے تبر کو بلا بھیجا۔ تبر کے وہاں پہنچنے پر ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا چہرہ اس کی روحانی اذیتوں کا آئینہ بنا ہوا تھا، اس کا گلا بھرا ہوا تھا۔

تبر کو دیکھتے ہی تحصیل دار نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تیرے بارے میں

پولیس نے رپورٹ بھیجی ہے۔اس میں لکھا ہے کہ تم نے اس نکسل وادی ہنومنتپا کے ساتھ جا کر چیف منگلور کے ڈی سی آفس میں شور وغل مچایا ہے۔'' آخر میں ذرا نرم ہو کر بولے۔'' تیری تکلیف دیکھ کر مجھے بھی رحم آرہا ہے۔ مالک کے اتنے کشٹ دینے پر بھی تجھے عقل نہیں آئی۔ آج تمھارے بارے میں favourable report لکھوں گا۔ پچیسویں یوم آزادی یعنی رجت جینتی کے بڑے جلسے پر تم اپنی طرف سے کوئی تحفہ دو۔'' تیمر کے چہرے پر مسکراہٹ دکھائی دی اس کے منھ سے نکلا۔'' میرے فنڈ کا پورا پیسہ لکھ لیجئے حضور۔''

تب تحصیل دار کو تیمر کے چہرے پر غیر یقینی اثرات دکھائی دئے۔

تیمر کو ایسا لگا کہ پولیس آفس شان بانغ پٹیل چپراسی وغیرہ سب ان بے رحم بے حق گھسیٹ کر لکھی فائلوں کے چکر دیو کی طرح ہے ۔ وہ انسانیت اور انسان پسندی کو بار بار چبا کر اگلنے والے شیطانوں کے جھنڈ ہیں۔ انسان کو مار کر مچھلی کی طرح سکھا کر فائلوں کے بیچ تہہ کر کے رکھنے والے بھوت سا تحصیل دار فائلوں کو لے کر کیسے کیسے اشارے کر رہا تھا۔ مسلی گئی روحیں، ڈیسک سے ڈیسک تک کس کر بھنچی کی گئی۔ فائلوں کے آگے کھسک رہی تھیں۔

اس جہنم کا کارخانہ دیکھ کر تیمر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اپنے لئے، اپنی بیوی کے لئے، اپنے ہی جیسے ذی روح تحصیل دار کے لئے، چپراسیوں کے لئے اس کے دل میں دکھ امنڈ پڑا۔ تب چپراسی تیمر کا ہاتھ تھام کر باہر چھوڑ آیا۔ تیمر کے دماغ کے پہلی جیسی صورت حال میں آنے میں کچھ وقت تو لگا ہی۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا۔

جب تیمر اپنی بیوی کو لے کر سنگ لیشور کے اسپتال گیا تھا تب انھوں نے اس سے کہا تھا کہ اسے اس بات کا سرٹیفکیٹ لانا چاہئے کہ وہ پرانا سرکاری ملازم ہے ساتھ میں اس میں یہ صاف لکھوا کر لانا چاہئے کہ نگر پالیکا کا ملازم سرکاری ملازم نہیں ہوتا۔

تیمر بیوی کو لے کر واپس آرہا تھا تبھی وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوگئی اور منھ سے جھاگ نکلنے لگا۔

تیمر نے گوشت کی دکان پر قصائی یوسف سے پوچھا۔'' میری بیوی کا پاؤں گھٹنے تک کاٹ کر دو گے۔''

وہیں کٹنے رکھے تین چار بکریوں کے سر آسمان کی طرف مسلسل ساکت ہیبت ناک آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

یوسف نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیوں رے، بیوی کا پاؤں کٹوا کر سالن پکائے گا؟''

وہیں کھڑے چار پانچ آدمیوں نے بھی'' ہے ہے'' کرتے ہوئے اس کی ہنسی میں اپنی ہنسی جوڑ دی۔

کچا گوشت کھا کھا کر موٹایا ہوا کتا چپ چپ کرتا نلی کی ہڈی چبا رہا تھا، بکریوں کے کٹے گوشت سے لال پانی ٹپک رہا تھا۔ ٹھیلے کے کونے بیٹھی والی ایک مریل لڑکی اپنی پتلی بانہیں مشینی انداز سے مکھیاں بھگانے کے لئے ہلائے جا رہی تھی۔

تمر کو شک ہوا کہ وہ بھی کام چکا ہے اور پریت سنسار میں پریتوں کے ساتھ گھوم رہا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب تمر کی بیوی گزری تو وہ ہنس رہا تھا۔ پڑوگیرے کے لوگ یہ طے کرنے کے لئے ''کہ تمر پاگل ہو گیا ہے۔'' بے چین تھے۔ کیونکہ بعد میں اس کی ساری مشکلیں دوسری دنیا سے رشتہ جوڑنے والی تھیں۔ کہیں صرف کچھ لوگوں کے سامنے اس کے دکھائی پڑنے پر وہ اپنی حکومت کے کام کاج کی اس بے حد خوفناک شکل کو دیکھ کر انجانے میں ہی خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔

آزادی کے پچیسویں جینتی کے موقع پر تمر کا پاگل ہونا محض ایک اچانک ہونے والا حادثہ ہے۔ جب سبھی لوگ بھارت کی آزادی کی تعریفیں کرتے تقریریں جھاڑ رہے تھے۔ تب تمر انگریزی حکومت کی تعریف کر رہا تھا۔ اس کا پاگل پن دیکھ کر سب کی ہنسی پھوٹتی رہتی تھی۔

تمر کے پاگل ہونے کی بات سن کر سب سے زیادہ فکر مند ہونے والے تحصیل دار ہی تھے۔ تمر کی لکھی رسیدوں کے حساب سے اس سے تین سو روپے وصول کرنے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ تمر کے دستخط لے کر اس کے پروویڈنٹ فنڈ سے تین سو روپے کاٹ لیں گے۔

آخری رپورٹ میں اس کے کردار کے بارے میں انھوں نے لکھا۔ ''اس کی دماغی حالت صحیح ہے۔ اس نے جو پیسے کھائے ہیں وہ غبن نہیں ہے۔ ہماری انتظامیہ کی کوتاہی کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہوگا۔''

اب تمر کے پاگل ہونے کی خبر پا کر تحصیل دار کا پاگل ہونا ہی باقی ہے۔

☆☆☆

کے۔ پی۔ پورن چندر تیجسوی کی پیدائش کوپلی، شیموگہ۔ سوگت ابری متو عطر کونگ لو شاعری کا مجموعہ ہے۔ ایمل پرشن نا تک، ہولی پوران سر ہدو، ابچوران پوشا فیسو کہانیوں کا مجموعہ، کرولو، چدمبر رہسیہ ناول۔ ساہتیہ اکیڈمی، کرناٹک ساہتیہ اکیڈمی، راشٹریہ سورن کمل انعام۔

کونکنی کہانی

ٹوٹا ہوا آئینہ

منوہر رائے سرڈیسائی

باباصاحب خود بھی ایک فنکار ہیں اور فنکاروں میں جو عام طور پر کمیاں ہوتی ہیں وہ انہیں چھو کر بھی نہیں گئیں۔ حسن کا متلاشی ہوتے ہوئے وہ جذبات کے غلام کبھی نہیں بنتے، جذبات کی آنکھوں کو انھوں نے کبھی بے لگام ہونے نہیں دیا۔ ان کے فن میں مہارت ہے مگر دیوانگی نہیں ہے۔ ان کی پابندیوں کو اور ان کے اصولوں کو ان کے فن نے کبھی گمراہ نہیں ہونے دیا۔۔ وقت پر کھانا، طے شدہ وقت پر سونا اور وقت کے حساب سے کام کرنا، یہ ان عادتیں ان کے نس نس میں سمائی ہوئی ہیں۔ پابندیوں کا اتنا بڑا پیروکار فن کار کیسے بن سکتا ہے۔ اس بات پر میں ہمیشہ حیرت زدہ رہتا تھا۔ اپنے اصولوں کے تئیں بے حد لگاؤ کی وجہ سے ہی ان کی زندگی آج تک صراط مستقیم پر چل رہی ہے۔ فن ہی سے لگاؤ کی وجہ سے ان کی زندگی سنور رہی ہے۔ ان کی شخصیت کی چھاپ ان کے ارد گرد کے دلوگوں پر بھی پڑتی ہے۔ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں ان سے محبت بھی۔ ان کے کمرے میں پیر رکھتے ہی اعلیٰ معیار زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

دیواروں پر ہلکا نیلا رنگ پتا ہوا تھا۔ دروازے کے ارد گرد بیل بوٹوں کی سجاوٹ تھی، بائیں طرف ایک کونے میں تپائی پڑی تھی جس پر چمکتے ہوئے بوٹ اور چپلیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ذرا آگے دیوار کے سہارے لکڑی کی ایک الماری کھڑی تھی جس میں سنگ مرمر کے تاج محل، ہاتھی دانت کے ہرن، بگلے اور سینگ، لکڑی کے بنے پھل جو دیکھنے سے رس سے بھرپور جان پڑتے تھے۔ داہنی دیوار کی طرف شیشم کی لکڑی کی بنی ہوئی میز پر کچھ کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر قدرت کے حسین مناظر لٹکے ہوئے تھے۔ اور دیواروں کے بیچ کونے میں ایک

تانپورہ شان کے کھڑا تھا۔ کمرے میں آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی کوئی چیز نہ تھی بلکہ ایک فنکار کی پرکھ کے لئے لطف اندوز کتابیں اور جریدے ضرور تھیں۔ پرکشش لیکن سیدھی سادی۔ تحریریں۔ فن اور حسن کی مہک کمرے میں بہہ رہی تھی۔ جب کوئی مہمان اس میز کے اوپر رکھی کتابوں کو ادھر ادھر کر دیتا تو بابا صاحب اسے بغیر قرینے سے رکھے رہ نہیں پاتے۔ اگر کاغذ کا کوئی ٹکڑا بھولے سے زمین پر گر جائے تو بابا صاحب اسے اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں اسی کمرے میں بیٹھ کر گپیں لڑایا کرتے۔ ایک دن میں آرام کرسی پر بیٹھ کر سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں کو دیکھ رہا تھا اتنے میں میری نظر کیل پر ٹنگے ایک آئینہ پر گئی جس میں سو ٹکڑے پڑے تھے اور اس میں سامنے کی دیوار کے بکھرے بکھرے عکس دکھائی پڑ رہے تھے۔ بابا صاحب کی حسن پرستی پر جیسے وہ ایک کلنک تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کی وضع قطع اور سلیقہ مندی اور حسن پرستی کا جو تصور میں نے کر رکھا تھا اسے آج بڑا دھکا لگا ہے۔ کیا آپ کی نظر کبھی اس ٹوٹے ہوئے آئینہ پر بھی گئی ہے؟ کیا یہ اس خوبصورت کمرے کے حسن کو ماند نہیں کرتا؟''

بابا صاحب کا انداز بے حد سنجیدہ ہو گیا جیسے کسی کانٹے جیسی یاد نے ان کے دل کو کھرونچ دیا ہو۔ کچھ دیر بعد انھوں نے آہستہ لہجے میں کہا۔ ''یہ دیکھئے جناب، یہاں کی سب چیزوں میں یہ آئینہ مجھے بہت ہی زیادہ پسند ہے۔ میں مانتا ہوں کہ حقیقت میں یہ خوبصورت نہیں ہے لیکن سب پسندیدہ چیزیں خوبصورت کہاں ہوتی ہیں۔ اس آئینے کی بے شمار لکیروں میں ایک ایسی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ جو کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔''

میں غور سے سننے لگا، بابا صاحب کہتے گئے۔ ''وہ ہوتا تو اس کی عمر تیس برس کی ہوتی''

''کس کی؟'' میں نے چونک کر پوچھا

''میرے لڑکے کی۔''

''تو کیا آپ کے لڑکا بھی تھا۔''

''ہاں اس وقت اس کی عمر تھی چھ برس، ہنس مکھ اور سڈول لڑکا، خوب باتونی، اور خوب کھیلتا بھی تھا۔ لیکن میرے کمرے میں آنے کی ممانعت تھی اسے، میری پابندیاں اور اصول کڑے تھے، میری چیزوں کو کوئی چھو دے یہ مجھے قطعی پسند نہیں تھا۔ ایک دن میں داڑھی بنانے کے لئے میز پر جا بیٹھا، دروازہ کھول کر داڑھی بنانے کا سامان نکال کر میز پر رکھا اور آئینہ ڈھونڈنے لگا۔ مگر کسی نے اٹھا کر آئینہ کو میز پر رکھ دیا تھا، میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو اس کے بے شمار ٹکڑے ہو چکے تھے

جس سے میری صورت تیڑھی میڑھی دکھائی دی، میں جھلا اٹھا، شاید میرے کمرے میں کوئی آیا تھا اور اسی نے میرا آئینہ توڑ دیا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہ رہا۔ میں نے یمنا کو بلایا اور ڈانٹ کر پوچھا، اس آئینے کو کس توڑا؟

''مجھے پتہ نہیں، میں نے آپ کے کمرے میں آج تک پیر نہیں رکھا۔'' یمنا نے جواب دیا۔

میں نے ولاس کو بلایا، وہ ہنستے ہوئے میرے کمرے میں آیا۔ میں نے اس پوچھا۔'' ولاس آئینے کو تو نے ہی توڑا ہے نا؟''

ولاس نے ہنس کر ہی جواب دیا۔'' ہاں مجھ سے ٹوٹ گیا۔'' میرا غصہ اور بڑھ گیا۔ اتنا چھوٹا سا لڑکا آئینہ توڑ دیتا ہے اور اس طرح بیکڑی سے بات کرتا ہے اور اس پر ہنستا بھی ہے۔ میرا خیال تھا ایک، مجرم کی طرح گردن جھکا کر وہ معافی کا طلبگار ہوگا۔ اگر چہ اس کو اپنے کرتوت کی سنجیدگی کی ذرہ برابر پرواہ نہ تھی۔ اسے اپنے باپ کے مزاج کا خیال بھی نہیں آیا۔

مجھے ایسا لگا کہ اس لڑکے کو ذرا خوف دکھانا چاہئے، اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے باپ کی نافرمانی کرنے پر کیا انجام ہوتا ہے۔ میرے کمرے میں وہ آیا ہی کیوں؟ میری چیزوں کو اس نے ہاتھ لگایا ہی کیوں؟ میرا غصہ حد پار کر گیا۔ میں نے اس کے گال پر ایک چانٹا لگا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اتنا ہی کافی ہوگا۔ ولاس رونے لگے لگا اور منتیں کرے گا، معافی مانگے گا، اور میں پھر کبھی کمرے میں نہیں آؤں گا وغیرہ کہے گا لیکن اس نے اپنی آنکھوں میں ذرہ برابر آنسو نہیں آنے دیا۔ اور منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ مجھے اور بھی غصہ آ گیا۔ اتنا چھوٹا سا بچہ ہے اور اتنی اکڑ، میں نے کونے میں رکھی چھڑی اٹھائی اور اس چھوکرے کے کندھے پر، پیٹھ پر، ہاتھ پر مارنے لگا۔ خوفناک حد تک چھڑی میرے ہاتھوں میں ناچ رہی تھی۔ مجھ پر اور میری چھڑی پر ایک طرح کی دھن سوار ہوگئی تھی۔

''جیسے ولاس کو میرے مزاج کی پرواہ نہیں تھی ویسے مجھے اس کے بچپنے کا پتہ نہیں تھا۔ میں کب تک اس کو مارتا رہا، اس کا مجھے احساس نہیں ہوا۔ میری غصے سے بھری چلاہٹ سن کر یمنا جو تھوڑی دیر پہلے چلی گئی، دوڑتی ہوئی واپس آ گئی۔ میرے غصے کی یہ خوفناک شکل دیکھ کر وہ ڈر گئی، بچے کی حالت دیکھ کر اس کا دل پگھل گیا اور اس نے میرے ہاتھوں سے ولاس کو چھڑا لیا لیکن یمنا بہت دیر میں آئی تھی، چھڑی اپنا کام کر چکی تھی اور میں بیوقوفی کر بیٹھا تھا۔ اتنی بیوقوفی میں نے زندگی

میں کبھی نہیں کی ہوگی۔'' کہتے کہتے بابا صاحب کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ گناہ گار کی طرح انھوں نے گردن نیچے جھکالی اور جذبات کی شدت سے اور غم زدہ یادوں کے کانٹوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔'' کیا کیوں، اور کیسے کہوں!؟ پیٹنے کا جو نتیجہ ملنے والا تھا، وہ مل گیا۔ ولاس کا بدن سوج آیا اور دوسرے دن اس کو بخار آ گیا۔ میں اسے دیکھنے گیا، اپنی آنکھیں بند کئے وہ بستر پر لیٹا تھا۔ درد سے کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔ ولاس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سہم گیا۔ ڈرے ہوئے ہرن کی طرح میری طرف دیکھ کر اس نے ایک چیخ ماری۔ وہ چیخ میرے دل میں بہت گہرائی تک سما گئی۔ میں بے قرار ہوکر اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ دل ہی دل میں رو پڑا۔

بہت علاج کئے گئے۔ حکیم کی دوا دی گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ دعائیں مانگی گئیں لیکن ولاس کے نازک جسم پر بے شمار چھڑیاں پڑی تھیں۔ اور اس کے دل کے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ مجھے اب لگا کہ میں اس کے پاس جاؤں، اسے سمجھاؤں، اس سے معافی مانگوں۔ مگر مجھے دیکھتے ہوئے ایسے چیخ پڑتا جو بیان سے باہر ہے۔

'' وہ دردناک چیخیں میرے دماغ میں گونجنے لگیں اور میرے دل کو چھیدتی رہتی ہیں۔ میں اسی پس و پیش میں سوچتے سوچتے پاگل ہوا تھا۔ اور مجھے اب لگا کہ میں ہی اس کے لئے ذمہ دار ہوں میں نے ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔

'' ساتویں دن ولاس کی چیخیں بند ہوئیں اور ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ میرا دل پاگل ہوگیا۔ مجھے کھانے پینے کا خیال نہیں رہتا، نیند نہیں آتی اور آنکھوں میں رات دن آنسو بہتے رہے۔ میری اصول پسندی کہاں کھوگئی، مجھے معلوم نہیں۔ میں جب چاہتا تب اٹھتا، ندی کے کنارے جاکر گھومتا رہتا اور دل جب کچھ ہلکا ہو جاتا تو واپس لوٹ آتا۔

اسی طرح دن گزرتے تھے، آخر میرا دماغ سدھرا لیکن میرا مزاج بالکل بدل گیا اور خاموش رہنے لگا۔ دل بہلانے کے لئے میں نے موسیقی کا سہارا لیا، برش لے کر میں قدرتی مناظر کی خوبصورت تصویریں اتارنے لگا۔ اپنی اصول پسندی کو میں نے فن کے ساتھ جوڑ دیا۔ فنکاروں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو بھلانے لگا۔ انسانیت کی قدر و قیمت پر غور و فکر کرنے لگا۔ کونے سے چھڑی کو نکال کر میں نے اسی جگہ تانپورے کو رکھ دیا۔

مگر انسان کی فطرت میں بہت بدلاؤ نہیں ہوسکتا اس لئے میں نے وہ ٹوٹا ہوا آئینہ وہاں

پر لٹکا دیا ہے۔ جب مجھ میں چھپی ہوئی اصول پسندی کی شدت اپنا سر اٹھا کر خوفناک شکل اختیار کرنا چاہتی ہے تو میں اکثر اس آئینے پر نظر ڈالتا ہوں، اس میں مجھے وہ اس کا بے بس چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ خوف زدہ چیخیں میرے کانوں میں پھر سے گونجنے لگتی ہیں تو میں اپنے آپ کو سنوار لیتا ہوں۔''

باباصاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، کرب و درد کی وجہ سے اداس ہوتے ہوئے اس چہرے کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ اصول پسندی کی شدت اور حسن پرستی کے خول کے نیچے مجھے ایک باپ کے ٹوٹے ہوئے دل کا آج درشن ہوا۔

☆☆☆

گجراتی کہانی

چتا

رگھوبیر چودھری

آگ پر راکھ پڑی ہے۔ راکھ کے اوپر کی پرت ٹھنڈ پڑ جائے ایسی کڑا کے کی ٹھنڈ سے درمیانی رات ٹھٹھری سی گئی ہے۔ گھٹنے پر پیشانی کو ٹکا کر جیوڑ بیٹھا ہوا ہے۔ الو کی آواز سے کھیت کا پچھمی کونا جیوڑ کی پلکوں کو ٹٹولنے لگا۔ اس نے جذبات سے عاری نگاہوں سے پچھم کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی ہو رہی آگ کو ایک دم بجھنے سے روکنے کی سوچا۔ اس نے ایک لمبی پھونک ماری اور تنکا اڑا، تنکے کے اڑنے سے جیوڑ سوچ میں پڑ گیا۔

آج ایک جوان عورت کی موت ہوئی۔ چتا اب تک جل رہی تھی۔ آدھا گھنٹہ پہلے جیوڑ پھر سے دیکھ آیا تھا۔ سبھی لکڑیاں جل چکی تھیں کچھ بھی ٹھیک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لکڑیوں کے انگارے الگ ہو رہے تھے۔ انگاروں کا درمیانہ حصہ بھی دھدھک رہا تھا۔ پورے شمشان میں تپش تھی۔ تھا۔ لیکن اب چتا کے انگارے آہستہ آہستہ راکھ میں بدلتے جائیں گے۔ کل صبح تک نیچے کی زمین صرف گرم ہوگی۔ کتنے مضبوط گانٹھ والے انگارے کوئلے میں تبدیل ہو کر بچ جائیں گے۔ اس کے بیچ تھوڑے ہڈیوں کے ٹکڑے دبے ہوں گے۔ کچھ باہر بھی دکھائی دے گا۔ دو تین تک جیوڑ کی نظر غیر ارادتاً ہی اس بکھری ہوئی راکھ اور پھر اس سے بنے ہوئے ڈھیر کی طرف ہی جائے گی۔ پھر سے وہ ڈھیر چاروں طرف پھیل جائے گا اور آگے کے لوگوں کے ذریعہ الگ ہٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس مرے ہوئے آدمی کا کوئی بھی نشان نہیں رہے گا۔ کئی ایک کی ہڈیوں کے ساتھ وہ بھی مل جائے گی۔ جیوڑ یہ سب دیکھتا رہے گا اور سوچتا رہے گا۔

جیوڑ کا کھیت بڑا ہے۔ شمشان سے تو بہت بڑا۔ شمشان تو محض بیس بیگھہ ہوگا۔ اس میں

بھی اتر کی طرف ببول کی جھاڑی ہے۔ پورب کی طرف گڈھا ہے اور دکھن کی طرف جیوز کا کھیت۔ شمشان کا یہ دکھنی کنارہ جیوز کے کھیت کو بیچ سے الگ کرتا ہے۔ ایک لمبے چوڑے جسے کو ٹکڑوں کی شکل میں بانٹنے جیسا۔ اس جگہ پر کھیت میں داخل ہونے کا راستہ تنگ ہے۔ دو گاؤں کو جوڑتی ہوئی خاص سڑک بیچ سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس لئے کھیت میں آتے وقت جیوز آدھا شمشان پار کر چکا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی راستے میں پیر رکھنے سے پہلے وہ کھڑا رہ جاتا ہے۔ پیٹھ پھیرے بنا ہی وہ پیچھے نظر کرتا ہے۔ اس کی نظر شمشان کو پار کر سامنے کے کنارے پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک دن رات کے خواب میں اس نے دیکھا تھا کہ اس کنارے پر پیپل اور جامنوں سے الجھی ہوئی جھاڑی ہے۔ وہ پیڑ ہلتا نہیں، ہوا جڑ کے تنے کے پاس سے ہو کر گزرتی ہے اور بیچ کے گہرے گڈھے میں گول گول گھوما کرتے ہیں۔ وہ گڈھے کا پچھمی کنارہ تھا۔ اس پیپل کا آدھے پر سے کٹے ہوئے تنے کی جڑ گڈھے کے بیچ کھلی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر بغیر چھت کے ایک جھونپڑی ہے۔ اس میں اکیلے تنہا لڑکے کو جیوز نے دیکھا۔ سنہرے بالوں سے اس کی آنکھیں ڈھکی تھیں اور گال پر بہے ہوئے آنسوؤں کی سوکھی پڑی لکیریں دکھ رہی تھیں۔ وہ بچہ داہنے ہاتھ کی کانی انگلی کو پکڑ کر بیٹھا تھا، وہ اوپر دیکھتا ہی نہیں تھا۔ جیوز کیا کرے؟ اسے پکار کر بلانے کا دل ہوا لیکن آواز نکلی ہی نہیں۔ یہ خواب تھا..... پھر بھی اس میں دیکھی ہوئی جگہ کو اس کی نگاہیں ڈھونڈتی تھیں۔ آخر میں اس نے دل کا راضی کر لیا۔ تب کھیت میں قدم رکھا۔

اس کا کھیت، آگے دیکھا، لیے بہت بڑا ہے۔ کھیتی سے اچھی آمدنی ہے لیکن اس بات کا خیال اس کے کپڑے لتے اور اس کے بے ترتیب رہن سہن کو دیکھ کر آتا ہے۔ اس کی کتنی خالی زمین کو دیکھ کر نہیں۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ اس کے کھیت کی پیداوار بہت اچھی ہے۔

جیوز کی بیٹی کا نام رلی ہے۔ وہ پانچ برس کی ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ اس کی خوبصورتی تتلی کی یاد دلاتی ہے۔ شادی کے سات سال ہو گئے، پانچ سال سے جیوز خود روٹی بناتا ہے۔ ابھی تو رلی کب بڑی ہو اور ذمہ داری اٹھائے گی؟ اور بڑی ہو کر رہی باپ کے گھر کتنا رہے گی؟ یہ سب خیال جیوز کو نہیں آتے، لوگ ایسا کہتے ہیں۔

گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ جیوز بھٹک گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے ترتیب زندگی جی رہا ہے۔ جیتا تو کیا لیکن ایسا رہتا ہے۔ باہر سے جو دکھائی دیتا ہے اسے دیکھ کر باری باری سبھی سے لوگ یہ قبول کرنے لگے ہیں کہ کہاں آج کا بدحال جیوز اور کہاں چار پانچ سال پہلے کا تانے کی

مورتی جیسا جیوڑ۔۔ کچھ لوگ یہ فرق جان گئے ہیں اور وہ بھٹک گیا ہے اور ایسا کہنے والے کی مخالفت نہیں کرتے۔۔۔ جیوڑ بھی اس بات کی مخالفت نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسے کیا ہوا ہے۔

ایک مدت کے بعد پچھلی گرمی سے گاؤں والوں کو جیوڑ کی بھاری بلند آواز سننے کو ملی۔ البتہ وہ آواز کہیں کہیں سے کمزور ہو گئی تھی۔ اس میں تعارف تھا ٹھوس پن نہیں، اس وجہ سے اس کی آواز بلند ہے ایسا کہنا مبالغہ ہوگا لیکن کل ملا کر تو اتنا ہی کہنا ہے کہ پہلے جو بلند آواز تھی، وہی یہ آواز ہے۔ یہ بات صاف ہونی چاہئے، راس کھیلتے وقت گربی کی کڑی اٹھاتی جو آواز پورے میدان اور مندر کے گنبد تک چھا جاتی، وہ آواز تو برباد ایک دم کیسے ہو جائے گی۔ اسی لئے تو سبھی یہ آواز سن کر گھبرا گئے۔ پورے گاؤں کو اونچا نیچا کرنے والے پنچ آج میٹھی صلاح دینے آئے تھے، تب بھی جیوڑ نے اپنے سامنے دیکھا نہیں۔ اس نے سب کو سنا دیا۔ ''کیسی بات لے کر آئے ہیں؟ سبھی اپنے کو کیا سمجھتے ہیں؟''

سر جھکا کر سبھی چلے گئے۔ جیوڑ چوکھٹ پر اکیلا کھڑا رہا۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے اپنے گھر سے کسی کو چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ پہلے تو اس کا گھر مہمان نوازی کے لئے مشہور تھا۔

وہ الاؤ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چرنی میں سے چھوڑا ہوا چارہ ٹوکری بھر اٹھا لایا۔ الاؤ دہک اٹھا۔ آگ کی لپٹیں اس کی آنکھوں کی بھنوؤں کی اونچائی تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن لپٹوں میں گرمی کیوں نہیں تھی؟ اسے لگا کہ شاید برف پڑے گی۔ تھوڑی دیر الاؤ ہاتھ سے دور رہ جاتا تو اسے لگتا تھا کہ انگلیوں کے چھور جل رہے ہیں۔ یہ برف پڑنے کی پہلی نشان دہی ہے۔

بعد میں سونے کے لئے رات نہیں رہے گی۔ اس لئے کاہلی چھوڑ وہ سونے چلا۔ اسے دیکھ کر بیلوں نے گھنگھرا بجایا۔ جوار کے دو پولے (مٹھا) ٹکڑے کر کے ناند میں رکھے۔ اور پھر چھپر پر چڑھ گیا۔ چار کو بغل میں رکھا اور گدڑی اوڑھ لی۔ آج تمباکو تھی اس لئے اس نے چلم پینے کی خواہش کو کوک لی۔

اس نے ایک بار چہرے سے گدڑی ہٹا کر دیکھا۔ چاند ڈوب رہا تھا، آج پوش مہینے کی گیارہویں تاریخ تھی۔ اور وہ تھی پوش کی بارہویں تاریخ....

نیند نہ آنے کی وجہ سے وہ کروٹ بدلتا رہا۔ اسے لگا کہ آج نیند نہیں آئے گی اور بیٹھ گیا لیکن کچھ کرنے کو سوجھا نہیں تو پھر لیٹ گیا۔ ماتھے پر چادر لپیٹ کر اس نے سونے کی کوشش کی۔

تھوڑا وقت تیزی سے بیت گیا۔ اب آہستہ آہستہ جیوڑا اپنے پورے جسم پر گھومتے بوجھ کا احسا ہونے لگا۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جس میں ناکام ہونے پر وہ بے چین ہو اٹھا۔ دائیں طرف چاندی کی چوڑ (کنڈلی) بجنے لگی۔ اس کے کان کے پردے کانپنے لگے۔ ایک تیز آواز بائیں کان کو چھیدنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک تیسری آواز سنائی پڑی۔ وہ گلے میں پہنے ہوئے زیورات کی تھی۔ جب تینوں آوازیں مل کر ایک ہو گئیں تب جیوڑ کے سینے پر ایک ہاتھ آ کر رکا۔ وہ ہاتھ حملہ آور نہیں تھا۔ گلے میں پہنے جانے والی ہار جیسا پر کشش تھا۔ تردد سے وہ ایک دم جامد تو نہیں ہو گیا ہو گا نا؟ ایسا سمجھ کر اس نے بے حد ہوشیاری سے اس ہاتھ کو دبایا۔ کروٹ بدل کر اس نے اس ہاتھ کا پیچھا کرنا چاہتی۔ کایا کو قابو میں لے لیا۔ پھر بھاری ہوا نہیں، راز کھل گیا۔ دوسرے ہاتھ میں ہنسیا تھی۔ وہ دیکھ کر تو کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔ جیوڑ نے ہنسیا چھین کر زور سے پھینک دیا۔ وہ اونچے جا کر نزدیک ہی گری۔ بھیگی زمین میں اس کی نوک دھنس گئی۔

''لوگوں کی بات صحیح نکلی''

''کون سی بات؟''

''کہ تو بھوت ہو گئی ہے۔''

''تم ایسا مانتے ہو صحیح، میں بھوت ہوں ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ہاں، ضرور ہو سکتا ہے، انسان کی روح ایسی پرچھائیں بن کر بھٹکا کرتی ہے!''

''نہیں نہیں، یہ تمھارا وہم ہے، میں بھوت نہیں ہوئی، کچھ ہوئی نہیں''

''دیکھو، ایسی بکواس نہیں، تو دیکھو تمھیں آغوش میں لیتا ہوں۔ اب بول!''

''اوہ! تم تو قصائی ہو''

''قصائی؟ تم بھی ایسا مانتی ہو تیجی؟ سارا گاؤں بھلے ہی کہے، مگر تم بھی ایسا کہوگی؟ مجھے کیا پتہ کہ ہنسیا کی نوک بس لگتے تجھے دھنس بنکار (دھنس چلنے کی تیز آواز) ہو جائے گا۔ اور میں بے معنی ہو جاؤں گا؟''

''قصور تو میرا ہی تھا لیکن اب کیا ہوگا؟ غصے کی زیادتی میں میں نے دودھ اور چینی لی اور بات چھپا کر پڑی رہی، تمھارا قصور نہیں''

''لیکن سارا گاؤں مجھے قاتل کہتا ہے۔''

''غلط بات... لوگ تو سب بھول گئے ہوں گے۔ کتنے سال ہوئے!''

''نہیں کل رئی پوچھتی تھی۔''

''کیا پوچھتی تھی؟''

''کہ میں نے تو بیتی کو مار ڈالا ہے، لوگ ایسا کہتے ہے۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کہا، صحیح بات ہے، بیٹا! میں نے ہی تیری ماں کو مار ڈالا ہے۔''

''ایسا مت بولو آپ، ہائے رام، میں کس طرح واپس آسکوں گی؟ اب کس طرح بیتی کے روپ میں آکر رئی کو گود اٹھاؤں، تمھارے پیر دباؤں؟ کیا کروں؟ اب میں کیا کروں؟''

بیتی بیٹھ گئی اور جیوڑ کے پیر پر پیشانی رکھ کر رونے لگی۔

''مجھ سے بھول ہوگئی، مجھے معاف کرو۔ اب دوسری شادی کرلو، دکھی مت ہو۔''

''یہ کیا بولی؟ ایسا شاید نہ ہوگا۔''

''تم سے وعدہ لئے بغیر آج مجھے نہیں جانا ہے۔''

''نہیں، وہ نہیں ہوگا نہیں، شاید نہیں ہوگا، شاید نہیں۔''

اپنی آواز سن کر جیوڑ جاگ گیا۔ دور روتے سیار نے اپنی آواز بیچ میں ہی توڑ دی۔ شمشان کے دوسری طرف کتا بھونکا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ سویرا ہو گیا تھا۔ جیوڑ کی پلکیں بھاری ہوگئی تھیں۔ سر پر مریٹھا باندھ کر وہ الاؤ کے پاس گیا۔ آگ سلگائی، سامنے کی پڑتی زمین کی کالی بنتی مٹی اجالے میں چمکنے لگی۔ آگ پھر سے جلانے کہ اتنے میں تو وہاں رجک (میتھی کی ذات کی گھاس) اگ آئی۔ رجک کی پھنگی پر وہ ٹھہرے یا نہ ٹھہرے اس طرح ایک جوان لڑکی چلنے لگی۔ رجک کے چھوٹے چھوٹے سفید پھول اونچے ہو ہو کر پھنگی پر کی کو ملتا سے ان پیروں کو ہتھیلی کا لمس کرانے لگے۔ وہ جوان لڑکی لبھا گئی اور کندھے پر سے آنچل کھسکا کر نیچے آبیٹھی۔ رجک کو کاٹنے لگی۔

''تمھیں کس نے یہ کام کرنے کو کہا؛''

''ہماری مرضی''

''اٹھ اٹھ اب، مرضی والی! الٹا کام ہی کرنا ہے۔''

''دیکھا ہے بڑا سیدھا۔''

''اٹھ نہیں تو گھسیٹی جائے گی۔''

''جا جانا مرد کہیں کا۔''

اور ہاتھ میں چھینی گئی ہنسیا اٹھائی اور آوہ، جیسے جیوڑ کی اپنی پیشانی پر ہی لگی ہو!۔ اس نے آنکھیں دبا دیں۔ پھر سے اونچا دیکھا، تب خون کے دو تین داغ اس کے سامنے الگ الگ شکل اختیار کر کے گول گول ناچنے لگے۔ اس کی رفتار بڑھنے لگی۔ دائرے دکھنے لگے۔ دائرہ چھوٹا ہو گیا اور اس میں چاند بھر گیا۔ چاند کے اوپر ایک داغ ابھر آیا۔

پورب سمت میں سرخی مائل روشنی پھوٹی۔ وہ منظر دھندلاتا چلا گیا اور دوری بڑھتی گئی اور پچھم کنارے پر جا کر غائب ہو گیا۔ سرخ مائل روشنی بڑھتی گئی اور سورج طلوع ہونے جیسے حالات بننے لگے۔

کوڑے کے پاس جا کر جیوڑ نے ایک سوکھا اپلا ہاتھ میں لیا اور لا کر الاؤ میں ڈالا۔ چھپر کے نیچے الٹے پلٹے پڑے ہوئے جوتے پہن کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر جانے والے راستے کے پاس کے کھیت کی میروں سے ہو کر وہ چل رہا تھا۔ گاؤں کے قریب کے ایک کھیت میں مہوا کے نیچے الاؤ دکھا۔ وہاں بھرتھری کے ایک خاندان نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ دو بچے اور اس کے باپ۔۔۔ باپ ہی ہوں گے۔ چھوٹے لڑکے کے پاس سارنگی تھی۔ باپ اس طرح گا تا تھا جیسے وہ اسے سکھا رہا ہو۔

پہلے پہلے جگ میں رانی.....
ہم رے تو تا رائے، راجہ رام کے
اترا کھنڈ میں املی پکی تب
تو تے نے ماری مجھے چونچ.....

چھوٹا تھا تبھی جیوڑ کئی بار یہ گیت سن چکی تھی۔ پاٹھ شالہ اتنا گھوری کھیلتے وقت کئی بار اس گیت کی لائنوں کی مدد اسے ملی ہوگی۔ آج بھی اس نے پچھلا ئیں سنیں۔ بچپن اور اس کے بعد پوش مہینے کی بارہویں تاریخ تک کا بیتا ہوا وقت اسے یاد آیا۔ اس کے قدم گھر تک پہنچ گئے تھے۔ آنگن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

جیوڑ کی آواز سن کر رئی جاگ گئی۔ کاکی کے گھر سے اپنے گھر آئی۔ جیوڑ نے بھینس دوہی۔ رئی نے چولہا جلایا، جیوڑ نے چائے بنائی اور دونوں نے پی۔

''آپ... آپ روتے ہیں.... آپ روتے ہیں باپو؟''

''نہیں بیٹا، وہ تو دھواں ہے نا!'' آواز کو سپاٹ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جیوڑ نے

جواب دے تھا۔ ''مجھے کھیت میں کام ہے بیٹا! یہ دانہ ابل جانے تک آگ جلانا اور تاپنا۔ تب تک میں آتا ہوں۔''

وہ کھیت کی طرف چل پڑا۔

سورج نکل آیا تھا۔

شمشان بجھ گیا۔ ٹھنڈی پڑی چتا کی طرف پھر ایک بار نظر کر جیوڑ نے اپنے کھیت میں قدم رکھا اور پھر ایک بار پیچھے دیکھا۔ اب دوپہر تک وہ کھیت میں ہی رہے گا اس کا کھیت بہت بڑا ہے۔

☆☆☆

میں دکھ کی لمبی رات

بھارت ساسڑے

ایک بہت پرانا گانا ہے۔ ''میں دکھ کی لمبی رات ہوں۔'' اس گانا کے ساتھ ہے 'میں ہوں۔ ساتھ ہے بارش اور یہ درمیانی آخر شب' یہاں اسٹیشن پر بہت سارے لوگ ان میں کچھ اونگھتے ہوئے، پٹری پر چھپاتا پانی، ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی ـــــ دور اندھیرے میں گھلتی ہوئی۔ پچھلے کسی اسٹیشن پر کوئی حادثہ ہوا ہے شاید...... پتہ نہیں گاڑی کب تک آئے گی۔ سارے ویٹنگ روم بھرے پڑے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر کا کوئی پتہ نہیں۔ لوگ پریشان ہیں نیند سے گھرے ہوئے، کڑاکے کی ٹھنڈ، آہستہ مگر لگاتار برستا پانی، چیمڑ سا، رات گہری اور من کے کسی کونے میں گھمڑتا ہوا وہی پرانا گانا کہ۔ ''میں دکھ کی لمبی رات ہوں'' اور یہ خالی خالی سا اسٹیشن۔

رین کوٹ اوڑھے میں آوارہ سا اسٹیشن پر ٹہل رہا ہوں۔ میرا اس طرح چکر لگانا وہ ماروا ڑی سہ نہیں پا رہا ہے۔ اسے نیند نہیں ستا رہی ہے۔ وہ بس یوں ہی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ کچھ گھبرایا سا وہ اپنی صندوق پر بیٹھا ہے۔ قریب ہی بیٹھی اس کی بیوی اونگھ رہی ہے۔ نہیں اس آدمی سے دوستی ہونے سے تو رہی۔ میری نظر کسی اور کو تلاشنے لگتی ہے۔ وہیں ایک کتا پانی میں بیٹھا ہے۔ مجھے تاک رہا ہے، میری جیب میں ہاتھ ڈالتے ہی وہ دم ہلانے لگتا ہے اور بڑی امید سے میری طرف دیکھنے لگتا ہے۔ عجیب مصیبت ہے، میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں ـــــ گہری نظر سے۔ میری سگریٹ بھی ختم ہونے کو ہے، ویسے میں نے دو بچا کر رکھ لئے ہیں، ایک اپنے لئے اور دوسری اس نئے دوست کے لئے جو مجھے اس پلیٹ فارم پر شاید مل جائے، جس کے ساتھ گپ شپ ہو، کچھ نیا سن پاؤں، یوں باتیں کرتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ ساتھ رات بھی گزر جائے۔

بجلی کوندگئی۔ بارش بھی تیز ہو گئی ہے۔ چھت پر برستے پانی کا شور بڑھ گیا ہے۔ پٹری اور اس کے پار دور تک بارش چھا گئی ہے۔ اس کی آڑی ترچھی چبھتی بوچھاریں، رین کوٹ کے اندر بھی گھستی ہوئی بوندیں، ۔ میں پلیٹ فارم پر دھیرے دھیرے گھوم رہا ہوں۔ چائے کی دکان بند ہو چکی

ہے۔ پٹری والے لڑکے نے کچھ دیر پہلے مجھے دو دو سگریٹ دی تھی۔ اس کا اسٹاک بھی ختم ہو گیا تھا۔ دودھ ختم ہو گیا ہے اس لئے چائے بھی نہیں...... اب وقت کٹے بھی تو کیسے؟ خالص اکیلے پن کی نئی مصیبت اور وہ بھی اس درمیانی شب میں۔

دکان کی اوٹ میں ایک لڑکی، پٹری والے لڑکے کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی ہے۔ شاید کم سن طوائف ہی ہے۔ وہ پانی میں بھیگی ہوئی ٹھٹھر رہی ہے۔ میں ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے چہل قدمی کر رہا ہوں۔ کتا بھی میرے پیچھے پیچھے لگ گیا ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ گپ شپ کیسے کر سکتا ہوں بھلا؟ اور آس پاس اتنے لوگوں کی موجودگی پر...... میں ایک جگہ پر رک جاتا ہوں۔ چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہوں کچھ وقت پہلے کی طرح اب بھی بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں ہے۔ پلیٹ فارم کے بینچوں پر اونگھتے لوگ۔ بھی آنکھیں بوجھل، بند...... پلیٹ فارم پر پھیلی مدھم روشنی اور بارش کی آواز۔ وہ عورت تو اس قدر اونگھ رہی ہے جیسے بستر پر آرام سے لیٹی ہو۔ آسمان کی طرف چہرہ کئے جھپکیاں لے رہی ہے۔ نہ اسے اپنے پلو کا ہوش ہے نہ اپنے زیوروں کا لیکن بیوقوف سا دکھائی دینے والا اس کا شوہر ہوشیار ہے۔ کچھ گھبرایا ہوا بھی، وہ میری طرف شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو فوراً اس نے نظر پھیر لی۔ میں مایوس...، دوستی کی یہ کوشش بھی ضائع ہو گئی۔ میں ایک عد پارٹنر کی تلاش میں ہوں جو میرے ساتھ سگریٹ پئے اور کوئی قصہ کہانی بیان کرے۔ بات چیت ہو جائے تب آخر شب آرام سے کٹ جائے۔ میں اس عورت کے سینے کی ابھاروں پر ایک نظر چوری سے ڈال لیتا ہوں۔ مجھے سگریٹ کی گرماہٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر نہیں...... میں اکیلے سگریٹ پینا بھی نہیں چاہتا، کسی ایک ادھ کہانی کی طلب ہے۔ کچھ جوشیلا، رنگیلا دلچسپ سننے کو دل چاہ رہا ہے۔ یا پھر...... کوئی گیت...... جیسے میں دکھ کی لمبی رات۔

ایک دبلا پتلا آدمی اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ تساہل بھری ایک انگڑائی لیتا ہے۔ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سامنے کھمبے پر بڑے پوسٹر کو دیکھ رہا ہے۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ کر اس پوسٹر کو دیکھنے لگتا ہوں۔

''گاڑی کب تک آئے گی، کچھ پتہ ہے؟''

''نہیں......''

''سالا کوئی بتانے والا یہاں نہیں ہے۔''

''دھت، اب گندہ پوسٹر لگا ہے کھلی جگہ پر کیوں؟''

''گندہ؟ اچھا اچھا، اس کی بات کر رہے ہیں کیا؟ چلتا ہے بھائی''

وہ میری طرف شک کی نظروں سے دیکھتا ہے اور میری طرف مڑتا ہے۔ اس کے دانت ٹھنڈک کی وجہ سے کٹکٹا رہے ہیں۔ چاروں طرف پانی برس رہا ہے، چھت پر اس کی آواز گونج رہی ہے۔ دونوں ہاتھ جیب میں ٹھونس کر وہ کھڑا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے۔

''کہاں جانا ہے؟''

میں بتا دیتا ہوں، پھر سوچا کہ یہ تو مجھ سے پوچھ تاچھ کر رہا ہے۔ حقیقت میں ایک ادھ کہانی قصہ تو سننا ہی چاہتا ہوں۔ ایک سگریٹ کے بدلے میں...

اچانک وہ بولا۔ ''ریل کا تو ایسا ہی ہے، تم کو گرم کپڑوں کی ضرورت ہے کیا؟''

یہ دبی زبان میں پوچھا گیا بڑا ہی غیر متوقع سوال تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''گرم کپڑا؟...... کیوں بھائی؟ کس کے لئے؟''

''کس لئے؟.... پہننے کو...... پہنو.... سمگلڈ ہے..... اچھا ہے۔''

ٹھنڈ سے اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ دانتوں کو بھینچ لیا ہے۔ درحقیقت اسے گرم کپڑوں کی سخت ضرورت ہے اور وہ کسی دوسرے کو بیچ رہا ہے۔ شک شبہے سے بھرپور دبی آواز، شاید اسے سگریٹ دینے پر ...شاید..... کوئی کہانی نکلے اس کے اندر سے، میں جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور رک جاتا ہوں۔

''نہیں بھائی سمگلڈ .... نہیں چاہئے...... آپ خود ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہے ہو....؟ کیوں؟''

اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سا خوف امنڈ پڑا ہے۔ وہ ادھر ادھر جھانکنے لگتا ہے۔ گاہک، جال سے چھٹک جانے کی مایوسی اور دکھ کے آثار اس کی آنکھوں سے صاف جھلک رہے ہیں۔ ان میں ایک قسم کا ڈر بھی سمایا ہے۔ پھر بھی جھلاہٹ سے بھری ایک آخری کوشش میں اس نے کہا۔ ''کچھ اور ہونا کیا؟''

''کچھ اور؟..... کیا مطلب؟''

وہ بے چین سا رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہے اور دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونس کر اچانک چل دیتا ہے۔ ٹھٹھرتا ہوا۔ کھمبے کے پار۔

پھر سے ایک گہری خاموشی چھا گئی ہے۔ بارش، ٹھنڈا اکیلا پن اور ایک لمبا انتظار...... voltage کے ڈاؤن ہونے سے یا کسی دوسری وجہ سے بتیوں کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہے۔ اسٹیشن کی بڑی گھڑی میں رات کا ایک بج چکا ہے۔ مارواڑی کی بیوی صندوق سے ایک چادر نکال کر لپیٹ لیتی ہے اور

پھر جھپکیاں لینے لگتی ہے۔ مارواڑی پوری محویت سے مستعدی سے رکھوالی کر رہا ہے۔ بدھو دکھائی دینے والا وہ شوہر اب وہ ایک پتلے کی طرح ساکت ہے اور بیوی آرام سے سوگئی ہے۔ ٹپری کے کواڑ کی اوٹ میں ابھی بھی کھسر پھسر چل رہی ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر چپکے ہوئے ہیں۔ بس آوارہ گھمکو اکیلا میں ہی ہوں۔ رین کوٹ چڑھائے گھوم رہا ہوں اور میرے پیچھے پیچھے کتا بھی۔ پھر وہ ننگی عورتوں والا پوسٹر ''مشین گن اور بندوق تھامے مرد اور گھوڑے...... یہ سب صرف پانچ روپیوں میں۔ سگریٹ پینے کا دل چاہتا ہے۔ دل ہی دل میں اسی گیت کی گونج۔ ''میں دکھ کی لمبی رات......''

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی کی نظر میرا پیچھا کر رہی ہے۔ کہیں کسی کا دھیان صرف میری طرف ہے۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں، تلاشتا ہوں اس اندھیرے میں کسی کی سلگتی نگاہ کو محسوس کرتا ہوں۔ ان آنکھوں کا مالک ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ پلیٹ فارم کے کونے میں کسی اوٹ میں کوئی جاگ رہا ہے۔ مجھ پر نظر گڑائے دیکھ کر نظر نہ پھیرنے والا، پارٹنر کے نام پر اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اس آخر شب میں۔

آہستہ آہستہ میں اس طرف چل پڑا ہوں۔ سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا لیا لیکن ابھی سلگائی نہیں۔ کتا بھی ساتھ میں چل رہا ہے۔ میرا یوں دور نکل جانا مارواڑی کو راس آگیا ہے۔ اپنے ہی کندھوں پر سر رکھ کر آرام سے بیٹھا ہے۔ اس نظر کی کھوج میں میں دھیرے دھیرے آگے آگیا ہوں۔ نظر سے نظر ملی، میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں۔

پہلے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ بعد میں دھندلا سا ایک ہیولہ ابھرا۔ غور سے دیکھنے پر وہ دکھائی دیا۔ نیچے زمین پر بیٹھا۔ یعنی پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ پہیوں والی پٹیا نما گاڑی پر۔ گلے میں منجیرے لٹکے ہوئے ہیں۔ شاید پیر نہیں ہیں ہتھیلیاں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئیں۔ چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے مگر نگاہیں وہی جلتی ہوئیں۔ حملہ آور اور وہی...... نظر مجھ پر گڑائی ہوئی، میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس سے دوستی ہو سکے گی۔ قریب کے چبوترے پر پاؤں رکھا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ ...... جیسے وہ ایک بے جان پتلا جیسا ہے۔ اس کی گاڑی، اس کے پہیے، وہ گندے چیتھڑے...... دل میں امنڈ پڑا...... ''خود انسان نے ہی کیا کتنا ذلیل انسان کو'' وغیرہ......

تھوڑی دیر پہلے کی آوارگی اپنے میں ڈوبا ہوا، اپنی ہی دھن میں مست الست۔ سگریٹ پینے کی خواہش پھر امنڈی ہے۔ کیا اسے دے دوں وہ دوسری؟ کیا یہ کوئی قصہ کہانی سنا پائے گا؟ ویسے بھی یہ بارش بھری رات جوتنا مشکل ہے، جھک کر میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھائی۔

میں گنگنانے لگتا ہوں۔'میں دکھ کی لمبی رات' وہ سگریٹ کو چھوتا تک نہیں۔اس کی نظر مجھے ٹول رہی تھی۔پھر اچانک تیکھی سخت آواز اس اندھیرے میں ابھری۔

''سالا، دلال، بھڑوا۔''

چونک جاتا ہوں۔باپ رے باپ، ایک ساتھ تین تین گالیاں۔اور پھر دو لفظ ایک ہی معنی والے، پھر اسے سمجھائے گا کون۔میں کچھ سہم سا جاتا ہوں۔مگر سگریٹ ویسے ہی اس کے سامنے پکڑے کھڑا ہوں۔

''کون؟''

''وہی سالا وہی.....''

''اچھا وہ......تب ٹھیک۔''

''ایسے ہی پھانستا ہے......دلالی کرتا ہے۔عورتیں......کپڑے اور سامان بیچتا ہے۔''

''اچھا...سگریٹ؟''

''سگریٹ؟''

''ہاں نام کیا ہے؟''

''کس کا؟''

''میرا؟''

''ببرو دان''

ابھی بھی میرا سگریٹ والا ہاتھ اس کے سامنے ہے، وہ اسے چھوتا تک نہیں صرف دیکھ رہا ہے۔گہری چاہت سے۔لیکن چھوتا نہیں ہے۔کتا بھی قریب آ کر بیٹھ گیا ہے۔کان کھجلا رہا ہے۔میں کتے کو چھوڑ آنکھوں کے کونوں سے دیکھ کر سگریٹ بڑھاتا ہوں۔

''میں دیکھ رہا تھا آپ کو کوئی دوست نہیں ملا؟''

'''بڑا باریک دھیان ہے تمھارا۔لو.....سگریٹ لو۔''

''لے لوں۔.....اور اس کے بدلے میں کیا کروں......بھجن سناؤں؟''

وہ ہاتھوں میں مجیرے لے لیتا ہے۔آنکھیں ویسی ہیں......جلتی ہوئی۔سلگتی ہوئی۔میں گھبرا کر سوچتا ہوں کہ اگر یہ اس وقت گانے لگے تو سارے لوگ جاگ جائیں گے اور مار پڑے گی۔میں فوراً ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے روکتا ہوں۔

''نہیں گاؤں؟.....پھر سگریٹ کس لئے؟''

''یوں ہی ''

''یوں ہی کوئی کیوں دینے لگا؟'' وہ گھور کر دیکھتا ہے۔ اس آدمی کے اندر سے کوئی کہانی قصہ نکلوانے کی میری بھی ضد، میں پھر سگریٹ بڑھا دیتا ہوں۔

''گپ شپ کریں گے۔ بس ــــ یوں ہی اس گہری اندھیری رات میں اور کیا کر سکتے ہی؟ گاڑی کے آنے میں ابھی کافی وقت ہے......''

زمین پر ہاتھ ٹکا کر وہ اپنی پہیوں والی گاڑی ٹھیک کر لیتا ہے۔ وہ ہنس دیتا ہے، کسی گہرے کنویں سے آرہی آواز کا احساس۔

''کیا صاحب؟ نہیں چاہئے! لگتا ہے.... اس میں کوئی چال ہے۔''

میں بھی ہنس پڑتا ہوں۔ اس کے زخمی جسم سے مجھے کوئی گھن نہیں آتی۔ میں کتے پر ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ کتا بڑی رحم طلب اور پُر امید نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ گھڑی کی سوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ پھر بجلی کوندی، پھر بارش کی تیکھی بوچھار، سردی کی سہرن، پورے بدن میں دوڑ گئی۔ بہروان کو کوئی کپکپاہٹ نہیں۔ وہ سگریٹ پہ نظر گڑائے ہوئے ہے۔ ''لو ... کوئی کہانی سنا دو، کہانی؟''

اب وہ پھرتی سے سگریٹ جھپٹ لیتا ہے۔ فوراً بے صبری سے ہونٹوں پر دبالیتا ہے۔ میں نے لائٹر جلا دیا۔ اس کی لو ہوا میں کانپ رہی ہے۔ اب میں اس کا چہرہ دیکھ پاتا ہوں۔ شیشے سا گہرا کالا۔ بڑی بڑی پیلی آنکھیں جس میں ساری دنیا میں سمائی ہوئی ہے۔ لائٹر سے سنگیت کے سر بکھر جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی سگریٹ جلا لیتا ہوں۔ ایک گہرا کش کھینچ کر کہتا ہوں۔

''ہاں'' اب شروع ہو جاؤ...کوئی اچھی سی کہانی سناؤ''

وہ ناک اور منھ سے سگریٹ کا دھواں نکالتا ہے۔ گہرے کش کی وجہ سے کھانسنے لگتا ہے ۔ کچھ لمحوں کے لئے ساکت سا ہو جاتا ہے۔

''راجہ رانی، راجہ ہریش چندر کی؟ مایا مچھندر کی؟''

''نہیں بھائی۔ ویسی نہیں! اچھی! سچ مچ کی کہانی ...... کوئی آپ بیتی ...... اپنے تجربوں کی کوئی سچی کہانی ......''

''سچی کہانی؟'' وہ اپنے آپ میں کھو گیا، پھر بولا۔ ''سچی کہانی؟'' بتاتا ہوں ...... لیکن میں اس کا مطلب خود سمجھ نہیں پایا ہوں۔''

''کیوں بھلا؟''

''اجی، کہانی ہی ویسی ہے، انصاف اور ناانصافی کی گتھی'' میں چونک جاتا ہوں لیکن خوش بھی ہو جاتا ہوں۔ آگے جھک کر کہتا ہوں۔ ''نام بڑا اچھا ہے کہانی کا۔ انصاف اور ناانصافی کی گتھی، واہ بھائی، سناؤ کہانی۔''

میرے اندر کا سامع تجسس کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ بڑی مستی میں میں گہرا کش لیتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتا ہوں۔ ہبرو وان تو جیسے اپنی ہی دھن میں کھو گیا ہو۔ پورے جوش وخروش سے کش پر کش لگاتا ہوا جیسے سگریٹ نہیں چلم پی رہا ہو۔ اب وہ خاموش اور ساکت سا بیٹھا ہے جیسے اسے کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا ماضی یا کوئی برا خواب، بھرائی، دھیمی آواز میں وہ شروع ہو جاتا ہے۔ بارش تیز ہو گئی ہے۔ چادر میں لپٹی مارواڑی کی بیوی اب اور زیادہ اونگھ رہی ہے۔ کتا اپنے پنجے سے کان کھجا رہا ہے۔ کہانی چل رہی ہے۔ روشنی پھیکی پڑ گئی ہے۔

بات تب کی ہے جب ہم ایک بڑے شہر میں رہتے تھے (ہبرو وان، انصاف اور ناانصافی کی گتھی والی کہانی بیان کر رہا ہے۔) وہاں سردیوں کے دن برداشت نہیں ہوتے۔ اس سال تو سخت سردی پڑی تھی۔ ویسے آپ لوگ کیا جانو گہری ٹھنڈ، آپ کے پاس تو پوری بانہوں کے سویٹر ہوتے ہیں۔ کن ٹوپا ہوتے ہیں، اوڑھنے کے لئے موٹے موٹے کمبل ہوتے ہیں۔ رضائیاں ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں بات اور تھی۔ ہم سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بنائی رنگریزین کی جھگیوں میں رہتے تھے۔ جوان بیوی تھی اور ڈھیر سارے بچے، رات کو جب سب سوتے تب پیر جھگی سے باہر نکل جاتے۔ اس سال تو ہم جیسے فٹ پاتھ پر رہنے والے لوگ ایک ہی رات میں سردی میں ٹھٹھر کر مر گئے۔ کوئی اٹھارہ لوگ مرے ہوں گے۔ بڑا کہرام مچ گیا تھا۔ آپ کو بھی شاید یاد ہو کہ موسم سرما کی بیٹھک میں اس معاملے میں خوب بحثیں ہوئی تھیں۔ (یعنی ہبرو وان موسم سرما کی بیٹھک سے واقف تھا) میرے خاندان کو بھی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ٹھنڈ نے جیسے قحط ڈھا دیا تھا۔ بھی گھبرائے اور بے چین تھے۔

دن میں بھی ٹھنڈ رہتی۔ سارا دن کنڈے، لکڑی چننے میں گزر جاتا، ماچس تو جیسے جان سے بھی پیاری بن گئی تھی۔ بیڑی سلگانے کے لئے نہیں رات میں آگ جلانے کے لئے۔ اپنے سے بھی زیادہ گھر والوں کو بچانے کے لئے آگ کی گرماہٹ ضروری تھی۔ پھٹی پرانی گدڑیاں تھی بورے تھے اور خاص کر دیواروں پر لگے پوسٹر بھی لے آتے تھے ہم۔ بیوی نے پوسٹروں کی آڑ بنالی تھی۔ رات میں گدڑیوں کے ساتھ سب اخبار بھی اوڑھ لیتے تھے۔ علی الصباح گھر کے قریب الاؤ

سینکتے ،رات بھر بچوں پر نظر گڑی رہیں۔ خوف تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی موت کا نوالہ نہ بن جائے۔ مصیبتیں بڑھتی گئیں، آنے والی ہر شب اور زیادہ ٹھنڈی۔ کسی نے کہا کہ پڑوس ملک میں برف گری ہے اس لئے یہاں ٹھنڈ کی لہر آئی ہے۔ ہم سب کی تو جان ہی نکل گئی۔ زیادہ تجربہ رکھنے والے ہوشیار لوگوں نے چھپر، اور آڑ والی جگہوں پر پہلے سے ہی قبضہ کر لیا تھا۔ ساری دھرم شالائیں، اسٹیشن، مندر، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے کھنڈر، اسکول وغیرہ سب بھرے پڑے تھے۔ ہم بھٹکتے بھٹکتے پہنچے تھے اس لئے سڑک کے کنارے کی جھگی لگائی تھی اور کہیں ٹھکانہ نہیں ملا۔ آپ کہو گے کہ بھیک مانگنے سے اچھا تھا کہ کوئی کام ہی کر لیا ہوتا۔ لیکن بات ہی کچھ اور ہو گئی۔ ان دنوں میرے کان پر ایک لال چکتا ابھر آیا تھا۔ اور میرا چہرہ بھی عجیب دکھنے لگ گیا تھا۔

بات ایسی ہے کہ کبھی کچھ امیر لوگوں نے غریبوں میں کمبل بانٹنا طے کیا۔ ایسا کرنے سے کچھ گناہوں سے بخشائش مل جاتی ہے۔ بڑے زور شور سے کمبل بانٹے گئے۔ ایک کمبل ہمارے حصے میں بھی آیا۔ لال رنگ کا اچھا، موٹا اور گرم تھا۔ لگا سب کچھ مل گیا۔ سیٹھ جی کا نوکر کمبل بانٹتے وقت ہنسی مذاق کے ساتھ گالی گلوج کرتے ہوئے بولا۔ ''لو بھڑوو... قسمت کھل گئی تمھاری.... زندگی میں کیا کبھی دیکھے ہوا سے..... لو' اس کے ساتھ دوسرا آدمی منیم تھا شاید، وہ نام وام درج کر رہا تھا۔ بڑی ہی حقارت سے دیکھ رہا تھا وہ ہم سبھوں کو، پھر بولا..... کسی اوٹ آڑ کے بغیر اتنا سب کچھ، اب تو گرماہٹ کی اوٹ ملی ہے۔ تب تو کیا کہنے؟ بھیڑ بڑھاؤ گے.... کتے.... سالے.....''

پھر اس نے وہ 'لال سکھ' ہمارے بدن پر پھینکا۔ اس کے پیچھے ہم جیسوں کا ہی جتھا تھا۔ اور اگلے 'گھر والے' بھی آس لگائے بیٹھے تھے۔ اسے اپنا پتہ ٹھکانہ بتا رہے تھے۔ وہ باری باری سے پوچھ تاچھ کر ضرورت مندوں کو کمبل بانٹ رہا تھا۔ کافی بھیڑ تھی۔ سارے بھکاری بہت خوش تھے۔ ہم 'لال سکھ' کو اوڑھے خوشی سے جھوم رہے تھے۔ اسے کوئی چرا نہ لے اس بات کا بھی ڈر تھا۔ گالیاں دیتے ہوئے منیم اور نوکر، پڑوس کی جھگی کی طرف گئے۔ وہاں پر بھولا شنکر رہتا تھا۔ اس کہانی سے اس کا بھی سروکار ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں بھی بتانا ہوگا۔ جس جھگی میں بھولا شنکر رہتا تھا۔ اسے ہم ''لال بنگلہ'' کہا کرتے تھے۔ کیونکہ اس جھگی پر لال بنگلہ نام کی فلم کا پوسٹر چپکا تھا۔ ہم سب بھکاریوں میں بھولا شنکر ایک سینئر بھکاری تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن مرنے کو تیار نہ تھا۔ بڑا ڈراونا دکھتا تھا وہ۔ جسم تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا لیکن مزاج بہت گرم، بڑے لمبے عرصے سے وہ وہاں رہتا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس نے ہمارے آباواجداد کو بھی دیکھا تھا۔ وہ کبھی کسی کو اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیتا

تھا۔اس کے حساب سے اسے کسی موذی اور خطرناک بیماری نے آگھیرا تھا۔لیکن یہاں بیماری کسے نہیں تھی۔کسی کے مرجانے پر وہاں حاضری لگانا اس کا شوق تھا۔پھر لاش کے پاس کھڑے ہوکر وہ چیخ چیخ کر مرے ہوئے کے بارے میں سب کچھ بیان کرتا جیسے ساری جانکاری رکھتا ہو۔پھر کولہوں کے بل گھسٹتا ہوا گھومتا اور بڑی ڈراؤنی آواز میں گالی گلوج کرتا رہتا۔اس کے آڑے کوئی نہیں آتا تھا۔جس طرح شیر کا اپنا علاقہ ہوتا ہے ویسے بھی بھکاریوں کا بھی اپنا اپنا علاقہ ہوتا ہے۔لال بنگلے، کے علاقے سے سب واقف تھے۔اپنے علاقے میں گھسٹتا ہوا گھومتا ہوایا کھمبے کے نیچے بیٹھ کر بھیک مانگتا۔اس کی دھاک جمنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔اس کے منہ سے نکلی بددعا سچ ثابت ہوجاتی۔اپنی حفاظت کے لئے وہ اپنے پاس ایک چاقو بھی رکھتا۔پہلے اس کے پاس ایک خوفناک کتا بھی تھا۔کتا مر گیا اب وہ زیادہ تر لال بنگلے میں ہی پڑا رہتا۔مرنے کو قطعی تیار نہیں۔کتنی ساری جگہ گھیر کر بیٹھا تھا۔سبھی کی گرہستیاں بڑھ رہی تھیں۔اس لئے جگہ کی بھی مارا ماری تھی۔بھلا شنکر کی وجہ سے فٹ پاتھ پر بنا ایک جھونپڑا اور ایک علاقہ چھن گیا تھا۔سبھی اس کی موت چاہتے تھے سچ پوچھو تو میں بھی۔

منیم اور نوکر لال بنگلے کے سامنے پہنچے۔نام درج کر کے ایک موٹا کمبل بھلا شنکر کے بدن پر پھینک دیا۔

اس وقت ہم نے اس کے اندر جینے کی زبردست خواہش کو دیکھا تھا۔وہ پل میں ہنسنے لگتا اور پل میں رونے۔روتے روتے منیم کو گالیاں دے رہا تھا جیسے ساری دنیا اسے مل گئی ہو۔اس رعب کے ساتھ اس نے کمبل اپنے بدن پر لپیٹ لیا پھر بھی ٹھٹھرتا ہوا فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھا رہا۔منیم اور نوکر دونوں ہنس رہے تھے اور باقی سبھی لوگوں کی نظریں اس کے کمبل پر تھیں۔

اپنے آپ کو بنائے رکھنے کے لئے کسی بھی ضرورت کی چیز کو چرالینا یا چھین لینا ہماری نظر سے جائز بھی تھا اور سہل بھی۔کیونکہ ایسا نہ کرنے پر ہم، ہم نہیں رہ پاتے۔بانٹے گئے نئے کمبلوں نے ہم لوگوں کے بیچ ایک کھلبلی مچا کر رکھ دی تھی۔کمبل سبھی لوگوں کو تو مل نہیں پائے تھے جنھیں بھی ملے تھے انھیں بھی کم پڑ گئے تھے۔سردی کڑا کے کی تھی، جنھیں کمبل ملے نہ تھے وہ کمبل والوں پر جل رہے تھے کیونکہ کمبلوں کی وجہ سے ہم سبھوں کے بیچ امیری غریبی کے دو گٹ بن گئے تھے۔

کمبل کوئی چرا نہ لے اس لئے جتنا میں مستعد تھا اتنا ہی بھولا شنکر بھی۔میں نے بیوی اور بچوں کو کڑی ہدایت دے رکھی کہ کمبل پر پورا دھیان رہے۔لیکن بھولا شنکر تو اکیلا ہی تھا۔اس نے ایک ترکیب لگائی۔اپنے سرہانے کی طرف اس نے زمین میں کھونٹیاں گاڑیں اور سوتے وقت کمبل کے دو کنارے

رسی سے کھونٹیوں سے کس کر باندھ دیے تا کہ رات میں کسی نے کمبل کھینچنا چاہا بھی تو اسے چرانا مشکل ہو۔ اس کے دائیں طرف ہمیشہ چاقو رکھا رہتا تھا۔اس کی نیند بھی بڑی کچی تھی۔قریب ساری رات کو کھانستا رہتا یا کراہتا چلا تا رہتا۔کسی بھکاری کی ہمت نہ تھی بھولا شنکر کے یہاں چوری کرنے کی۔

ہم میں سے کچھ لوگ لکڑیاں چرا کر لانے لگے۔مثلاً کسی کا ٹھیلا چرا لیتے یا لکڑی کے کمپاؤنڈ کوا کھاڑ لاتے۔یوں پکڑے جانے کا خوف بالکل نہ تھا وہ اس لئے کہ پکڑے جانے پر روٹی کپڑا اور مکان کی سہولت مفت میں ہی مل جاتی ہے۔

ایک بار چوری کی مہم میں میں بھی اوروں کے ساتھ ہولیا۔پکڑا گیا۔لگا کہ پکڑ کر پولیس پکڑ لے جائے گی ویسے گھر کے لوگوں کی کچھ فکر تھی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔شاید ہماری اس چال سے پولیس واقف تھی،اسی لئے ہم سبھی کی پٹائی کرنے کے بعد ہم سبھوں کو چھوڑ دیا گیا تبھی سردی کی کی شدت سے مرنے والوں کی گنتی بڑھ گئی تھی۔فلم کے پوسٹرز بھی بکنے لگے۔کچھ کھاتے پیتے لوگوں نے کم دام میں بھکاریوں سے کمبل خرید لئے۔ بیچنے والے کچھ بھکاری مر گئے، کچھ بچ گئے۔ جنھوں نے کمبل بیچے تھے ان میں سے کچھ بھکاریوں نے اس روز اسٹیشن کے ہوٹل باہر بیٹھ کر بھر پیٹ کھانا کھایا تھا۔ایسی موج مستی کب نصیب ہوتی ہے بھلا؟ بس یہی جان کر موج کے بدلے اپنے جسم کی قربانی ٹھنڈ کو دے دی۔کہنے کا مطلب یہ کہ سردی کا قہر یوں ہوا کہ ہاہا کار مچ گیا۔

بات اس رات کی ہے(ببرو وان کہانی سنا رہا ہے)ہم سبھی ڈر سے سہمے سہمے تھے۔چاند پھیکا تھا اور ٹھنڈ کڑاکے کی۔ساری لکڑیاں بھی ختم۔ماچس تھی لیکن اس میں دو ہی تیلیاں بچی تھیں۔ ٹھنڈی موت دھیرے دھیرے جال پھیلا رہی تھی۔شام کے سات ساڑھے سات بجے سے سناٹا چھا جاتا۔لوگوں کے گھروں کے دروازے کھڑکیاں بند ہو جاتے۔ہماری جھگیوں میں نہ تو دروازے تھے نہ کھڑکیاں۔میرا ایک بیٹا موت کے منھ میں تھا۔لمحہ بہ لمحہ ٹھنڈک بڑھتی جارہی تھی۔رات تو جیسے ختم ہونے کو نہیں۔ہم سب خوف زدہ تھے۔بوریاں،کاغذ پوسٹر وغیرہ کو لپیٹ کر جیسے تیسے گڈمڈ بنے بیٹھے تھے۔قریب کے بجلی کے کھمبے سے اداس پیلی روشنی پھیل رہی تھی۔ ہماری نظریں ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے اس بچے پر ہی گڑی تھیں۔آخر بیوی سے رہا نہ گیا۔بہت کچھ اناپ شناپ بکتی رہی۔وہ بکنا آپ کے حساب سے بہت گندہ کہلائے گا۔لیکن اس کا مطلب یہی تھا کہ بچے پیدا کرتے وقت تو اس وقت کچھ سوچا نہیں۔اب ان کی زندگی کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتے کیا؟اب کچھ کرو، چپ بیٹھے مت رہو،کہیں سے آگ لگاؤ،کمبل کتھری اوڑھنے کے لئے لاؤ،ایک کمبل سے کیا ہوگا۔

کچھ تو کرو اور نہیں تو سب کی اکٹھا جان ہی لے لو۔

میں تو دہل گیا صاحب، کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنی رات گئے جھونپڑی سے دور جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں کوئی ہمارا کمبل ہی چرا کر نہ لے جائے۔ جن اخباروں، کاغذوں، پوسٹروں کے آسرے ہم جی رہے تھے ان کے چھن جانے کا خوف تھا۔ ٹھنڈ میں مرنے والے کیا ہم اکیلے تھے۔ اس رات، اپنی بے بسی کی وجہ سے مجھے اپنے آدمی ہونے پر شرم آ رہی تھی۔ حقارت اور غصہ بھی۔ اتنی حقارت تو مجھے تب بھی نہیں آئی تھی جب اس گھناؤنے مرض سے میری انگلیوں سے حس ختم ہو رہی تھی، مٹ رہی تھی۔ اور وہ سُن پڑ رہی تھی۔ ٹھٹھرتا کپکپاتا میں بے بس ہو کر اپنے گھر کو دیکھتا بیٹھا تھا اور ٹھنڈے پڑتے جا رہے اپنے بچے کی طرف رات جیسے ٹھٹھرائی رک گئی تھی۔ کاٹتے نہ کٹ رہی تھی۔ اچانک میرا دھیان لال بنگلے کی طرف گیا۔ ایک خیال دماغ میں کوند گیا اور میں سکپکا گیا۔ بھولا شنکر کی اب عمر ہو گئی ہے۔ اس کے زندہ رہنے کا اب کوئی مطلب نہیں ہے۔ اگر اس کا کمبل مل جائے تو میں بیوی بچوں کی حفاظت کر سکوں گا۔ بھولا شنکر سے کمبل مانگنا ہی ہوگا۔ جیسے تیسے میں نے اپنے آپ کو مضبوط بنایا، ہمت جٹائی۔ ٹھٹھرتا ہوا میں اٹھا۔ بیوی چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی۔ سردی سے وہ بھی اکڑ گئی تھی۔ بچوں کو اپنے سے لپٹا لیا تھا اس نے۔ وہ مجھے گھورتی رہی۔ میں دھیرے دھیرے لال بنگلے کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ تھا تو نزدیک لیکن تب مجھے وہ دوری بھی بہت لمبی لگی۔ کھمبے کی بجلی بھی جیسے جم گئی تھی۔ بڑی مدھم روشنی تھی۔ میں نے لال بنگلے کے دروازے سے اندر جھانکا۔ بھولا شنکر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ گلے کی گھرگھراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ کمبل کے دونوں سرے کھونٹیوں سے کس کر بندھے تھے۔ چاقو ہاتھ میں تھا۔ اس نے مجھے دیکھا، دیکھتے ہی کتے سا غرایا'' کا چاہئے؟''۔ تب میں نے جانا کہ وہ زندہ ہے۔۔

'' بچہ مر رہا ہے..... کمبل چاہئے.....'' میرے اتنا کہتے ہی وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس نے کمبل کو سینے سے کس لیا۔ کھونٹی سے بندھے گانٹھوں کو ٹٹولا اور چاقو والے ہاتھ سے اشارے سے مجھے باہر نکل جانے کو کہا۔ وہ شاید چاقو مار بھی دیتا۔ اس کے چیخنے چلانے کا مطلب بھی یہی تھا کہ میں وہاں سے نکل جاؤں۔ کمبل نہیں ملے گا۔ اسے کمبل کی ضرورت تھی۔ اس شدید سردی میں وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ہار گیا تھا۔ شرم سے لوٹ آیا۔ اور اپنے بچوں کو بے بس نظروں سے دیکھا۔ بچہ سردی سے بے تحاشہ کانپ رہا تھا۔ رات ختم ہونے کو نہیں۔ وہ دکھ بھری رات، اپنی خوفناک شکل لئے

ہمارے سامنے جھگی کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اب اگلا قدم ضروری تھا۔ ہمارا قانون یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی چیز مانگنے سے نہیں ملتی تو اسے چرالو۔ اگر چرائی نہیں جاسکتی تو اسے چھین لو۔ سب مانتے ہیں اس قانون کو۔ زندہ رہنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ میرا دھیان پھر لال بنگلے کی طرف گیا۔ میں نے دل ہی دل میں ہمت جٹائی۔ میں بغیر کسی آہٹ کے چپ چاپ وہاں جانے والا تھا۔ کمبل کھونٹے سے بندھا ہونے کی وجہ سے کھینچا نہیں جاسکتا تھا۔ کناروں کو کھلنے کے لئے مجھے اس پر جھکنا ہوگا۔ اس وقت اس کے جاگ جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر وہ مجھے دبوچ لیتا۔ یہ طے تھا۔ پھر مجھے اس کا گلا گھونٹنا ہی پڑتا۔ اپنے گھر والوں کے لئے یہ بھی ضروری تھا۔ گھر والوں کی جان بچانی ہے۔ تب یہ جائز بھی تھا۔ دل کو سکون ملا۔ بیوی میری طرف دیکھ رہی تھی، بچوں سے سمٹ کر بیٹھی تھی۔ وہ سردی سے جھوجھ رہی تھی اور موت سے لڑ رہی تھی۔ بچے کی حالت اور بدتر ہو رہی تھی۔ میرا کچھ کر گزرنا ضروری تھا۔ بچوں کو زندہ رہنے کا حق دلانے کے لئے انصاف کرنا تھا۔

(ببر دوان خاموش خیالوں میں ڈوبا ہوا۔ سارا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا جیسے پانی برس رہا تھا، سردی بڑھ رہی تھی۔ میرے اندر کی مستی پگھل رہی تھی۔ میرا دل غم گین ہو رہا تھا۔ روشنی پھیکی ہو رہی اور کہانی آگے چل رہی ہے۔)

میں پھر اٹھا، بیوی نے دیکھا، میں کچھ کرنے جارہا ہوں۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہی۔ وہ دھیرے دھیرے لال بنگلے کی طرف بڑھا۔ بڑی دیر تک میں ٹوہ لیتا رہا۔ شاید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیت گیا۔ میرے لئے کچھ کر گزرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں۔ کراہنا بھی نہیں۔ شاید بھولا شنکر سو گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا وہ میرے کلیجے کے ٹکڑے ایک دوسرے سے سٹے بیٹھے تھے۔ زندہ بنے رہنے کی کوشش میں۔ جو کچھ بھی اوڑھا جاسکتا تھا وہ سارا اوڑھ لیا گیا تھا۔ اس لال کمبل کے ساتھ۔ میری بیوی سب کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ میرے ہمت بڑھ گئی۔ بس یہی انصاف ...... یہی صحیح، یہی پن ہے...... میں دھیرے سے لال بنگلے میں گھس گیا۔ کوئی آواز نہیں۔ شاید بھولا شنکر گہری نیند میں تھا مگر اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ میں ہولے سے نیچے بیٹھا کتے جیسا۔ میں نے کمبل کھینچنے کا فیصلہ کیا۔ سوچا گانٹھ ٹوٹتی ہے تو ٹھیک نہیں تو اس کے اوپر حاوی ہو جانا ہے۔ مجھے جیسے نشہ سا چھا گیا تھا۔ میں نے کمبل کھینچا اور حیرت کی بات تو یہ ہے وہ سیدھے میرے ہاتھوں میں آگیا، پورا کمبل... پتہ نہیں کیسے؟۔ اب نہ ہی میرے پاس سوچنے کا وقت تھا اور نہ ہی میر

ادماغ ٹھکانے پر۔ اندھیرا تھا۔ بھولا شنکر کی طرف سے کوئی چھینا جھپٹی تھی نہیں۔ کمبل کے گانٹھ ٹوٹنے کا جھٹکا بھی نہیں۔ کچھ بھی ہو کمبل تو ہاتھ لگا ہی تھا۔ میں فوراً اسے گھسیٹ کر باہر دوڑ گیا جیسے پوری زندگی ہی ہاتھ لگ گئی ہو۔ میں جی جان سے اپنی جھگی کی طرف بھاگا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس پل تو جی لو۔ میں اپنے گھر میں گھس گیا اور پھرتی سے وہ کمبل سمٹ کر بیٹھے بچوں پر پھیلا دیا۔ میں بھی اس میں گھس گیا۔ تھوڑی گرماہٹ مجھے بھی ملی ۔ بچوں میں جان آ گئی۔ بیوی اس میں گھس کر بچوں کو اپنے میں لپٹاتی رہی۔ اس زندگی کو جینے کی خواہش سے وہ خوش ہوئی۔ اس وقت شاید اس نے میری طرف احسان بھری نظروں سے دیکھا بھی ہوگا۔ پتہ نہیں لیکن دو دو کمبلوں کی وجہ سے ہم سب زندہ رہ پائے۔ ایک برفیلی رات ہم سے ہار گئی تھی۔

میں سو نہیں پایا۔ بار بار یہی لگتا رہا کہ بھولا شنکر کا چیخنا چلانا کیوں نہیں سنائی دیتا۔ بڑی حیرت بھی ہوئی۔ صبح کے اجیارے میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ ایک نئی الجھن تھی۔ میں نے دیکھا کہ کمبل کی گانٹھیں ٹوٹی ہوئی نہیں بلکہ کھلی ہوئی تھیں۔ گانٹھ باندھنے کے لئے بالشت بھر کی جو رسیاں تھیں وہ جوں کی توں کھلی پڑی تھیں تاکہ کمبل لے جانا میرے لئے آسان ہو جائے۔ مگر اب کیسے ہو سکتا ہے؟ میں حیرت میں تھا۔ کچھ بے چین بھی۔ مجھے تو اس نے گالیاں دے کر واپس بھیج دیا تھا اسے تو میری مخالفت کرنی چاہیے تھی۔

تھوڑی دھوپ نکل آئی لیکن وہ جاگا نہ تھا۔ سڑک صاف کرنے والی جمعدارن نے اس کے لال بنگلے کی طرف دیکھا اور چیخنا چلانا شروع کیا۔ میں اٹھا اور ڈرتے ڈرتے وہاں پہنچا۔ دیکھا تو اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ کب کا مر چکا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور دروازے پر ٹکی تھیں۔ لگا رات میں ایسے ہی اس نے میری طرف دیکھا ہوگا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دھک دھک کرتے دل سے میں واپس اس جھگی کی دہلیز پر آ بیٹھا جو کچھ ہوا اسے بیوی بھی جان گئی۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ اس نے یکبارگی لال بنگلے پر اور پھر لال کمبل پر نظر دوڑاتی۔ پھر ڈر کر اس نے اس کمبل کو کس کر پکڑے رکھا۔ گھر کا کچھ سامان بھی اس نے اس کمبل پر لا کر رکھ دیا جیسے گناہ چھپا رہی ہو۔ اس نے اس کمبل کو چھپا دیا۔

''بس یہیں سے انصاف ناانصافی کی گتھی شروع ہو جاتی ہے......''

تھوڑی دیر پہلے آپ جو گانا گنگنا رہے تھے صاحب، وہی گانا مجھے بھی بڑا اچھا لگتا تھا کیونکہ میں ان دنوں ڈور کیپر کا کام کرتا تھا۔ پھر بعد میں میری ایسی حالت ہوگئی۔ لیکن اس ٹھنڈی رات، رات

جر اس گانے جیسا ہی لگتا رہا۔ دن چڑھا اور بھولا شنکر کی موت کی خبر ہمارے محلے میں پھیل گئی۔ پھر کچھ ایک سوال میرے من کو کریدنے لگے اور دماغ میں الجھن بڑھتی گئی۔ بھاری گتھی ہوئی۔

کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ باقی سارا سمجھ سے باہر تھا۔ دل میں یہ سوال اٹھا کہ کیا بھولا شنکر کو میں نے مار ڈالا؟ میرے کمبل چرانے پر کیا وہ ٹھٹھر کر مر گیا؟ اگر وہ زندہ تھا تو وہ چیخا چلایا کیوں نہیں بھلا؟ کیا وہ پہلے ہی مر گیا تھا۔ لیکن نہیں جب میں چپ چاپ اس کے جھونپڑے میں گیا تھا تب مجھے یاد ہے کہ کمبل کھینچنے پر اس کا پاؤں ذرا سا ہلا تھا۔ اس کے گلے سے دبی دبی سی آواز آ رہی تھی۔ وہ زندہ ہی تھا۔ اور پھر کمبل کی گانٹھ کھلی ہوئی کیوں تھی؟ کیا میں لے جاسکوں اس لئے۔ لیکن پہلے تو اس نے گالیاں دے کر مجھے بھگا ہی دیا تھا۔ میرے پھر سے ہی اسے چرانے کا ڈر تھا کیا۔ تب کیا یہ خودکشی تھی؟ اس نے سونے یا مرنے کا ڈراما کیا تھا؟ میں کمبل لے سکوں اس کیلئے وہ سانس روکے لیٹا رہا؟ وہ اندھیرے میں بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ساتھ انصاف کیا میرے گھر والوں کو بچایا۔ جیسے وہ مجھے کمبل دے سکتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے بھگا دیا۔ چاقو دکھایا بعد میں مجھے لے جانے دیا۔ مجھے چوری کرنے پر مجبور کیا، میرے من پر پاپ کا بوجھ لاد کر میرا انصاف کیا۔ اس کے دل میں رہے اس انوکھے رحم سے میں پسیج گیا۔ من میں اٹھے سوال جوں کا توں بنے ہیں۔ امیروں نے کمبل بانٹے۔ ایک اس کو بھی دیا، کمبل سے ہی اس نے اس کی موت کو قریب بلوایا تب انھوں نے انصاف کیا یا ناانصافی؟ اوپری طور مجھے منع کیا اور خود ہی رسیاں کھول کر مجھے کمبل چرانے کا موقع دیا۔ شاید اس نے انصاف کیا ہے میرے ساتھ، ساتھ ہی ناانصافی بھی کیا ہے میرے ساتھ۔ میں اسے بھلا نہیں پاتا ہوں۔ اس کی یاد اور پوشیدہ احسان مجھ پر باقی رہے۔۔۔۔ کیا وہ خود مرنا چاہتا تھا یا کمبل کا انوکھا دان دینے کی وجہ سے اس کی موت ہوئی؟ کچھ بھی وجہ رہی ہو لوگ جسے ناانصافی مانتے ہیں وہ کبھی کبھی انصاف ہی ہوتا ہے۔ اور ایسا انصاف پوشیدہ اور پاک ہوتا ہے جسے صاف طور پر سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مطلب یہ کہ انصاف اور ناانصافی کی یوں گتھی بن گئے جسے بعد میں میں تھوڑا سا سمجھ پایا۔

(بیرو وان پھر خاموش ہے۔ اس کے ہاتھ کی سگریٹ بجھ گئی ہے۔ رات بیت رہی ہے۔ بجلی کوندی۔ کتا نزدیک بیٹھا ہے میں آگے سننے لگتا ہوں۔)

زندہ رہ کر موت کا سوانگ رچنا، جاگتے ہوئے بھی سونے کا ناٹک کرنا بھی انصاف ہے۔ پہلے 'نا' کرنے کے بعد میں 'ہاں' کرنا بھی انصاف ہے۔ آگے چل کر تنگی بڑھتی گئی۔ زندگی جہنم بننے لگی

تب ایک رات بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے کوئی پختہ سہارا ڈھونڈ لیا تھا۔ جانے سے پہلے اس رات اس نے میرے پیروں پر ماتھا رکھا، اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں جاگ رہا تھا لیکن میں نے نیند کا ناٹک کیا۔ ادھ کھلی آنکھیں سے میں اسے دیکھتا رہا۔ اس کا ٹوٹنا اور پھر سنبھلنا۔ اس کی گھٹن اور گھٹن سے ابھرنا۔ سب کچھ میں دیکھ رہا تھا۔ تب میں بھی مخالفت کر سکتا تھا) اس کی کمر پر لات بھی مار سکتا تھا۔ کم سے کم یہ تو بتا ہی سکتا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ لیکن تب وہ اپنے فیصلے سے پھر جاتی۔ میں سانس روکے اسے دیکھتا رہا۔ نیند کا ناٹک کرتا رہا۔ بچوں کو اپنے ساتھ لے جا کر اس نے بھی تو انصاف ہی کیا تھا۔ بچوں کو اچھی زندگی ملنے والی تھی۔ میرے تئیں اس کے دل میں ضرور کچھ تھا۔ تبھی تو اس نے جانے سے پہلے میرے پیر چھوئے۔ میرے دل میں اس کے لئے ایسا ہی کچھ تھا۔ شاید اسی لئے میں نے اسے روکا نہیں۔ نیند کا ناٹک کر میں نے اسے ٹھگا۔ وہ ناانصافی اور جانے دینا یہی انصاف۔ ایک دوسرے کی عزت رکھتے ہوئے آپس میں ہم نے ایک دوسرے پر انصاف اور ناانصافی کی۔ ایسی گتھی ہے صاحب، ایسی مہین گتھم گتھی، بڑی کٹھن۔ یہی سچ کہلاتا ہے۔

زندگی میں میں نے بہت کچھ سیکھا ہے پھر بھی آج میں اناڑی ہی ہوں۔ جو کچھ میں نے جانا یا سیکھا ہے کیا وہ سیکھنے کے لائق تھا بھی۔ آج بھی میں اسے اور بچوں کو بس یاد کر لیتا ہوں لیکن اسے تلاشتا نہیں۔ بھولا شنکر کو بھی یاد کرتا ہوں۔ کچھ باریکیاں سمجھ پایا ہوں اس لئے اسی بھرم میں خوش ہوں، گھومتا رہتا ہوں.... اکیلا۔

ختم ہوگئی گتھی کی کہانی۔

کہانی ختم ہوئی بیرووان کی۔ دل بڑا بھاری ہوگیا۔ ذہنی تھکان اور چاروں طرف برستا پانی۔ لیکن سننے سے پہلے پورے بدن میں چھار ہا المست سا نشہ کب کا گھل چکا تھا۔ رات ابھی بھی باقی تھی۔ سگریٹ کے بدلے میں کوئی اچھی رنگین کہانی ملے، یہی چاہ تھی۔ لیکن اس کے بجائے جو سنا وہ سن کر گیا۔ جیسے کس کر طمانچہ ہی مار گیا۔

کتے نے دم ہلائی، کان کھجایا اور نزدیک آ گیا۔ بڑی رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مارواڑی کی بیوی اب بھی جھپکیاں لے رہی ہے۔ ادھر اوٹ میں اب بھی کھسر پھسر جاری ہے۔ چائے والا لڑکا بھی وہی ہے۔ جو سو رہے ہیں اور جو سونا چاہتے ہیں۔ اسی حالت میں ہیں۔ گھڑی دھیمی رفتار سے چل رہی ہے۔ رات اور بارش۔ سارا جہاں کا تہاں بنا ہوا۔ لیکن میرے دل میں اتھل پتھل مچی ہے۔ دماغی الجھن بڑھتی چلی جارہی ہے۔

وہ دیکھ رہا ہے۔ نظر میں آنچ ہے۔ بڑی دہکتی ہوئی

''اچھی لگی، سچی کہانی؟''

''ہاں''

''بہت سارا بک گیا میں، ایک سگریٹ کے بدلے لیکن آپ کو لطف نہیں آیا ہوگا۔ دل نہیں بہلا ہوگا صاحب!...... بڑا مشکل ہے سمجھنا.... جھلسا دیتا ہے یہ علم۔ کیا سمجھے؟''

''ہاں''

''اب چلتا ہوں، بہت ہوگیا، ٹھنڈ بھی ہے نا؟''

''ٹھنڈ؟ ہاں.. ہے تو''

''اب تو تارتار ہوگیا...... بھولاشنکر کا کمبل......''

اس نے دکھائے چیتھڑے اس کمبل کے جسے اس نے اوڑھ رکھا تھا۔ وہ مڑتا ہے اپنی گاڑی کو رفتار دیتے ہوئے نکل جاتا ہے۔ اس کی گاڑی کے پہیوں کی آواز مجھے سنائی دے رہی ہے ......دل خالی خالی سا ہوگیا۔

رین کوٹ اوڑھے میں اسٹیشن پر دھیمے دھیمے آوارہ سا گھومنے لگتا ہوں۔ مارواڑی پھر مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی بیوی آرام سے سو رہی ہے۔ آنچل ڈھلکا ہوا ہے۔ سنیما کے وہ پوسٹرز۔ دوڑ لگاتے گھوڑے، بندوق، ننگی عورتیں۔ لیکن اب ان کے دل پر کوئی رنگین، گرم جوش، سنسناتا اثر نہیں، دل میں وہی گیت پھر سے گونجنے لگتا ہے۔ ''میں دکھ کی لمبی رات'' لیکن اب اس میں ذہنی اذیت کا اثر ہے۔ پلیٹ فارم اب بھی ویسا ہی ہے۔ ماحول بھی وہی۔ سنی ہوئی کہانی میں کمبل اب علامت بن چکا ہے۔ اس کا وشال روپ اب دکھائی دے رہا ہے۔ ہر ایک شخص حفاظت کا کمبل اپنے سینے سے لپٹائے، غیر صحت مند سا گھبرایا ہوا ہے۔ اس کمبل کا دان کسی نے کسی کو نہیں دیا ہوگا۔ ہر کوئی اس حفاظت کی چوری کے ڈر سے خوف زدہ ہے۔ اب میری دھیمی سی مسکراہٹ میں اداسی ہے۔

کتا آیا ہے میں اسے پچکارتا ہوں۔ اسے سہلاتا ہوں۔ اسے اچھا لگتا ہے۔ وہ دم ہلانے لگتا ہے۔ سگریٹ پینے کو دل کرتا ہے لیکن وہ ہے ہی نہیں۔ کب کی ختم ہوگئی۔ پھر میں وہ رات ہی اپنے اندر بھر لیتا ہوں۔ جلتا ہوا سچ سے دل جھلس گیا ہے۔ رات دل میں گہری جڑ بنا چکی ہے۔ پھیل گئی ہے اور درد بن کر رہ گئی ہے۔ میں گاڑی کے انتظار میں ہوں اکیلا ہی۔ کسی چوک گئے موقع

کی طرح وہ آنہیں رہی ۔ برستا پانی ۔ کڑکتی بجلی ۔ زندگی میں نہ کر پائے انصاف کی طرح گاڑی بھی کہیں دور کھو گئی سی ۔

وہی پرانا گانا ہے ۔ میں ہوں ، بیتی رات ہے اور بارش بھی !
میں یوں ہی راہ دیکھ رہا ہوں...... اکیلا...... !

☆☆☆

بھارت سا سڑے ۲۷ مارچ ۱۹۵۱ء کی پیدائش ۔ مراٹھی کے ممتاز کہانی کار ، ناٹک کار ۔ کہانیوں کے نو مجموعے ۔ چار ناٹک سمیت قریب ڈیڑھ درجن کتابیں شائع شدہ ۔ 'مہاراشٹر راجیہ پرسکار'، 'پریمل پرکاشن پرسکار'، 'کیشو راؤ کوٹھاوالے پرسکار'، 'کتھالیکھک پرسکار'، 'اننگرشٹ وانگ مے نرمتی پرسکار'، 'وبھاوری مدھوکر پاٹل وانگ مے پرسکار'، مہاراشٹر فاؤنڈیشن پرسکار سمیت دو درجن معروف انعامات سے نوازے گئے ۔

بینائی

ایم، ٹی، واسودیون نائر

یہ سوچنا غلط تھا کہ خبر یہاں تک نہیں پہنچی ہوگی۔

گاؤں والے گھر میں وہ اکیلے کبھی کبھی آجاتی تھی اس لئے کسی کو حیرت نہیں ہوئی، نہا دھوکر اور ناشتہ کر کے جب وہ برآمدے میں آکر بیٹھی تو ماں نے قریب آکر بغیر کسی تمہید کے پوچھ لیا۔ ''سدھا بیٹی! کیا وہ سب صحیح ہے جو میں نے سنا ہے؟''

''کیا سنا ہے آپ نے؟''

اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، اس نے سوچا سخت کلامی سے اپنے لئے دیوار کیوں کھڑی کروں

ماں نے آنکھیں موند کر دھیرے سے کہا ''یہی کہ تو پربھاکرن اب الگ الگ۔۔۔۔۔''

یہ ماں کی پرانی عادت تھی کہ جب وہ تکلیف دہ باتیں کرتیں تو اپنی آنکھیں موند لیتی تھیں۔

اسے لگا کہ سوال کا جواب دینے کی بجائے تیکھا ردیہ اپنانا ٹھیک رہے گا۔ ''کس نے تار سے یہ خبر یہاں تک پہنچائی؟''

اس کے قریب آکر ماں سیڑھی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''نارائن کٹی کے یہاں سے پرسوں سری دیوی آئی تھی، ان کی دیوو کا شوہر بھی اب مدراس میں ہے، نا!''

اس کی چھوٹی بہن کی ساس ضروری جگہوں پر تھوڑی تھوڑی خبر پہنچاتی رہتی تھی۔

کل وشالم کی چٹھی میں بھی یہی خبر تھی۔

چھوٹی بہن چندری بھی اپنی بھابھی سے ملی خبر آگے ماں کو لکھے گی۔

وہ آنگن میں اتر گئی، ابھی دس بجے تھے اور تیز گرمی شروع ہوگئی تھی، دیوار کے سائے

میں ہوکر وہ اس طرح چلنے لگی کہ ربر کی چپلیں ایڑیوں سے لگ کر تیز آواز پیدا کرنے لگیں۔

اس گھر میں ماں اکیلی رہتی تھی۔ کسی بہانے ادھر وہ تھوڑا آرام کی خاطر دوڑ آتی تھی۔ یہاں ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بجتی تھی۔ دعوتوں کے لئے سج سنور کر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آدھی رات تک پربھاکرن کے دوستوں کے نہ لوٹنے تک میزبان کو مسکراتے رہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اسے کبھی کبھار ہی ادھر آنے کی اجازت ملتی تھی وہ بھی تین چار دنوں کے لئے۔

''تجھے کب لوٹنا ہے؟'' یہی سوال اب ماں پوچھیں گی، لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا، جب وہ لوٹ کر برآمدے تک پہنچی تو ماں نے پوچھا۔''لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، سچ مچ کیا ہوا تھا؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔

''جہاں تک سنا۔۔۔۔۔'' ماں نے بات بیچ میں روک دی۔

''ٹھیک ہے ماں! الگ ہونا ہی دونوں کے لئے اچھا ہوگا۔''

ماں سر جھکائے بیٹھی نیچے دیکھتی رہیں۔

جب باورچی خانے کی معاون لڑکی کچھ پوچھنے آئی، تب ماں اٹھ کر اندر چلی گئی۔

وہ بینک میں پندرہ دنوں کی چھٹی کی درخواست دے کر آئی تھی، کچھ لوگوں کو وہاں خبر مل گئی تھی صرف کیشیر نرملا سری نو اسن کو اصلی بات بتادی تھی۔ Y.W.C.A میں نرملا نے کمرے کا انتظام کر دیا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ ماں اکیلی رہنا ہی پسند کرتی ہیں۔ رشتہ داروں اور مہمانوں کو وہ زیادہ مدعو نہیں کرتی تھیں اگر بیٹے نہیں آتے تو کوئی شکایت نہیں کرتیں، چاہے جواب آئے یا نہ آئے۔ وہ اپنی تینوں بیٹیوں کو ہر مہینے ان لینڈ لیٹر لکھا کرتی تھیں۔ روزانہ پڑوس کی کوئی نہ کوئی لڑکی ان کا ہاتھ بٹانے آجاتی تھی۔ جب وہ پچھلی بار آئی تھی تو اس لڑکی کی شادی کے لئے ماں سونے کی چین دے رہی تھی۔ ''تم تینوں کا اس میں حصہ رہے گا، کٹی رامن کے نام منی آرڈر بھیجنا کافی ہوگا یا میرے نام بھیجنا۔''

وشالم دیدی اور چندری نے تین تین سو روپے دئے تھے، سدھا نے چار سو، میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں، بچے بھی نہیں، اس لئے ماں نے سدھا کے حصے میں ایک سو روپے زیادہ رکھے تھے۔

وہ لڑکی چلی گئی تو اس کی چھوٹی بہن ماں کو سہارا دینے آئی۔

وشالم دیدی کو ماں کے یہاں اکیلے رہنے میں دکھ تھا۔ تروننت پورم میں ان کا بڑا گھر

ہے۔نوکر چاکر بھی ہیں، اگر سب بہنیں آئی ہوتیں تو دیدی نے یہ کہا ہوتا۔ ''کبھی کچھ بیماری ہوگئی تو، ادھر قریب میں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔''

اور ماں نے اس کا جواب دیا ہوتا۔ ''مجھے کوئی بیماری نہیں ہوگی۔''

کیلے کے پیڑوں کے پاس دیوار کچھ ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہیں سے نکل کر ایک کالی مرغی اور اس کے چوزے آنگن میں آئے، وہ آنگن میں آکر کچھ چگنے لگے۔

''جنگلی مرغی ہے۔ اس وقت روز آیا کرتی ہے، نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے۔'' ماں نے کہا وہ اسے تجسس سے دیکھنے لگی، مرغی کو تھوڑی گھبراہٹ ہوئی کہ کسی کے آنگن میں چلی آئی ہے۔

سدھا دھیرے سے اس کے پاس جا کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، مرغی نے اپنے بچوں کو اشارہ کیا اور فوراً چوزوں سمیت باغ میں چلی گئی۔

کھانا کھاتے وقت ماں نے کچھ کہا نہیں۔

شام کو شری دھر بھیا آگئے، وہ چھوٹی بہن کے شوہر کے بڑے بھائی تھے۔ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور گاؤں کے اہم شخص تھے۔

اس نے سوچا کہ وہ اس ڈھنگ سے پیروی شروع کریں گے کہ ہم نے سنا تھا۔۔۔! وہ تیار کھڑی تھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، ان کی بیوی اور بچوں کا حال پوچھا، کڑی گرمی کا ذکر کیا۔

''سدھا کی کتنے دنوں کی چھٹی ہے؟''

''ایک ہفتے کی۔''

ماں بیچ میں آگئی۔ ''شری دھر تمہیں چائے پلانے کے لئے دودھ نہیں رہا۔''

''چھوڑیے۔''

جب اس کی بات پوری ہوگئی تو ان کے پاس بات چیت کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ وہ ہچکنے لگی۔ تب شری دھر نے بات شروع کی۔ مدراس کی کڑی گرمی، جے للتا کی بھاری دولت، کروناندھی کی حکومت، وغیرہ وغیرہ، سدھا صرف سنتی رہی اپنی طرف سے کچھ کہا نہیں، اپنی بات پوری کر کے وہ اٹھے۔

سنا تھا کہ سدھا کی شادی کی پیش کش میں ان کی جنم پتری پر بھی غور کیا گیا تھا۔

شام کو آنگن میں چھوٹی پتنگیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بچپن میں سنا تھا کہ پتنگیں نیچے کی طرف اڑتی ہیں تو برسات یقیناً ہوتی ہے۔ اس نے چاہا کہ بارش ہوجائے، یہاں کی گرمی

اپنے صوبے کی گرمی سے کم نہیں تھی۔ ادھر گھر پر پنکھے نہیں لگائے گئے تھے اس لئے کہ اخراجات کون دے گا، ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔

''رات کو دکھن جانب کے کمرے میں سو جانا، وہاں تھوڑی سی ہی سہی، ہوا ملے گی۔'' کھانا سامنے رکھتے ہوئے ماں نے اس سے کہا۔ ''جہاں بھی ہو، ٹھیک ہے۔''

ماں کے کمرے میں ایک زنگ آلود پرانا ٹیبل فین تھا، جسے پہلے کبھی اباجی نے خریدا تھا۔

پڑھنے کے لئے اس کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، راستے میں کچھ خریدی بھی نہیں۔ ماں کے کمرے کی گول میز پر ابا کی پرانی کتابیں جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں۔ ماں رات کو کچھ دیر پڑھا کرتی تھیں لیکن ان میں نئی کتابیں نہیں ہوں گی۔ ''عالمی تاریخ کا مجموعہ'' نام کی ایک کتاب ماں نے کھول رکھی تھی۔ ''ہیم گری وہار''

دکھن جانب کمرے میں اس کے لئے بستر لگایا گیا تھا۔ اس نے ساڑی بدل کر نائٹی پہنی۔ وقت دیکھا پونے نو بج رہے تھے۔ شہر میں تاش کھیل کر بیر پی کر گھر لوٹنے کا وقت تھا۔

ماں اندر چلی گئی۔

''وہ پنکھا تو ادھر لے آ، کچھ آواز کرتا ہے مگر ابھی چلتا ہے۔''

''نہیں، ماں!''

وہ اس ڈھنگ سے کھاٹ پر لیٹنے کا انتظام کر رہی تھی کہ ماں جلدی چلی جائیں۔

ماں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ ''کہئے''

''پانچ سال ساتھ رہنے کے بعد بچھڑنا۔۔۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔۔ ''سن، لوگ کیا کہیں گے؟''

اس نے منھ پھیر لیا۔ اب تو ماں کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دیتا تھا، اسے جیسے ایک موقع مل گیا تھا، اس نے پوچھا۔ ''کیا ادھر فون کرنے کی سہولت ہے؟ اگر کوئی ضرورت پڑے تو۔۔۔''

''اب دوائیوں کی دکان کے پاس بوتھ لگ گیا ہے، جہاں چاہیں فون کر سکتے ہیں۔''

اسے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''تو نے کیا سوچا ہے؟''

''میں ابھی سوچ رہی ہوں۔''

''کیا مجھے وہاں آنا ہوگا؟ کیا میں پربھاکرن سے بات کر کے دیکھوں؟''

اس نے فوراً کہا۔'' جی نہیں، ابھی نہیں۔''

ماں نے اسے دکھ سے دیکھا۔ اس نے اس طرح کہا کہ اپنا غصہ ظاہر نہ ہو پائے۔'' اس میں کسی سمجھوتے کی بات نہیں، ماں!''

ماں باہر چلی گئی، وہ جانتی تھی کہ ماں آگے اس موضوع پر بات نہیں کریں گی، چپ چاپ سہہ لینا اس کی عادت تھی۔ لقوہ کی بیماری میں ابا جان ڈیڑھ سال پڑے رہنے کے بعد گزر گئے تھے۔ انھوں نے اپنی قسمت اور زندگی کا دکھ درد کسی سے بانٹا ہی نہیں۔ جب لوگ اس عورت کے بارے میں پھسپھسائے تھے جس نے ان کی ساری جائداد ہڑپ لی تھی، تب بھی ماں کچھ نہیں بولی تھیں۔

سویرے ماں نے کہا۔'' چول یل کی دادی تجھے ایک بار دیکھنا چاہتی ہیں۔''

وہ ہچکنے لگی۔

'' جانو نے جب کہا، تبھی تائی جان گئی تھی، وہ تو اس کے پاس والے گھر سے ہمارے لئے دودھ لے آتی ہے۔''

'' ٹھیک ہے میں ان سے جا کر مل لوں گی۔''

'' پچھلی بار تو نے جانے کی بات کہی تھی، لیکن گئی نہیں''

'' اس بار جاؤں گی۔''

'' وہ چوراسی سال کی ہوگئی ہے، کون جانے کب تک رہیں گی، ان کی آنکھوں کی روشنی بالکل چلی گئی ہے لیکن انھیں اور کوئی بیماری نہیں ہے۔''

چول یل کی دادی اس کی اپنی نانی کی بھابھی ہیں، ماں کو کہتے دیکھ کر بچے بھی انھیں دادی کہتے ہیں۔ چھوٹی بہن کی شادی کے وقت دادی ادھر آ گئی تھیں وہ شالم دیدی کے بالوں کو ٹھیک سے باندھ دیتی، شام کو ان کی تینوں بچیوں کو بھجن گانا سکھایا تھا۔

نانی خود فرش پر سو کر دادی کو کھاٹ پر سونے دیتیں۔ دادی کو کچھ دیر تک کسی کو کہانی سنا کر ہی نیند آتی تھی۔ ہمیشہ وہ سدھا کو ساتھ لے لیتی تھیں۔ وشالم دیدی کہیں جان بوجھ کر چلی جاتیں۔ چندری تو سونے کا ڈھونگ کرتی۔

دادی لوک کتھائیں سنا سنا کر اسے سلاتیں، پلا ہو کومن، کوویلن، کتھا کی وغیرہ بہادروں کی کہانیاں سناتیں۔ ویسے سدھا چاہتی تھی کہ دادی کے لئے کچھ تحفے لے کر آئے مگر جس دن شاپنگ کے لئے جانا تھا اس روز کسی بات پر پربھاکرن سے لڑائی ہوگئی، گاڑی کے وقت تک ہوٹل

کے کمرے میں پڑی رہی۔

اپنی شادی کے پہلے والے دن وہ انھیں سلام کرنے گئی تھی تب انھیں آخری بار دیکھا تھا۔ پانچ سال پہلے کی بات ہے جب نانی زندہ تھیں تب بھی دادی کو زیادہ چاہتی تھی۔ ان پانچ برسوں میں وہ سات بار، ہاں سات بار گھر آئی تھی۔ دوبار پر بھاکرن بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہر بار دادی اس کے بارے میں پوچھا کرتی تھیں۔ یہاں سے مشکل سے تین فرلانگ کی دوری رہی ہوگی، پھر بھی جانہیں پائی، اپنی مصروفیات کی وجہ سے۔

جنگلی مرغی اس روز بھی گھر کے آنگن میں آئی، اس سے اب ڈرتی نہیں تھی۔ وہ اس کے کچھ اور قریب چلی گئی۔ ساتھ میں بچے بھی تھے۔ اس کے کالے پنکھوں پر دھوپ کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔

''کچھ مہمان لوگ ہیں بھئی'' آواز سن کر مرغی بھاگ گئی۔

اس نے دیکھا تو آنگن میں شری دیوی اور بہن آئی ہوئی ہیں۔

ماں نے رسمی طور پر انھیں بیٹھنے کو کہا۔ جانو کو چائے بنانے کو کہا۔ اسے ایک عجیب ڈھنگ سے دیکھتے ہوئے وہ اندر چلی گئی۔ ان کے اس ''عجیب'' کا مطلب تھا، اب تو سب کچھ سن لے، ان سے۔

''بیٹھ سدھا، میں تجھے صاف صاف بتا دیتی ہوں، کہیں اس کا غلط مطلب نہ لینا۔''

وہ بیٹھی نہیں، اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

''جی کہیے۔''

''ناحق گھما پھرا کر کیوں کہوں، کہے بغیر کام نہیں چلے گا، جو کچھ میں نے سنا، اگر وہ ٹھیک ہے تو بہت برا ہے''

وہ ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی، پھر یوں ہی بولی۔ ''برا تو ہے لیکن اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''

شری دیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا، انھوں نے چھوٹی بہن کی طرف اس انداز سے دیکھا ''تو ہی بتادے''۔

اب کی بار بہن بولی۔ ''نارائن کٹی نے جو لکھا، وہ صحیح ہے، سارے خاندان پر کالک لگ گئی۔''

وہ خاموش رہی۔

''پانچ سال رہ کر اب تو رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔''

''آگے آپ بولیں۔'' اس امید کے ساتھ چھوٹی بہن نے بڑی کو دیکھا۔

''غلطی وَلطی ہوئی ہوگی، سہنا ہی ہوگا، میاں بیوی میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، میری ماں

نے بھی کیا کیا نہیں سہا۔''

سدھا مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ کہنا چاہتی تھی۔ ''شری دیوی جی، غلطی میری ہے، پربھا کرن کی نہیں'' لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، وہ پھر باتیں کرنے لگیں۔

''جن باتوں میں اسے دلچسپی نہیں تھی، ایسی باتوں سے بچنے کے لئے وہ اپنے کان بند کر لیتی تھی، بچپن سے یہ ہنر اسے آتا تھا۔ لمبے چوڑے نام، کتابوں کے کردار، بچپن ہی دیکھی ہوئی جگہوں کا جغرافیہ، ایلی منٹری اسکول میں ساتھ پڑھے بچوں کے چہرے، ایسا کچھ تلاش کرنا پڑتا تو اسے بھلاوا آ کر سہارا دیتا۔

رخصت ہوتے وقت شری دیوی نے پوچھا۔ ''کیا تجھے لگتا ہے کہ میری یہ باتیں بے معنی ہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''جی نہیں''

''یعنی میری باتوں میں کچھ سچائی ہے۔''

''جی''

انھیں دلاسہ مل گیا تھا۔ ''تو تیرا کیا فیصلہ ہے؟''

''جی سوچ رہی ہوں۔''

شری دیوی اور اس کی بہن اس تسلی سے کہ اپنا فرض پورا ہو گیا ہے، ہنستے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ماں نے پوچھا۔ ''تو کب دادی کے پاس جا رہی ہے؟''

''جاؤں گی ماں۔''

دادی بھی شاید اسے سبق دینے کو تیار بیٹھی ہوں۔

دوپہر کو اس کے ساتھ پڑھنے والی سومتی اپنے تین سال کی بچی کو لے کر آئی۔ ہائی اسکول کے دنوں میں وہ روز کسی گھر پر اس کا انتظار کرتی تھی۔ اس کی ناک کے نیچے والا مسا کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ دسواں کلاس پاس کرنے سے پہلے اس کی شادی ہو گئی تھی۔

سدھا نے اسے بیٹھنے کو کہا لیکن وہ بیٹھی نہیں۔

''کیوں سومتی کیسی ہو؟''

''بس یوں ہی چلتی ہوں''

نیلے، وائیلٹ اور لال رنگ کی چمکیلی ساڑی، اس کا شوہر گلف میں کام کرتا ہے۔ شاید وہ لایا ہوگا۔ وہ دو سال میں ایک بار دو مہینے کی چھٹیوں میں گھر آتا تھا سومتی کے بدن سے تیز خوشبو کی

مہک آ رہی تھی۔ اس کی گردن اور کلائی پر سونے کے ڈھیر سارے زیورات تھے۔

''سنا کہ تم آ گئی ہو، کتنے دن رہو گی؟''

''کچھ دن''

اگلے سمبار کو سومتی کے نئے گھر کا افتتاح تھا۔ بولی۔'' سدھا، تمھیں ابھی سے دعوت دے دیتی ہوں، آنا ہوگا تمہیں۔''

''اگر میں ادھر رہی تو ضرور آؤں گی۔''

بچی ماں کی ساڑی کے پھولوں پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ سدھا نے اس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا۔'' اس کا کیا نام ہے، میں بھول گئی۔''

''کارتکا''

اس نے کارتکا کی انگلی پکڑ کر اپنے پاس کھینچنے کی کوشش کی لیکن بچی روتی ہوئی اپنی ماں سے چمٹ گئی۔ سومتی اس کے اور قریب آئی او دھیرے سے پوچھا۔'' سنا ہے کہ تمہاری ازدواجی زندگیکچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔''

''اوہ، تم نے بھی سنا؟''

''مجھ سے شنکر کی بیوی نے کہا تو مجھے یقین نہیں آیا۔''

سدھا صرف سنتی رہی۔

''کیا یہ ٹھیک ہے، سدھا؟''

''تھوڑا بہت۔'' سدھا ہنس دی۔

سومتی نے تشکیک سے اپنی آنکھیں پھیلا کر دھیرے سے پوچھا۔'' یہ مت سوچو کہ میں اپنے سے پڑھی لکھی عورت کو نصیحتیں دے رہی ہوں۔ سمجھوتا کرو وہی اچھا ہوگا۔''

سدھا نے اس کا ہاتھ سہلایا۔'' میں غور کروں گی۔''

''یہ غلط ہوا کہ ابھی تک بچہ نہیں ہوا، ورنہ آدمی ہو یا عورت، برے خیال نہیں آتے۔''

سدھا نے سومتی کو تعجب سے دیکھا۔ اسے اپنے دل میں لکیریں کھینچنے کے لئے ایک اچھا دیسی لفظ مل گیا۔'' برے خیال''

سومتی چلی گئی۔ شام کو جانو دودھ لے آئی تو بتایا کہ چول یل کی دادی پھر سے آپ کو پوچھ رہی تھیں۔

ماں نے کہا۔ ''ذرا جا کر انھیں دیکھ آنا''

''جی! کل جاؤں گی۔''

''انھیں پیسوں کی ضرورت نہیں ہوگی، پھر بھی کچھ دے دینا۔ وشالم انھیں دیکھنے گئی تھی تو پچاس روپے دے آئی۔ دادی یہ بات بتا رہی تھیں۔''

ماں ہنس رہی تھیں۔ اس کے آجانے کے بعد ان کے چہرے پر پہلی بار رنق آئی تھی۔ کیا میں ان سے کہہ دوں کہ وشالم دیدی سے میں مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ سوموار کو لوٹنا ہے۔ دو ہفتے پورے ہو جانے کی ضرورت نہیں۔ بس تین ہی دنوں میں بہت کچھ مل گیا ہے۔

حیدرآباد فون کروں کیا! موبائل فون نمبر ہینڈ بیگ کی ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ آفس کا ڈائرکٹ نمبر یاد ہے۔

اس نے سوچا۔ یا ٹکٹ ریزرو کرانے کسی آدمی کو بھیجوں مگر ایسا کوئی یہاں نہیں ہے۔ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں چڑھوں گی صرف ایک رات کی بات ہے۔

''اگر گھر پہنچ جانا تو بھی فون کر دینا۔'' اس سے یہ تاکید کی گئی تھی۔

''if possible'' اس نے جواب دیا تھا۔

اگلے دن ناشتہ کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''میں دادی کو دیکھ آؤں!''

''جانو کو ساتھ لے لے''۔

''جی نہیں''

وہ پہلے سومتی کے نئے گھر میں گئی۔ سومتی کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہاں دو مزدور دروازے پر وارنش کر رہے تھے۔

اس نے گھر کے اندر جا کر دیکھا۔ ''دونوں کمرے attached ہیں۔'' بڑے فخر سے سومتی بولی

وہ اس ضد سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ کھا پی کر ہی جائے۔

''جولائی میں وہ آرہے ہیں۔''

''ان سے کہو کہ تمھیں بھی ساتھ لے جائیں، تم بھی دبئی گھوم آؤ۔''

''مشکل ہی ہے، جن کی اونچی تنخواہ ہے وہی ایسا کر سکتے ہیں۔'' پھر بھی سومتی بے حد خوش تھی۔

''اچھا! میں چلوں سومتی، چول یل کے گھر جا کر دادی سے ملنا ہے۔''

''میں نے جو کہا، وہ یاد ہے؟''

''ہاں'' وہ مڑ گئی۔

بانس کے جھرمٹوں کو پار کر کے اس نے سوکھی ندی کو دیکھا۔ ندی کے دونوں طرف پہلے جھاڑیاں تھیں۔ تب ہر وقت ندی میں پانی ہوتا تھا، برسات کے وقت کناروں کو ڈبو کر ندی بہتی تھی۔ جو نیچے نہر تک جا کر یہ ندی کی دھارا بن جاتی تھی۔

یہ گھر دادا کے وقت بنایا گیا تھا۔ پہلے یہاں دہلیز پر مضبوط سیڑھیاں تھیں۔ اب بانس کی سیڑھی ہے۔ وہ اندر آنگن میں پہنچی تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ احاطے میں کالی مرچ کے دانے سکھانے کو ڈالے ہوئے تھے۔

وہ تھوڑی ٹھٹکی ہی تھی تبھی اس نے تنکم دیدی کو برآمدے میں آتے ہوئے دیکھا۔

''ارے! یہ کون آ گئی ہے، دادی آج سویرے ہی تمھاری بات کر رہی تھیں، انھیں شکایت تھی کہ تم ان سے ملے بغیر ہی چلی جاؤ گی۔''

برآمدے میں اسے تنکم دیدی نے کرسی پر بٹھا دیا پھر گھر خاندان کی باتیں کرنے لگیں۔ ان کے دونوں لڑکے باہر پڑھ رہے ہیں۔ اپنی پریکٹکل امتحان کے لئے پچھلے ہفتے واپس چلے گئے تھے۔

چھوٹی لڑکی نویں درجے میں پڑھتی ہے۔ چھوٹی بہنوں نے ماں کی موت کے بعد اپنا حصہ لے کر اپنے شوہروں کے ساتھ الگ گھر بسا لیا ہے۔

''یہ ٹوٹا پھوٹا پرانا گھر میرے سر منڈھ دیا گیا ہے۔ میری حمایت کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ شوہر کی جدائی یاد آنے پر ان کا گلا رندھ گیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں پونچھ لیں۔

''دادی ماں کہاں لیٹی ہیں؟''

''اتری کمرے میں، آنکھوں کی روشنی لگ بھگ چلی گئی ہے۔ نہ جانے کہاں گر جائیں۔ پھر بھی انھیں منظور نہیں تھا کہ کوئی ان کے روزانہ کے کام میں سہارا دے۔'' تب دروازے پر دادی ماں کی آواز آئی۔ ''میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔'' دروازے کے دونوں کواڑوں پر ہاتھ لگائے ہوئے دادی ٹھیک برآمدے میں آ گئی۔ سدھا فوراً ان کے پاس چلی گئی۔ چوراسی برس کی عمر میں بھی وہ ٹھیک ٹھاک کھڑی تھیں۔ چھوٹی کرتی کے ساتھ سفید دھاری دار دھوتی (ساڑی)، چاول کی

مانڈ سے استری کئے گئے کپڑے۔ چہرے کا باوقار طرز ابھی تک برقرار تھا۔ سفید بالوں کی چمک دیکھتے ہی بنتی تھی۔ سدھا کو بچپن کی وہ کہانیاں یاد آئیں جو انھوں نے سنائی تھیں۔

جب تنکم دیدی ان کے لئے کرسی لانے لگیں تو دادی بولیں۔ ''نہیں، میں یہیں بیٹھوں گی! سدھا بیٹی، تو بیٹھ جا۔''

دھیرے سے ان کی ہتھیلی اس کی ہتھیلی کی طرف بڑھی۔ وہ وہیں سیڑھی پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''سدھا! لگتا ہے تو کچھ موٹی ہوگئی۔''

اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا، دادی کا کہنا ٹھیک تھا۔

''چار قدم بھی چلتی ہوں تو میں ہانپ جاتی ہوں، ویسے میں دیکھے بغیر ہی تجھے پہچان گئی تھی۔ سانسوں سے مجھے پتہ چل جاتا ہے۔''

دادی ہنس دی۔ صرف ان کی پکی آنکھوں پر عمر کا اثر پڑا تھا۔ چہرے پر جھریاں نہیں پڑی تھیں۔ گردن پر عمر کی سلوٹیں نہیں پڑی تھیں۔

''تنکم! تو چائے بنا دے، کٹھل کے چپس بھی بنا دے۔''

سدھا بولی۔ ''جی! میں کچھ نہیں کھاؤں گی، صرف آدھا گلاس چائے پلا دیجئے۔''

دادی شاید تنکم دیدی کے اندر جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''بیٹی! تو نے کیا فیصلہ کیا؟''

دادی کا سوال اچانک سن کر وہ پریشان سی ہوگئی۔

''ڈرنا مت! میں نے تجھے گالی دینے یا درس دینے کو نہیں بلایا ہے، تجھے دیکھے چار سال ہوگئے تھے نا، اس لئے۔''

اسے راحت مل گئی۔

میں جن باتوں پر کچھ بولتی ہوں، اسے سن کر یہاں کے لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو بوڑھی اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں پاتیں، وہ کیا سمجھیں گی؟ جیسا میں دیکھتی ہوں ایسا کیا یہ لوگ دیکھ پاتے ہیں؟''

اس نے سمجھا کہ دادی نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ اونچا کیا تھا تاکہ رسوئی سے تنکم دیدی اسے سن لیں۔

پھر دادی نے اپنا لہجہ دھیما کر دیا۔ ''تو نے کیا فیصلہ کیا؟''۔ وہ اچانک سہم گئی، اس کی سانس تیز ہوگئی۔

''اگر تو اس سے اوب ہی گئی ہے تو چھوڑ دے، شادی وغیرہ کی باتیں نجی ہوتی ہیں۔ دوسروں کو دکھانے کے لئے دولوگ ڈھونگ رچیں، اس کا کوئی مطلب نہیں۔''

گہری سانس لے کر دادی کے سامنے بیٹھ گئی۔ دادی نے اپنا سر اس کے قریب بڑھایا۔

''تم لوگوں نے انھیں دیکھا نہیں ہوگا جو میری زندگی میں پہلے آئے تھے۔''

''ماں نے دیکھا ہے، جو گائک تھے وہی نا؟''

''انھیں کی وجہ سے جھنجھٹ ہوگئی تھی۔ ان کا سنگیت کا کلاس ہمارے پڑوس میں چلتا تھا، کھانا وانا ہمارے گھر میں ہوتا تھا۔ ان کا سنگیت ایک دم دل میں اتر جاتا تھا۔ لال رتن والا زیور، سیندور کا ٹیکہ، مجھے بھی ان کے تئیں لگاؤ ہو گیا تھا۔''

دادی سر پر ہاتھ پھیلا کر ہنسنے لگیں۔

''ایک سال کے اندر وہ چلے گئے۔''

''ماں نے بتایا ہے۔''

دادی پھسپھسائی۔ ''اپنی خوشی سے وہ نہیں گئے تھے، میں نے انھیں جانے کو کہا تھا۔'' دادی کہیں دور نظریں گاڑے مسکرا رہی تھیں۔

''مجھے پیسہ ویسہ کچھ نہیں دے پاتے تھے، وہ تو ٹھیک ہے لیکن لڑکیوں کی سی بات چیت، شرم اور ہاؤ بھاؤ کیسے سہا جاتا؟ مرد ہیں، تو اسی کے مطابق دلچسپی لگاؤ اور امنگ چاہئے نا! رشتہ توڑنے کی بات میں ہی سیدھے سیدھے ان سے کہہ دی تھی، اور کیا!'' اس نے ایک گائک سے ان کی پہلی شادی کی بات سنی تھی لیکن اس کی زیادہ جانکاری اسے نہیں تھی۔ پھر دادا جی ان کی زندگی میں آگئے۔ 'نمک کے داروغہ' تھے۔ تین بچے ہوگئے، دادا جی چل بسے، دونوں بیٹے بھی گزر گئے، اب دادی ہی ہیں۔

''تو نے انھیں دیکھا نہیں کیا؟ دادا جی کا رنگ روپ دیکھنے کے لائق نہیں تھا۔''

''بچپن میں دیکھا تب وہ بیمار تھے۔''

''اس علاقے میں ویسا دوسرا شریف آدمی نہیں تھا، مندر کے تیوہار میں اگر ہاتھی بگڑ جاتا تو اسے منانے کے لئے مادھون نائر کی ضرورت پڑتی تھی، آتش بازی میں بارود بھرنے کا فن صرف انھیں کو آتا تھا۔''

تنکم دیدی چائے لے آئی، جب تک وہ قریب رہیں تو دادی جی سنجیدہ موڈ میں بیٹھی تھیں، جب دیدی اندر گئی، تو دادی پھر سے ہنسنے لگیں۔

''بابر ے دیکھنے پر بدمعاش ہی لگتے تھے۔ ہر وقت جھگڑالو، گالی گلوج، لیکن نیک اور بھولے تھے۔ یہ میں ہی جانتی تھی اگر میں کہتی کہ زکام ہو گیا ہے تو بے چارے گھبرا جاتے تھے۔''

دادی زور سے ہنسیں۔

وہ اپنے حالات کو بھولنے لگی تھیں۔ وہ دادی کی باتوں کی سننے کے لئے بے تاب ہو اٹھی جیسے بچپن میں ان کی کہانیاں دلچسپی سے سنا کرتی تھی۔

''یوں ایسے لوگوں سے میری بنتی نہیں ہے، چھوٹے نارائن کے پیدا ہونے کے بعد۔۔۔''

''کیا؟''

''سمجھو کہ ایک قسم کی مجھ میں ترنگ پیدا ہوگئی تھی، ویسا ایک مرد آ گیا۔ میں نے خود کو سمجھایا، نالائق ہے تو، اپنے پر قابو رکھ، ویسے میں بچ گئی، پھر بھی۔۔۔''

جملہ کو پورا نہ کر کے دادی ہنس دی، ان کے صرف دو تین دانت ہی ٹوٹے تھے، یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔

''تب میری عمر تیرے جیسے تھی۔'' دادی نے گہری سانس لی۔

''دادی جی کیا وہ زندہ ہیں؟''

''ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔''

''گزر گئے، سب چلے گئے، صرف میں بچی ہوں، جب تک اوپر سے بلاوا نہیں آتا، یوں ہی پڑی رہوں گی، خودکشی تو نہیں کر سکتی نا۔''

پھر سر جھٹکنے کے بعد دادی سرک کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''وہ دوسرا آدمی کون تھا؟''

''آں!''

''ایک آدمی کو تو نے دیکھا، تجھے پسند آیا، تو نے فیصلہ کیا کہ آگے اسی کے ساتھ رہے گی، کیا یہی ہوا نا؟''

''آپ سے کس نے کہا؟''

دادی بولی۔ ''کسی کے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بول، کون ہے بٹیا؟''

اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔

''تیرے ساتھ کام کرتا ہے کیا؟''

''نہیں''

یہ بات دادی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ دیکھا تھا اسے، کسی ڈنر میں منیجر کے تبادلے کے موقع پر پارٹی چل رہی تھی۔ جناردن راؤ جو اپنے کو گائک سمجھتا تھا، غزلیں گا رہا تھا، جب مہمان خصوصی، عہدیداران اور مہمان لوگ سب شراب کے نشے میں بہک رہے تھے، تب ہال کے کونے میں ایک شریف مرد اورنج جوس ہاتھ میں لئے اکیلے کھڑے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا دل بے چین ہوتا جا رہا تھا۔ ''یا خدا'' ان کی آنکھیں سیدھے میرے اندر پہنچ رہی تھیں۔

جب بتایا گیا کہ وہ مہینے میں دس دن مدراس میں رہتے ہیں تو خوشی ہوئی۔ جب لوگ ان دونوں کے پاس آنے لگے تو انھوں نے پوچھا۔ ''کیا بینک کے فون نمبر پر آپ ملیں گی؟''

اس نے ''ہاں'' کہا، یہ نہیں پوچھا انھوں نے کہ کس نام سے فون کرنا ہے۔

دادی نے پوچھا۔ ''اس کی بیوی ہے کیا؟''

''نہیں'' پربھا کرن کو پتہ ہے؟''

اس نے تھوڑی دیر رک کر کہا۔ ''ہاں! تھوڑا بہت۔''

''تو تم دونوں الگ ہو جاؤ، اسے بھی کوئی دوسری مل جائے گی۔ اس بارے میں زیادہ سوچنا مت، تم اسے چھوڑ دو۔''

اسے مزا آیا۔ ''دادی، اب اتنی جلدی الگ نہیں ہو سکتے، ایسا پہلے کر سکتے تھے۔''

''نہیں چاہتی تو چھوڑ دے، اور کیا۔''

اسے بغیر گھبرائے بولنے کی ہمت ملی۔

''نہیں ہو سکتا، دونوں مل کر عرضی دے دیں، چھ مہینے بعد جج بلا کر پوچھیں گے۔ اب بھی دونوں الگ رہنے کے حق میں ہو؟ اگر ''ہاں'' کہیں تو پھر چھ مہینے لگیں گے۔''

اس نے دیکھا کہ دادی کے چہرے پر دھیرے دھیرے غصہ چڑھ رہا ہے۔

''اگر دونوں کو منظور ہے اور دونوں ساتھ رہنا چاہیں تو جج کی اجازت چاہئے کیا؟''

''قانون تو یہی ہے دادی جی۔'' دادی اس کی باتوں سے ذرا بھی مطمئن نہیں تھی۔

''اگر بچے وچے ہوں تو ان کے خرچ کی بات طے کرنی ہوگی۔ خیر یہ تو ٹھیک ہے لیکن

اگر دونوں راضی ہو گئے تو جج کو کیا پڑی ہے؟''

''یہی قانون ہے''

''کیسا قانون؟ مجھ سے کچھ کہلوانا مت۔''

تنلم دیدی کلاس لینے کو آئی۔ دادی جی دھیرے سے کچھ بدبدا رہی تھیں۔ تنلم دیدی نے کہا۔ ''پچھلے سال تک بھی پر چھائیں سی دکھ رہی تھی دادی کو، اب تو اتنا بھی نظر نہیں آتا۔''

اس نے کہا۔ ''آپریشن سے بینائی واپس آجائے گی۔ اس عمر میں بھی کئی لوگ آپریشن کراتے ہیں۔ میں آپ کو مدراس لے جاؤں گی۔''

دادی لرزوی ہنسی ہنسی۔ ''نہیں، نہیں، اب بینائی کیوں؟ اب تک جو کچھ دیکھا وہی کافی ہے، ہے نا بہنی؟''

وہ جانے کے لئے تیار ہوئی، تنلم دیدی بولیں۔ ''اب کھانا کھا کر جاؤ۔''

''جی نہیں، ماں نے کھانا تیار کر رکھا ہوگا۔''

''چولہے پر چاول چڑھا دیا ہے۔ جب تم اس طرف آتی رہتی ہو تو یہاں بھی آیا کرو، سدھا بہنی!''

تنلم دیدی اندر چلی گئی۔ چودہ برس کی لڑکی بانس کی سیڑھی سے وہ اندر آ گئی۔ دادی کی آنکھیں دہلیز تک گئیں۔ لڑکی نے برآمدے کے نیچے چپل اتار دی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ سر جھکائے دھیرے سے اندر گئی۔ جب لڑکی سامنے آئی تو دادی نے پوچھا۔ ''تو کہاں گئی تھی؟''

لڑکی سہم گئی، بولی۔ ''پڑوس میں، شاردا سے ایک کتاب لینے گئی تھی۔''

''پڑوس میں جانے لئے ریشمی لہنگا پہن کر جانا ضروری ہے کیا؟''

لڑکی ایک دم سن رہ گئی۔ پھر وہ دادی کے بغل سے ہوتے ہوئے اندر چلی گئی۔ دادی نے سدھا کی طرف دیکھا۔

''اس کے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی، نا؟''

''نہیں''

''لہنگا اڑنے کی آواز سے میں سمجھ لیتی ہوں کہ وہ ریشم کا بنا ہے۔''

''بچی ہے نا، دادی جی''

''لیکن اپنی عمر سے زیادہ امنگ ہے اس میں، میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔''

''کیا اب میں جاؤں؟''

دادی بھی اٹھ گئی۔

اس نے اپنی ماں کی بات یاد کر کے بٹوہ کھولا۔ دادی بولیں۔ ''نہیں، تو مجھے کچھ پیسے دیئے جا رہی ہے؟ نہیں، دادی کو پیسوں کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ دنگ رہ گئی، اس نے بٹوہ بند کر دیا۔

''اب کی، اگلی بار آنے پر۔۔۔۔!'' ان کا گلا رندھ گیا۔

''میرے زندہ رہتے آ کر ملنا، بس''

اس نے دادی کی بینائی سے محروم آنکھوں کو بھیگتے دیکھا۔ اس کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے دادی کے پیر چھو کر سر جھکایا۔ پانچ سال پہلے بھی ایسا کیا تھا۔ اس کو وہ بات یاد آ گئی۔

دادی نے اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔

''تمھارا بھلا ہو، یہ رشتہ نبھ جائے گا۔''

وہ چل دی، بازار پہنچی تو ایس ٹی ڈی بوتھ کا بورڈ دور سے دیکھا۔ دونوں فون نمبر اس نے یاد کر لئے تھے۔ فون کرنے سے پہلے موبائل نمبر کو ڈائری میں دیکھ کر پکا کرنا ہے۔ فون کرنے کے فوراً بعد گھر پہنچے گی تو مرغی کے اپنے پریوار کے ساتھ آنگن میں گھومنے کا منظر اسے دیکھنے کو ملے گا۔

اس نے اپنے پیروں کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

ایم۔ٹی۔واسودیون نائر

۱۵ جولائی ۱۹۳۴ میں کوڈالور ضلع پالکڑ (کیرالا) میں جنمے گیان پیٹھ انعام یافتہ نائر ملیالم کے معروف اور شہرت یافتہ افسانہ نگار ہیں۔ افسانوں کے بیس مجموعے، دس ناول کے علاوہ تبصرے، مضامین، سفرنامے، ڈرامے، بچوں کا ادب وغیرہ کے مجموعے شائع ہوئے۔ ان کی اہم کتابوں میں ان کے ناول 'ناولیتو' (مشترکہ خاندان)، کالم، رنگ بجوشنم، خاص ہیں۔ انھوں نے ایک درجن سے زیادہ فلمی فیچر لکھے اور دو فلموں کا ڈائرکشن کیا۔ ان کی فلموں کو نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔ شری نائر گیان پیٹھ کے علاوہ کیرل ساہتیہ اکیڈمی اور ساہتیہ اکیڈمی دہلی ایوارڈ سے نوازے گئے ہیں۔

منی پوری کہانی

کائنا سے راس

ای سونا منی سنگھ

بسنت پورنیما کا دن ہے اپے تومبی کی زمانے سے خواہش تھی کا ئنا میں جا کر راس رچانا ۔بسنت کا مہینہ ہے۔ بسنت راس ہے۔عبیر کھیلا۔عبیر میں ڈوبا ہے کا ئنا کا منڈپ، دور پہاڑ پر آم، کٹھل، چمپا، ہیر انگوئی کا باغیچہ ۔ اور وہی راس۔ مردنگ کی تال پر پرکشش انداز میں رقص کرتی انگلیاں جیسے سب کچھ کسی تصویر کی طرح اپے تومبی کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

گذشتہ مہینے ہی تو خواب میں شری گو بند کا درشن کیا تھا۔ پیلے کپڑے پہنے مور پنکھی مکٹ ہاتھ میں بنسی لئے تھے گھنگھروکی چھن چھن کی آواز آہستہ آہستہ چلتی اس کی گونج جیسے کوئی دیکھ سن نہ لے ،سب کی نظریں بچا کر لمبے قدم بھرتے ہوئے ایڑی کو اٹھا کر پنجوں کے بل اچکتے ہوئے اس کے کمرے میں چلے آئے تھے ۔شری گو بند سنہرے آسن پر بیٹھے ہیں۔ کائنات کو موہتے اسی خوبصورت انداز کے ساتھ دنیا کو رجھاتی مرلی کی تان جیسے چھیڑتے ۔بنسی کی تان سن کر جی بے قراری سے دل بھر اس دلکش مورتی کا درشن کیا تھا۔

بنسی کی میٹھی تان جیسے دھیرے دھیرے کہہ رہی ہو۔'' ہے جان سے پیاری اور کتنا انتظار کراؤ گی۔تمھارے خوبصورت عضو کی حرکتیں دل کو چنچل کر دینے والی میٹھی آواز سنے زمانہ گزر گیا ہے۔ کب آؤ گی تم؟ چاندنی رات کا ئنا کے پہاڑ پر تمھارا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ دیکھو تھکان بھرے پاؤں لگاتار دوڑتے رہنے سے کانٹوں کے جال سے جیسے بچھ گئے ہیں۔ دنیا میں آتے ہی کیا مجھے بھول گئی یا اپنا وعدہ بھول گئی؟''

'' دیکھو پر یے! تمھیں نہارنے کی خواہش سے نظر سیدھی نہیں پڑتی، تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے پسینے سے شرابور ہو گیا ہوں۔تمھیں آواز دیتے دیتے گلا سوکھ گیا ہے۔مگر تم کیسے بے فکر ہو گئی؟''

ہنسی کی ہرتال کے ساتھ جیسے سب کچھ صاف ہوگیا۔ دیکھا چرن پسینے سے بھیگے ہوئے، انگلیاں دھول سے سنی ہوئیں تھیں کانٹے سے چھلنی ہوئے پیروں کو دیکھ کر دل بے چین ہو اٹھا۔ ٹھنڈے پانی سے پاؤں دھوئیں......

رحم طلب نظروں سے چرنوں کے پاس بیٹھے، کمل کی طرح کومل منھ کو اپنے بالوں سے ڈھکتے ہوئے بے پناہ خوہشوں کے ساتھ جھر جھر آنکھوں سے آنسو بہاتی اپنے پربھو سے محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ ''پران ناتھ تمھارے پیروں کی دھول کا انتظار تھا۔''

''بیٹے دکھی نہ ہو، آنے والی بسنت پورنیما کے دن تمھارا انتظار کروں گا۔''

ایبے تومبی نیند سے جاگی۔ اسی وقت شری گوبند جی کی منگل آرتی کی آواز گونگ گونگ گونجتی ہوئی سنائی دی۔

سرور آمیز خوشبو سے اس کا کمرہ مہک اٹھا، نہ جانے کیسی مہک تھی۔ چندن سے گھلی ملی، جاتی پشپ (پھول کا نام) کمل، سنگ برے، تکھلے، چگونگ لے کی مہک کے بیچ گھی کی بتی دھوپ بتی کی ملی جلی مہک سے اس کا کمرہ مہک گیا۔ ایبے تومبی کو کسی غیبی طاقت نے موہ لیا۔ مشین کی طرح اس کے قدم بڑھنے لگے۔ دروازہ کھلتے ہی خوشبو چاروں طرف دور تک پھیل گئی۔ کان میں گھنگھرو کی آوازیں چھن چھن کرتی سنائی دی۔ آواز دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسی آواز کی طرف راغب ہوکر خود بخود اسی طرف قدم بڑھانے لگی۔ ایک کے بعد ایک جگہ کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھتی گئی۔ کونگ با، ایرنگ بونگ سے ہوتی ہوئی تھون گرانڈ بی سڑک لمسا تگ اور کیراؤ، کھن روپ سن روک، وائی تھو کے کنارے سے ہوتی ہوئی وائی تھو پہاڑ چڑھنے لگی۔ علی الصباح کوے کے بول اور پرندوں کی چہچہاہٹ دل کو لبھا لینے والی تھی۔ اسی وقت اس کے باپ کا دوست یونگ چاؤبا سن روک کی طرف آتے ہوئے دوست کی بیٹی کو بے تحاشا دوڑتے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

''بیٹی ایبے تومبی! ایبے تومبی ہو نا؟ جا کہاں رہی ہو تم؟ اس آواز کے ساتھ ہی گھنگھرو کی آواز یکا یک بند ہوگئی۔ پھل پھول سے مہکتی فضا بھی جیسے خوشبو سے عاری ہوگئی۔ اچانک جیسے خواب سے جاگی ہو۔ ہوش میں آتے ہی دیکھا۔ دن کافی چڑھ چکا تھا۔ دھوپ چڑھتے ہی جیسے برے خواب دیکھنے کے بعد جاگنے پر بھی اس کا اثر رہ جاتا ہے۔ پورا جسم تھک کر چور ہوگیا تھا۔ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔ تھوڑی دیر اسی انداز میں بیٹھے رہنے پر اپنے باپ کے دوست یونگ چاؤبا کو کھڑے پایا۔

''ماما! میں کہاں پہنچ گئی ہوں؟''

''بی تمھیں کیا ہو گیا۔ کہتے ہوئے پونک اسے امپھال کی طرف لے چلا۔

ادھر گھر میں، کہاں گئی ایبے تومبی، کدھر گئی؟ بھاگ گئی؟ کس کے ساتھ؟ کون ہے کیسا ہے؟ سبھی سے یہی سوال پوچھے جارہے تھے۔ سوچ رہے تھے تھانے میں رپورٹ لکھوائیں۔ جان پہچان والوں سے پوچھے جارہے تھے۔ اتنی دیر ہونے پر بھی بیٹی کی کوئی خبر نہ ملنے سے ماں باپ غمزدہ تھے۔ سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ اندیشوں سے بھرے شوروغل کے بیچ پونک چوبا کے ساتھ ایبک تومبی پہنچی۔ پورا واقعہ سنایا گیا۔ ایبے تومبی خود کو نہ روک پائی، صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔

''ای ما، میں کا ئنا میں جگوئی راس بسنت راس'' '' کا ئنا میں راس بسنت راس'' یہی رٹ لگائے رہتی ایبے تومبی۔ لوگوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ ایبے تومبی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی اکیلے ہی بڑبڑاتی: ''پر بھواب دیر نہ ہوگی، وقت آ گیا ہے۔'' اکلوتی بیٹی شکل صورت سے اچھی بھلی، تعلیم یافتہ، والدین کی امیدوں کا مرکز۔ ایبے تومبی کی دماغی حالت کیا سچ مچ ٹھیک نہیں۔ ماں باپ بے چین ہوا ٹھے۔ پنڈت، ڈاکٹر، ماہر نفسیات کے پاس لے جایا گیا۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا، گھر کی پوجا، جھاڑ پھونک نہ جانے کیا کیا دوڑ دھوپ کی گئی، لیکن ایبے تومبی میں کوئی غیر معمولی تشخیص نظر نہیں آئی۔ کسی بھی بیماری کا پتہ نہیں چل سکا۔ وہ بھی ٹھیک ڈھنگ سے کام کاج کرتی۔ پڑھائی کرتی۔ پہلے کی طرح ہی روزمرہ کے کام کرتی مگر ایک رٹ اس نے نہیں چھوڑی تو یہی۔ '' کا ئنا میں راس، بسنت میں راس۔''

اپنی بیٹی کی خواہش پوری کرنے کے لئے ماں باپ نے دوستوں کے مشورے سے راس رچوانے کا منصوبہ بنایا۔ بسنت راس استاد کی شکل میں اوجھا ایبوپسک فن کے لئے مشہور تھورانی، گم بھینی، بھانو، میما کو گوپیوں کے روپ میں بلایا گیا۔ سوتر گائیکا تومبی، اموبی، مادھوی، بانسری بجانے والے تومبا اس راج ساز بجانے والے بھی تھے۔ وجے کا بیٹا کرشن بنا، تومبی کی بیٹی شری متی رادھا، پیچھے پنکھا جھلنے کے لئے چندراولی بھی آ گئی۔ ایبے تو تومبی کا چہرہ کھل اٹھا، ماں باپ بھی مطمئن تھے۔

آج پورنیا کا دن ہے۔ منہ اندھیرے گاڑی پر چل دئے کا ئنا کی طرف۔

بائی ری پوک، گاں ری یانگ کا رستہ پار کرتے ہوئے تومبی خوش تھی۔ ماں باپ بھی خوش تھے۔ بسنت کے موسم میں داوانی (جنگل کی آگ) سے راکھ ہوئی گاں ری یانگ پہاڑی پھر

سے ہری بھری ہو اٹھی۔ دلکش قدرتی مناظر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ جنگل میں پرندوں کی چہچہاہٹ، ہری کی ننگ ننگ کے ساتھ سائیں سائیں چلنے والی ٹھنڈی ہوا جیسے بسنت کے آنے کا پیغام دے رہی ہو۔ من بے چین ہو اٹھا۔ جیسے کوئی خواب تعبیر پا رہا ہو۔ ایبے تومی غور و فکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جان سے پیارے سے ملن۔ صدیوں کی جدائی کا خاتمہ۔

چلتے چلتے انگتھا، کھونگ ناتگ کھونگ سے ہوتے ہوئے منزل تک منی پور گوبند جی کی جائے پیدائش پر پہنچے۔ شری شری منی پور، گوبند کی ہمیشہ سے چلی آرہی دیو بھومی پر، ہیرانگ گوئی، آم، کٹھل، چمپا وغیرہ کے باغیچے تھے۔ شری شری منی پور گوبند، کا کنا کا مندر دیکھتے ہی من موہ لینے والا منظر، اس دیو بھومی میں مندر باغیچے کے اتر میں واقع ہے۔ لگاتار بہنے والا ایک چشمہ ہے۔ یہاں رفع حاجت ممنوع ہے۔ لوگوں کا ایسا یقین ہے۔ تھوبال سے ایک عورت جو رقص دیکھنے آئی تھی وہ مذہبی اصول کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اور بعد میں اس کی موت ہوگئی تھی۔

حیثیت کے مطابق ایک بھوج کا انتظام کیا گیا۔ پھل پھول چاول تیل تلسی پتے اور پانچ رنگوں کے پھولوں کا ہار بنا کر پربھو کو چڑھایا گیا۔ ایبے تومی بے قرار ہو اٹھی۔ بنسی کی دھن، گھنگھروں کی آواز کیا سن لیا اس نے۔ راس منڈل تیار ہے۔ رات کا پہلا پہر، چاندنی سے جگمگاتا ہوا باغیچے کے راس منڈل میں شروع ہوا۔ بسنت راس شروعات کے بعد راس کا ایک حصہ پورا ہوا۔ اس کے بعد شروع ہوا عبیر کھیل۔ عبیر کی لے میں راس منڈل ڈوب گیا۔ پربھو کے من کو عبیر سے شرابور دیکھا ایبے تومی نے...... دل بے قرار ہو اٹھا۔ شری متی کے مان ابھیمان کے ختم ہونے کے بعد گوپیوں کا بھجن شروع ہوا۔ اس خصوصی مقام پر رقص کرنے کی خواہش پوری ہوئی ایبے تومی کی۔ خوشی دل سے رقص کا ایک ایک حصہ کھچینگ، لیبی، بھنگی پرینگ، کھرُنبا، پرینگ کے ساتھ پیشانی کو جھکاتے ہوئے پربھو کے قدموں میں سلام کیا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو زمین میں گڑا کر جیسے من چاہی مراد پالی ہو یا اپنی پران ناتھ کا درشن کرلیا ہو، بنسی کی میٹھی آواز جیسے بول اٹھی۔ ''پریے، تم آ گئی!''

یہ سن کر روم روم پھڑک اٹھا۔ چرنوں میں پرنام کیا۔ اسی وقت حیرت زدہ کر دینے والی پھل پھول دھوپ بتی چندن ذاتی پشپ، چمبا کمل، تکھیلے، چکونگ لے، سنگ برے وغیرہ کی خوشبو سے راس منڈل بھر گیا۔ حیرت زدہ سبھی لوگوں کا سوال تھا۔ ''یہ کیا؟ یہ کیا؟'' زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ بھول گئی۔ ایبے تومی استاد کا سکھایا ہوا شلوک۔ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ ''کبھی نہ ختم ہونے والی

خواہشات کی اس دنیا میں تمھارے قدموں کی پناہ ہی امید کی آخری حد ہے۔ ہے ناتھ پران پریئے
۔''

چھن چھن گھنگھروؤں کی آواز سے بھر گیا راس منڈل۔ دور سے آتی بنسی کی میٹھی آواز نے سب کا دل موہ لیا۔ منھ سے نکلنے والا خون کا فوارہ منڈپ میں بکھرے لال عبیر سے جاملا۔ اچانک بن بادل بجلی چمکی، چاروں طرف تیز ہوا کی لہر اٹھی۔ دیکھ رہے تھے سب ساکت ہوکر۔ گوبند جی کے مندر کا دروازہ اچانک ہی کھل گیا۔ ایبے تو مبی پھر نہیں اٹھی۔ اس کا مردہ جسم خاموش پڑا رہا۔ لگاتار دور ہوتی گئی گھنگھرو کی چھن چھن کی آواز، تھم گیا بنسی کا سر، ماں بین کرتی رہی۔'' اوہ! بیٹی کی خواہش پوری ہوئی۔'' اسی وقت منگل آرتی کی گھنٹی گونج اٹھی ''گونگ گونگ۔''

☆☆☆

ای سونا منی سنگھ کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں امپھال میں ہوئی۔ مما نگ تھونگ لوللبدی میگ تھونگ دا نام کا کہانیوں کا مجموعہ۔ ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔

میتھلی کہانی

مسجد

سوشیل

گاؤں کے لوگ باری باری سے پرسوں سے ہی مقبول کو دیکھنے آرہے ہیں۔ آخر گاؤں کا مشہور پہلوان جو رہا ہے۔ قرب وجوار میں اس کی شہرت ہے، عزت ہے۔

پرسوں عید کی نماز پڑھنے کے لئے مقبول لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلا تھا، ایک دم صبح سویرے ہی وہ چپ چاپ چل پڑا تھا۔ صبح میں اس لئے کہ اس کی عمر اور جسم کی حالت دیکھتے ہوئے گھر خاندان کے لوگوں نے سمجھایا تھا، روکا تھا۔ اس کی ضد پر خاندان والے بھی اڑ گئے تھے۔ وہ اس وقت تو مان گیا تھا مگر کب تک مانتا؟ اسے گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا۔ دماغ پر دل کا حاوی ہونے لگا۔ گھر خاندان کے لوگوں کی پابندیوں کے باجود خداوند کی عبادت کی للک اس کے اندر جاگ اٹھی۔ اس لئے تھوڑا اندھیرا رہتے ہی وہ چل پڑا تھا۔

دراصل پرسوں اس کے دل کا باندھ ٹوٹ گیا تھا۔ لوگوں کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے کی خواہش کو وہ دبا نہ سکا۔ چل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ چاندی منڈھی ہوئی مٹھ اور گرہوں والی لاٹھی۔ اسے اپنی لاٹھی پر یقین تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی کھلونے کی طرح خوبصورت لگتی تھی۔ اس وقت اسے ایک بچے سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھانے لگا۔ خاندان والے یا کوئی خیر خواہ اسے جاتے دیکھتا تو ضرور ٹوک دیتا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی لاٹھی اسے بھاری لگنے لگی تھی۔ اسے اپنے قدم بھاری لگے تھے، پھر بھی وہ جھٹک کر قدم بڑھانے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ بہت دنوں کے بعد چل رہا ہے۔ اس لئے قدم مشکل سے پڑ رہے ہیں۔ چلنے کی عادت چھوٹنے سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس نے سمجھا سویرے کا دھندلکا ہوگا۔ اب اسے لگا کہ اندھیرے کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ کئی برسوں کی تیل پلائی کالی سی لاٹھی بھی نہیں سنبھلی۔ مقبول چکرا کر گر پڑا۔

خود اس طرف گرا، لاٹھی اس طرف۔لوگ دوڑ پڑے۔ اسے اٹھا کر لے آئے۔

حال چال پوچھنے والوں کا تانتا لگا رہا۔ گاؤں اور آس پاس جس نے بھی سنا، اسے دیکھنے دوڑ پڑا۔ لوگ آتے ہیں، تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔ اپنا پن جتلاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مقبول آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شاید اپنے ضمیر کی لعنت کی وجہ سے آنے والوں کی آوازیں پہچان کر آنکھیں کھول لیتا ہے۔ ان آنے والوں میں دیوکانت بھی ہے مقبول کا پکا شاگرد اور مجید کا لنگوٹیا یار۔ دیوکانت یعنی دیو اور کئی لوگوں کے لئے دیون۔ کیسے نہیں آئے گا! سنا اور سیدھے اکھاڑے سے ویسے ہی دوڑ پڑا۔ کچھا پہنے اور بدن میں مٹی میں لگی۔

وہ پرسوں سے ہی آ رہا ہے۔ استاد کے بغل میں بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ بولتا نہیں۔ وہ لوگوں کی بات پی جاتا۔ بڑ بڑ بولنا اسے اچھا نہیں لگتا۔

آج تیسرا دن ہے۔ مقبول اب تھوڑا ٹھیک ہونے لگا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے میں اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔ لوگوں کا آنا جانا بھی اب کم ہو گیا ہے۔

آج مجید بھڑک جاتا ہے۔ اس کا دبا ہوا صبر غبار بن پھٹ پڑا۔ ''آج ہم کہاں کے رہتے؟ مرنے میں کیا کسر رہ گئی تھی؟ ہم کس کس کا منھ روکیں گے؟ لوگ کہیں گے کہ بڈھا تو بوجھ ہے۔ اور کہیں گے۔ مر جاتے تو بلکہ اچھا ہوتے خاندان کے لئے، مجید کی آنکھ میں پانی کا ایک باریک پرت بچھ جاتی ہے۔

دیوکانت اسے خاموش کرتا ہے۔ ''چلو تھوڑا بہت گھوم آتے ہیں۔ اول فول سوچ کر اپنا جی خراب مت کرو۔''

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے مقبول کا ناپا تلا، صبر آمیز سنجیدہ لہجہ دونوں کی توجہ کھینچ لیتا ہے۔ ''کرشنا کے چلے جانے کے بعد ارجن سے گانڈیو نہیں سنبھلا تھا۔'' لاٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری لاٹھی زندگی بھر کا سہارا، اس وقت نہیں سنبھلی تھی۔ جیسے کرشن کے بغیر ارجن، ویسے ہی بغیر طاقت کے میرا جسم۔۔۔ اچھا ہوتا اگر عید کے دن مر جاتا۔ دل صاف ہے تو سب جگہ مسجد ہے۔''

دیوکانت ٹکر ٹکر اپنے استاد کا منھ تک رہا تھا۔ مجید کی نظر مقبول سے ہٹ کر دیوکانت پر اٹک جاتی ہے۔ دیوکانت نے مجید سے پوچھا۔ ''کوئی کام تو نہیں ابھی؟ نہیں ہے تو چلو تھوڑا اکھاڑے تک گھوم آتے ہیں۔''

آگے آگے دیوکانت اور پیچھے پیچھے مجید جا رہا ہے۔ گاؤں کا راستہ نہ پکڑ کر وہ دونوں پگڈنڈیوں سے جا رہے ہیں۔ شاید کسی تیسرے شخص سے ملنے کے خدشے سے بچنے کے لئے۔ دونوں چپ چاپ بڑھ رہے ہیں۔ دونوں کے دلوں میں طوفان ہے الگ الگ قسم کا۔ مجید کے دل میں بہت دنوں سے ایک بات بار بار اٹھ رہی ہے۔ بات دل میں اٹھتی ہے دب جاتی ہے۔ دراصل بات دبا لینی پڑتی ہے۔ سوچا ہوا سوچا ہی سوچا ہی رہ جاتا ہے۔ باہر نہیں آپاتا۔ اس بابت تصور کرنا بھی اسے بہت برا لگتا ہے۔

یہ ہندو اکثریت گاؤں ہے۔ گاؤں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو پوچھ سکتے ہیں۔ گاؤں مہاراج اور بائے آئے بکھوں (بکھوں ایک گھومنتو برادری ہے)

وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ گاؤں میں کوئی بکھیڑا نہیں کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اس بارے میں نہ سوچنے کی ٹھان لی ہے۔ وہ کسی سے اس بارے میں ذکر بھی نہیں کرے گا۔ دیوکانت سے بھی نہیں کرے گا۔ ایک بار اس سے گھما پھرا کر ذکر کیا تھا۔ دیوکانت اس وقت چپ ہو گیا تھا۔ سمجھ سوچ کر ہی تو چپ ہے۔

مجید ایک انسان ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی کاموں کی طرف جھک رہا ہے۔ روایتی ماحول سے وہ الگ نہیں رہ سکتا۔ رہ رہ کر نعت یاد آتی ہے۔ دربار میں پاک صاف حاضر ہونے کی خواہش بڑھ رہی ہے۔ سنت اور صوفی کے کلمات سننے کی تمنا جاگ رہی ہے۔ میلاد میں شامل ہونے کا دل کرتا ہے۔ روایت کے مطابق اس کی روحانیت مسجد میں نماز پڑھے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ وہاں زیادہ سکون ملتا ہے۔

مجید خود اپنے بھائیوں کے حالات سمجھتا ہے۔ ایک فرماں بردار بھائی کی جو خصوصیت ہوتی ہے وہ بھی اس میں موجود ہے۔

ٹھٹھری ٹھنڈ میں، بارش کی تیز بوچھاروں میں اور بیساکھ جیٹھ کی ابال دینے والی دھوپ میں ان لوگوں کو تین اور تین کل چھ کوس دھول مٹی بھری پگڈنڈیوں کھیتوں کو پار کر لگ بھگ رینگتے ہوئے ناپنا پڑتا ہے۔ عادت پڑ جانا اور عمر میں کوئی تال میل نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔

مقبول کا یہی حال ہے۔ منجھلا بھائی منظور بوڑھا ہو چلا ہے۔ وہ خود پچاس پار کر چکا ہے۔ گاؤں میں پہرہ دینے میں کاہلی برت دیتا ہے۔ کوئی کوئی ہنسی مذاق میں کہہ دیتا ہے۔ ''مجید! اب تو رات کو تمھاری آواز کی بلندی بند ہو گئی۔ چوکیدار ہو گاؤں کے، سرکار تمھیں پیسہ دیتی ہے۔ ارے

بھائی، سرکاری پیسہ بھی غریب کا ہی پیسہ ہوتا ہے۔''

مذاق کی چاشنی میں لپٹے ایسی بے عزتی کو بھی مجید مسکرا کر پی لیتا ہے۔ کیا جواب دے گا وہ؟۔ زیادہ تر لوگ یہ جان گئے ہیں کہ اس کے جسم میں بیماریوں کا گھن لگ گیا ہے۔ مگر کون کس کا دکھ بانٹ لیتا ہے؟ ایسے مذاق اور طنز کو ہنس کر ٹال جانا اب اس کی عادت ہوگئی ہے۔ وہ جانتا ہے سماجی بننے کے لئے، سماج کا ہو کر رہنے کے لئے بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ مل جل کر رہنا پڑتا ہے۔

اس کے بعد مجید کچھ دن پہرہ دیتا ہے پھر کچھ دن کاہلی کر لیتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ گاؤں اپنا ہے اس لئے یہ سب نبھ بھی جاتا ہے۔ گاؤں والوں سے ایسا ڈر نہیں رہتا۔ آخر پیار بھی تو کم نہیں ملا اسے گاؤں والوں سے۔ وہ سوچتا ہے۔

ابھی ہوا الٹی بہہ رہی ہے۔ رام مندر کا موضوع ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا ہے۔ گجرات جل رہا ہے۔ دہشت گرد ملک کو توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کرسی ہتھیانے کے لئے نیتا لوگ تکڑم میں لگے ہیں۔ آدمی کو آدمی سے لڑا رہے ہیں۔ لوگوں کو کچھ سوجھ نہیں رہا ہے۔

......نہیں، وہ اپنے گھر میں، اپنے لوگوں کے درمیان پردیسی ہو کر نہیں رہے گا۔ ایک چھوٹی چٹائی بچھا کر نماز پڑھ لے گا۔ اللہ تعالیٰ کا گھر تو صاف دل ہوتا ہے۔ یہ گاؤں اس کا اپنا ہے۔ گاؤں ہے تو وہ ہے، خاندان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف تو انسان ہی کرتا ہے۔ آخر تو وہ اشرف المخلوقات ہے۔

آج بھی لوگ اس کے ابا لیاقت علی کو نہیں بھولے ہیں۔ برٹش عمل داری کا چوکیدار لیاقت علی اس گاؤں کا چوکیدار منتخب ہوا تھا۔ گاؤں اس کے دل میں رچ بس گیا تھا۔ وہ یہاں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ تھا سرکاری ملازم۔ پیسہ ملتا تھا سرکار کی طرف سے اور کام کرتا تھا گاؤں کا۔ اپنی بساط بھر گاؤں کی عزت بچاتا رہا۔ تھانے کو اگر کسی دوسرے ذرائع سے پتہ لگ بھی جائے تو لیاقت جھوٹ بول جاتا۔ گاؤں اس کا تھا۔ گاؤں کی آبرو اس کی اپنی آبرو تھی۔ اسے وہ کیسے ننگا ہونے دیتا......

دیوکانت بھی خاموش اور سنجیدہ تھا۔ ضرور کسی بات نے اسے الجھا رکھا ہے۔ کیا سوچ سکتا ہے وہ؟ گرومہاراج کی بات؟ مسجد اور نماز کی بات؟ اٹھا تو وہ گرومہاراج کی بات سن کر ہی ہے۔ تب اور کیا ہو سکتا ہے؟

آج اسے مسجد کی یاد آئی۔ مجید نے گھما پھرا کر کہا تھا۔ اس وقت اکھاڑے پر اور بھی لوگ تھے۔ اس وقت دیوکانت بھی مجید کی بات کی سنجیدگی کو سمجھ نہ سکا تھا۔ ایسی بات کی اہمیت اس وقت

نہیں ہوتی۔ آج سمجھ رہا ہے اس بات کی اہمیت......

اکھاڑہ اب قریب آ گیا ہے۔ دیوکانت رک جاتا ہے اور مجید سے کہتا ہے۔ ''تم صرف سنتے رہنا، ٹھیک ہے نا؟'' چاند اور سورج ادھر ادھر ہو سکتے ہیں مگر دیوکانت کے لئے جو یقین مجید کے اندر تھا وہ ڈگمگا نہیں سکتا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ ''ہاں ہاں ٹھیک ہے، جہاں تم ہو وہاں بے ٹھیک کیا ہوگا۔!''

گرومہاراج کے بارے میں سب کو معلوم ہی ہے، یہ حادثے کی شروعات ہے ویسے حادثہ کہہ کر نہیں آتا مگر اتنا سمجھو کہ اگر گاؤں میں مسجد ہوتی تو گرومہاراج کے ساتھ ایسا حادثہ پیش نہیں آتا۔ مجید نے یہ بات پہلے ہم لوگوں کے سامنے بے حد جھجھکتے ہوئے کہی تھی۔ ہم لوگوں نے اس کی بات تب یوں ہی اڑا دی تھی۔''

دیوکانت یہ ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ جاتا ہے۔

سب چپ ہیں۔ دیوکانت نے پوچھا۔ ''کیا مسجد بنے گی گاؤں میں؟''

''ہاں! ہاں کیوں نہیں۔ آج ہی شروع ہو جانا چاہئے۔'' سبھی ایک ہی آواز میں بول پڑے۔

دیوکانت آگے بڑھ کر اکھاڑے پر سے ایک مٹھی مٹی اٹھا لیتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی سبھی پہلوان مٹی اٹھا لیتے ہیں۔ دیوکانت نے کہا۔ ''اگر کسی کے دل میں شبہ ہو یا اعتراض ہو تو اکھاڑے کا مٹی پھینک دیں۔''

سب کے چہرے پر چمک ہے۔ ایک فاتحانہ چمک کسی ثواب کے کام میں حصہ دار بننے کی چمک۔ دیوکانت کا عقیدہ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ مضبوط، ٹھوس، پائیدار۔

وہ دل کھول کر بولتا ہے۔ ''مجید وغیرہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ مسجد شروع کریں اور وہ بن جائے۔ اگر یہ سب چاہیں تو دوسری جگہ سے مدد مل جائے گی۔ ایسی کوشش شاید ہوئی بھی ہے۔ ویسے یہ سب ایسا نہیں چاہتے۔ ہم لوگوں کے لئے ذات کی بات ہوگی۔ یہ گاؤں کی عزت کا سوال ہے۔ درگا پوجا میں یہ لوگ چندہ دیتے ہیں اور ہم لیتے ہیں۔ مندر بنا تھا تو ان سب نے آپس میں اپنی حیثیت سے زیادہ پیسہ اکٹھا کر کے دیا تھا۔'' ''ہم بھی دیں گے۔'' آواز گونجی۔

دیوکانت نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''جب تک مسجد نہیں بن جاتی تب تک ہم لوگ ہوشیار رہیں گے، کیا منظور ہے؟''

''ہاں، ہاں، منظور۔'' سبھی جوش سے بھرے ہوئے تھے۔

بس بات ختم ہو جاتی ہے۔ دیوکانت اور مجید گاؤں کی طرف لوٹتے ہیں۔ دیوکانت

کہتا ہے۔ ''دھیان رکھنا، تم لوگوں کو کچھ نہیں بولنا ہے؟''

مجید چپ چاپ سن لیتا ہے۔

مسجد بننے کی بات گاؤں میں پھیل جاتی ہے۔ پنکھ لگا کر راتوں رات ہر گھر میں پہنچ جاتی ہے۔ صبح ہوتے ہی گاؤں کے باہر تک پھیل جاتی ہے۔ نئی بات ہے اس لئے سبھی سننا چاہتے ہیں۔ اس کے متعلق سبھوں کو تھوڑا بہت تجسس تھا اور جو زیادہ متجسس تھا جن کی چھوٹی بڑی باتوں کی اونچ نیچ اور باریکی جاننے کی عادت ہوتی ہے۔ ان کے پیٹ کا کھانا کیسے ہضم ہوگا۔ ایسے متجسس تو اپنی طاقت بھر فلیتہ لگانے میں لگے رہتے ہیں .... ''سنتے ہیں گاؤں میں مسجد بن رہی ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ ایک لیاقت علی سے محلّہ بس گیا۔ اس کے لوگ اب مسجد میں نماز پڑھیں گے، وہ بھی مائک لگا کر، اپنا گاؤں تو ترقی کر رہا ہے۔''

لوگ سن لیتے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے چکروں میں لگ جاتے ہیں۔ زیادہ کریدنے پر لوگ صاف بول دیتے ہیں۔ ''بنئے کے گلے میں گھینگا اور گاہک کے پیٹ میں درد۔ ارے مسجد بن ہی جاتی ہے تو ہرج ہی کیا ہے؟ جس کی حیثیت نہ ہو نہ دے۔ بیکار ناؤ پر سے دھول اڑا رہا ہے۔ ان لوگوں کو اتنی دور گاؤں سے باہر جانا پڑتا ہے، کیا دکھائی نہیں پڑتا؟ دیکھوں گاؤں کے پورب میں ہنوتی، اتر میں مہادیو اور پچھم میں رام مندر وہ کونہ تو خالی ہے۔ اب مسجد ہو جائے گی، بولو! چاروں طرف سے گاؤں محفوظ ہے نا۔ ارے بتاؤ! ہمارے کس کام میں وہ لوگ پیچھے ہٹے ہیں۔ اچھا تو یہ ہوگا، سارا خرچ ہم اٹھا لیں........''

عام آدمی بغیر لاگ لپیٹ کے بول دیتا ہے۔

کہیں کہیں گرما گرم بحث چھڑ جاتی ہے۔ بحث میں ملک امریکہ کشمیر گودھرا پاکستان اور لادین آ جاتے ہیں مگر لیاقت علی اور اس کے خاندان کا چرچا ہونے پر لوگوں کے منہ پر طمانچہ لگ جاتا ہے۔ رامائن، کیرتن، نواح اور اشٹ یام ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ سب پرساد کے لئے کھڑے رہتے ہیں۔ ہم لوگ خوشی خوشی دیتے ہیں۔ تعزیہ بنانے کے لئے حسن حسین کے نام پر بانس مفت دیتے ہیں۔ چندہ دیتے ہیں۔ تعزیہ دروازے دروازے گھومتا ہے۔ عورتیں دُلدُل کو پانی پلاتی ہیں، چاول دیتی ہیں، منتیں مانگتی ہیں۔ تعزیے کے پیچھے سبھی مذہب کے بچے گھومتے ہیں۔ پورے گاؤں میں جشن جیسا ماحول رہتا ہے۔ سبھی سوچتے ہیں، سب کو گاؤں سے مطلب ہے، گاؤں کے لوگوں سے سروکار ہے۔

مسجد کے لئے چندے میں ہر ایک کا حصہ طے ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ طے شدہ حصے

سے زیادہ دے دیتے ہیں۔لوگ مجید وغیرہ کو چندے کے لئے کہیں جانے نہیں دیتے۔

ایک مہینے کے اندر چھوٹی سی مسجد بن جاتی ہے۔شروع شروع میں جیسے ہوتا ہے شام کے وقت کچھ لوگ مسجد کے آنگن میں اکٹھے ہوتے ہیں۔دیوکانت اکثر آتا رہتا ہے۔ایک دن ایک اخبار نویس کیمرہ لٹکائے آجاتا ہے۔وہ دیوکانت کی تلاش کرتا ہے اور پوچھتا ہے۔''آپ کو ایسی تحریک کہاں سے ملی؟''

دیوکانت نے ہنس کر کہا۔''ہم لوگ ایک جگہ رہتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ دیتے ہیں۔بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔''

اخبار نویس نے پھر پوچھا''اپنی طرف سے کچھ نہیں بولیں گے؟''

''کیا کہوں کہ نیتا لوگوں سے کہتے کہ ایودھیا کے رام مندر کے سمسیا کا سادھان وہاں کے لوگوں پر چھوڑ دیں۔مگر چھوڑیں گے نہیں یہ جان لیجئے۔'' آخری بات کہتے ہوئے دیوکانت مسکرا اٹھتا ہے۔کچھ تصویریں لی جاتی ہیں۔اخبار نویس مقبول، مجید اور گاؤں کے لوگوں سے کچھ کچھ پوچھتا ہے۔

اخبار نویس جانے کے موٹر سائیکل پر بیٹھتا ہے تو دیوکانت کہتا ہے۔''اخبار میں چھپ جائے گا۔ایسے تو کتنی مثالیں ہوگی دیش میں،اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

اخبار نویس کا مسکراتا ہوا چہرہ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر لیتا ہے

☆☆☆

نیپالی کہانی

اندھیرا ہو جائے

سمیرن چھیتری 'پریہ درشی'

کسی کسی کو اندھیرا پسند ہے، سوچتے ہیں یہ دنیا اور پوری کائنات ایک ہی بار اندھیرے میں ڈوب جائے ...... ہم سب اسی میں تحلیل ہو جائیں۔ شام ڈھل چکنے کے بعد بھی مگرنی بوڑھی نے دیا نہیں جلایا تھا۔

بغل کے کمرے پاتلی کانچھی تین چار بار دیکھنے گئی۔ بوڑھی کا ہر وقت دھیان رکھنا پاتلی کے لئے ممکن نہیں ہے پھر بھی دلدار پاتلی پڑوسی کے ناطے بوڑھی کا بہت خیال رکھتی ہے۔ پکا کر بھی دیتی ہے۔ گرم ٹھنڈا، اگر اس کے پاس ہوتا تو، نہیں ہو تو کیا دے گی۔ شام ہوتے ہی پاتلی بہت پریشان ہو جاتی۔ ٹھولے بھات مانگتا ہے۔ سانی نیند سے رونے لگتی ہے اور بچوں کا باپ ندی سے آتا نہیں ہے۔ ایک طرف بچوں کے گندے چیتھڑے سوکھتے ہی نہیں ہیں۔ سوکھیں گے بھی کیسے۔ چار دن سے لگاتار بارش جو ہو رہی ہے۔ ساری دنیا میں برسنے والا پانی، اس بار کہیں نہ برس کر اسی منگن برس رہا ہے۔

پاتلی پھر سانی کو بغل میں لے کر بوڑھی کو دیکھنے گئی۔ بوڑھی کا گھر اندھیرے میں ڈوبا دیکھ کر پاتلی نے کہا۔ ''بجیو، دیا کیوں نہیں جلاتی ہو؟''

''کیا کہوں کانچھی تیل نہیں ہے میرے دیئے میں، اب تو مجھے اندھیرا ہی اچھا لگتا ہے۔ زندگی کے اندھیرے کو دیئے کی روشنی کیا کم کر سکتی ہے...... میں سو رہی ہوں، تم میری فکر نہ کرو......''

پاتلی نے دونوں بچوں کو کھلا پلا کر سلا دیا۔ بھات بھی پک چکا ہے۔ باپ مچھلی لے کر آئے گا تو بھون کر شوربہ لگا دوں گی لیکن جانے کیوں اس کے آنے میں دیر ہو رہی ہے۔ ندی اچھال میں ہے۔ کہیں اس پار اٹک تو نہیں گیا؟

رینو بھابھی بھی پاتلی کو دیکھنے آ گئی۔ آج وہ تین بار آ چکی ہے۔ اس کا شوہر پرسوں ہی کلی

گوڑی گیا تھا لوٹا ہی نہیں ہے۔ بانجھ بیوی کو شوہر کی محبت زیادہ ہی ستاتی ہے۔ اب کچھ لوگ کہتے ہیں۔ لیکن سب جھوٹ ہے۔ پاتلی کے بچے ہیں۔ شوہر کے تئیں اس کی محبت کیا کم ہوگئی ہے؟ بچے ہونے کے بعد تو میاں بیوی کے بیچ محبت اور بڑھ جاتی ہے۔ بچے ہوں یا نہ ہوں اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا جس کا دل پیار سے بھرا ہوا ہے وہ سب سے محبت کرتا ہے۔ چار بچوں کی ماں بھی دوسری شادی کرتی ہے۔ ایک بھی بچہ نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بھر رہتی ہیں عورتیں، پاتلی جانتی ہے۔ بچے نہ ہونے کی وجہ سے رینو بھابھی اپنے شوہر کو زیادہ پیار کرتی ہے، ایسی بات نہیں ہے۔

''جانتی ہو پاتلی، فین سونگ تو سب دھنس گیا ہے، کہتے ہیں ..... ادھر رانگ رانگ کا پل بھی ٹوٹ رہا ہے۔ بیچارہ بخار میں مبتلا تھا ادھر ہی راستے میں پھنس گیا ہوگا۔ جانتی ہو، یہ اتر سکم رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اوپر میول کے بیس تیس گھر دھنس کر ڈھے گئے ہیں۔'' رینو بھابھی پلنگ کی چادر ایک طرف سرکا کر بیٹھ گئی۔

''بھابھی ایسی بات ہے جو ہونی ہے وہ اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی کے فکر کرنے سے کیا ہوگا۔ فکر کر کے تم بھیا کو اٹھا کر گنٹوک ندی سے یہاں لا سکوگی؟ آدمی فکر کر کے تو کچھ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ کل جو ہونی ہے وہ ہو کر رہے گی ..... آدمی فکر کر کے پہلے ہی مر جاتا ہے۔''

''کیا کہوں پاتلی، اس من میں چنتا اپنے آپ گھس جاتی ہے چور کی طرح، یوں کیسے کیسے برے خیالات من میں گھر بناتے ہیں۔'' رینو بھابھی نے کہا۔

''بھابھی پڑوس کی بوڑھی بجیو کی حالت تو سوچیے ذرا گذشتہ سال اسی وقت کی بات ہے، بوڑھا اس کا جوان بیٹا تیستا میں جال ڈالنے گئے تھے آج تک واپس نہیں آئے ہیں۔ مرنے اور بچنے میں فرق کہاں رہ گیا ہے؟ تیستا جب جوش مارنے لگتی ہے تو بوڑھی کی امیدیں جاگنے لگتی ہیں کہیں پانی کا اچھال اس کے شوہر اور بیٹے کو اٹھا کر اس کے پاس نہ لا دے، پرسوں بوڑھی کو ندی لے جانے والی تھی، انھوں نے پکڑ کر نکالا۔ بوڑھی کیا کہہ رہی تھی جانتی ہو بے رحم تیستا اب تم میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکوگی، تازی مچھلی کھایا کرتی تھی اب کناروں پر پڑی سڑی مچھلی کھا کر جی رہی ہوں۔ میری جان لے کر تم خوش نہ ہونا تم نے میری اصل جان تو گذشتہ سال ہی لے لی ہے۔''

پاتلی کا شوہر ابھی تک نہیں آیا ہے۔ پاتلی کو گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ آدمی اوروں کو مصیبت کے وقت نصیحت دے سکتا ہے لیکن خود مصیبت میں پھنستے ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ بوڑھی

دوبارا ٹھ کر آئی اور پاتلی سے پوچھا'' کانچھا آیا؟''

بوڑھی جان گئی، اس وقت پاتلی کا لہجہ پھنسا ہوا تھا جب اس نے کہا۔'' کہاں ابھی تک نہیں آئے ہیں۔دس بج گیا ہوگا؟''

پاتلی نے باہر نکل کر اس پار دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔لیکن گھنگھور اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔باتھی سونڈ بارش نے نیچے چاندے، اس پار سنگ کلان، ہگ یانگ اور اس طرف تن سام ڈنگ، رانگ رانگ یعنی منکن کا سارا علاقہ ڈھک لیا ہے۔کہیں کہیں سے لوگوں کے چلانے کی آواز سنائی پڑتی ہے۔من چلی تیستا کے خوفناک گرجن میں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا ہے۔بڑے سے چپٹے پتھر پر چڑھ کے پاتلی نے دیکھا تو اسے لگا، دور کہیں سے اس کا شوہر اسے بلا رہا ہے۔وہ مجھے کیوں بلائے گا! پاتلی کو اپنے شوہر کی طاقت اور حوصلے پر پورا بھروسہ ہے اسے کچھ نہیں ہوگا۔

بھابھی پھر آئی، اس نے کہا'' اے پاتلی کانچھی! بچوں کو لے لو، ہمیں اب اس منکن سے بھاگنا چاہئے، ایسے زلزلے کا کوئی بھروسہ نہیں ہے! چار دن ہو گئے بارش کو، تمھارے شوہر بھی کہیں رک گئے ہوں گے۔بچوں کو لے کر تمھیں زندہ تو رہنا ہوگا، چلو! تمھارے ٹھولے کو میں سنبھال لوں گی۔''

ایک بار پھیکی ہنسی ہنس کر پاتلی نے کہا۔'' نہیں بھابھی میں نہیں جاؤں گی، اگر وہ آ کر ہمیں نہیں پائیں گے تو ان پر کیا بیتے گی، بھابھی مرنا ہی لکھا ہے۔تو کہیں بھی مریں گے۔''

پاتلی نہیں گئی۔سب لوگ رانگ رانگ چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے۔یکا یک پاتلی کو موت کا خوف آ گیا۔ابھی تک کانچھا نہیں آیا۔ندی میں مچھلی پکڑ کر پیٹ پالنے کا کام ٹھیک نہیں ہے اس لئے تو راستے پر پتھر توڑ کر یا مٹی ڈھو کر ہی کھانا بہت اچھا ہے۔میں تو نہیں بھاگوں گی۔مرنا ہی پڑے گا تو بچوں کو چھاتی سے لگا کر مروں گی۔آخر مر ہی چکے تو ہیں۔

پاتلی چولھے کے پاس بیٹھ کر چھاتی سینکنے لگی۔اکیلی ہوتی ہے تو عجیب عجیب سی باتیں اس کے دل میں آتی ہیں۔جسم میں طاقت ہونے کی وجہ سے منحوس باتیں اس کے دل میں گھر نہیں بنا پاتیں پرانی باتیں اور مذاق سے یاد آتے ہیں۔

اسے اچھی طرح یاد ہے، رینو بھابھی جب منکن آئی تھی۔بھیا کے ساتھ دار جلنگ کے سنگلا بازار سے تب وہ موٹی تھی۔اسی منکن کے بعد آنے سے وہ دبلی ہونے لگی۔یہاں کے آدمی

زہریلے ہیں۔ پانی بھی زہریلا ہے۔ یہاں لوگوں کا شوشن ہوتا ہے۔ پہلے رینو پاتلی کے ساتھ خوب مذاق کرتی تھی۔ پاتلی کی بیٹی سانی شکم میں نہیں آئی تھی جب ایک دن اسے آنگن کی دھوپ میں بے خبر سوئی ہوئی دیکھ کر کہیں سے آئی رینو نے اس کے سینے پر چٹکی کاٹ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔" ارے پاتلی کیوں اس طرح دھوپ میں سو رہی ہو؟ بدھنا مچھلی کھا کر تم جیسی نوجوان عورتیں ایسی سوتی ہیں تو بغیر مرد سے تعلق میں آئے حاملہ ہوسکتی ہیں۔ جانتی ہو اس دنیا کی ہوائیں زہریلی ہیں۔ جنت کے دیوتا خواب میں تمھارے اندر گھس سکتے ہیں!"

پاتلی نے شرم سے منہ چھپایا۔ رات کو پاتلی نے یہ بات اپنے شوہر سے کہی تو اسی رات سانی شکم میں آگئی۔ ان باتوں کو یاد کر کے پاتلی ہنس پڑی۔ اوپر سڑک پر بہت زور سے شور وغل ہونے لگے۔ ہاتھ میں ٹارچ لئے نوجوان منکن بازار سے لوگوں کو نکال کر محفوظ مقام پر بھیج رہے تھے ۔سب نکل رہے تھے رینو بھی نکل گئی۔ لیکن پاتلی اور بوڑھی نہیں نکلی۔

پاتلی چولھے کے پاس سوگئی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ نیند کیسے آگئی۔ وہ روک نہ سکی۔ آدمی اگر نیند کو روک سکتا تو شاید موت کو بھی روک سکتا تھا۔

پاتلی چونک کر اٹھ گئی۔ کانچھا تو بہت پہلے آ گیا ہے۔

"کب آئے؟" خوش ہوکر پاتلی نے پوچھا

"کیسی ہو؟ سور کی طرح سوتی ہو۔ میں ابھی آیا ہوں۔" کانچھا نے جواب دیا

"کیا کہوں، میرے تو ہوش اڑ گئے تھے؟"

"دھت پگلی، موت کا وقت مقرر ہے۔ میں بھی مر چکا تھا یہی سوچ کر کہ کہیں تم سب رینو بھابھی کے ساتھ ہی تو نہیں نکل پڑے۔ اگر نکلتے تو آج نہیں رہتے۔ ! تیر کر کسی طرح پانچ لوگوں کو بچا پایا ــــ رینو بھابھی کو نہیں بچا سکا ــــ بھنور میں پھنس گئی وہ، ندی سے دوپہر میں ہی نکا تھا میں۔ مگر گاؤں کے لوگوں کو ندی پار کرانے میں لگ گیا تو دیر ہوگئی۔ مولی کاٹ دی ہے۔ زیادہ تیل ڈال کر اچھی طرح پکانا"۔

باؤلوں کی طرح اپنی پیٹھ کھجاتا کانچھا نے پھر کہا۔"ندی میں مچھلیاں نہیں ہیں، ہمیں تو اب گریف میں راستہ کھودنے کا کام ڈھونڈنا ہوگا نہیں تو دارجلنگ کی طرف ہی جانا پڑے گا۔ بوجھا ڈھو کر ہی پیٹ پال لیں گے۔"

بھات کھانے کے بعد پاتلی اور کانچھا کھٹولے پر لیٹ گئے۔ پیڑ کی موٹی چھال سے

بنے دروازے میں انسان کی آنکھوں سے بڑا سوراخ ہونے کے بعد بھی ان میاں بیوی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ پاتلی نے نیند میں ایک ہاتھ کانچھا کی چھاتی پر رکھا۔ اس سے پہلے رضائی سے ڈھکے اندر کی دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ کئی دنیاؤں کی سیر کر چکے تھے۔

کانچھا پاتلی کو اپنی طرف کی رضائی اوڑھا کر اٹھا۔ چولھے میں آگ سلگاتے ہوئے وہ گنگنانے لگا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی دل و جان اپنے ہی وطن دارجلنگ کی آدے جنگ میں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

نیپالی کے کتھا کار، ناول نگار، ناٹک کار سمین جمیتری 'پریہ درشی' کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ پانچ کہانیوں کے مجموعے، دو ناول، ایک ناٹک شائع ہوئے ہیں۔

ہندی کہانی

دوسری دنیا

نرمل ورما

بہت پہلے میں ایک لڑکی کو جانتا تھا، وہ دن بھر پارک میں کھیلتی تھی اس پارک میں بہت سے پیڑ تھے جن میں میں بہت کم کو پہچانتا تھا میں سارا دن لائبریری میں رہتا تھا اور جب شام کو لوٹتا تھا تو وہ ان پیڑوں کے بیچ بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ بہت دنوں تک ہم ایک دوسرے سے نہیں بولے۔ میں لندن کے اس علاقے میں صرف کچھ دنوں کے لئے ٹھہرا تھا، ان دنوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتا رہتا تھا سستی جگہ کی تلاش میں۔

وہ کافی غریبی کے دن تھے۔

وہ لڑکی بھی کافی غریب رہی ہوگی یہ میں آج سوچتا ہوں وہ ایک آدھا اُدھڑا سوئیٹر پہنے رہتی، سر پر کتھئی رنگ کا ٹوپ جس کے دونوں طرف اس کے بال نکلے رہتے۔ کان ہمیشہ لال رہتے اور ناک کا اوپری سرا بھی کیونکہ وہ اکتوبر کے آخری دن تھے۔ سردیاں شروع ہونے سے پہلے کے دن اور یہ شروع کے دن کبھی کبھی اصلی سردیوں سے بھی زیادہ ظالم ہوتے تھے۔ سچ کہوں تو ٹھنڈ سے بچنے کے لئے ہی میں لائبریری آتا تھا۔ ان دنوں میرا کمرا برف ہو جاتا تھا، رات کو سونے سے پہلے میں اپنے سب سوئیٹر اور جرابے پہن لیتا تھا، رضائی پر اپنے کوٹ اور اوور کوٹ جمع کر لیتا تھا۔ لیکن ٹھنڈ پھر بھی نہیں جاتی تھی۔ یہ نہیں کہ کمرے میں ہیٹر نہیں تھا لیکن اسے جلانے کے لئے اس کے اندر ایک شیلنگ ڈالنا پڑتا تھا پہلی رات جب میں اس کمرے میں سویا تھا تو رات بھر اس ہیٹر کو پیسے کھلاتا رہا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد اس کی آگ ٹھنڈی کرنی پڑتی تھی۔ دوسرے دن میرے پاس ناشتے کے پیسے بھی نہیں بچے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہیٹر کو الگ چھوڑ دیا۔ میں رات بھر ٹھنڈ سے کانپتا رہتا لیکن یہ تسلی رہتی کہ وہ بھی بھوکا پڑا ہے وہ میز پر ٹھنڈا پڑا رہتا میں بستر پر اور اس طرح ہم دونوں کے بیچ سرد جنگ جاری رہتی۔

صبح ہوتے ہی میں جلدی سے جلدی لائبریری چلا آتا، پتہ نہیں کتنے لوگ میری طرح وہاں آتے تھے۔ لائبریری کھلنے سے پہلے ہی دروازے پر لائن بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان

میں سے زیادہ تر بوڑھے لوگ ہوتے تھے جنہیں پینشن بہت کم ملتی تھی لیکن سردی سب سے زیادہ لگتی تھی۔ میزوں پر ایک دو کتابیں کھول کر وہ بیٹھ جاتے کچھ ہی دیر بعد میں دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں سب لوگ سو رہے ہیں۔ کوئی انہیں ٹوکتا نہیں تھا، ایک آدھ گھنٹے بعد لائبریری کا کوئی ملازم وہاں چکر لگانے آجاتا۔ کھلی کتابوں کو بند کر دیتا اور ان لوگوں کی دھیرے سے ہلا دیتا جن کے خراٹے دوسروں کی نیند یا پڑھائی میں خلل ڈالنے لگے ہوں۔

ایسی ہی ایک اونگھتی دوپہر میں میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ لائبریری کی لمبی کھڑکی سے۔ اس نے اپنا بستہ ایک بینچ پر رکھ دیا تھا اور خود پیڑوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ وہ کوئی دھوپ کا دن نہ تھا، اس لئے مجھے کچھ حیرانی ہوئی کہ اتنی ٹھنڈ میں وہ لڑکی باہر کھیل رہی ہے، وہ بالکل اکیلی تھی، باقی بینچ خالی پڑی تھی اور اس دن پہلی بار مجھے یہ جاننے کا تجسس ہوا تھا کہ وہ کون سے کھیل ہیں، جنہیں کچھ بچے اکیلے میں کھیلتے ہیں۔

دوپہر ہوتے ہی وہ پارک میں آتی، بینچ پر اپنا بیگ رکھ دیتی اور پھر پیڑوں کے پیچھے بھاگ جاتی۔ میں کبھی کبھی کتاب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیتا۔ پانچ بجنے پر سرکاری اسپتال کا گجر سنائی دیتا۔ گھنٹہ بجتے ہی وہ لڑکی جہاں بھی ہوتی دوڑتے ہوئے اپنی بینچ پر آ بیٹھتی۔ وہ بستے کو گود میں رکھ کر چپ چاپ بیٹھی رہتی، جب تک دوسری طرف سے ایک عورت نہ دکھائی دے جاتی۔ میں کبھی اس عورت کا چہرہ ٹھیک سے نہ دیکھ سکا، وہ ہمیشہ نرس کی سفید پوشاک میں آتی تھی اور اس سے پہلے کی بینچ تک پہنچ پاتی وہ لڑکی اپنا صبر کھو کر بھاگنے لگتی اور انہیں بیچ میں ہی روک لیتی۔ وہ دونوں گیٹ کی طرف مڑ جاتے اور میں انہیں اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔

میں یہ سب دیکھتا تھا، ہچ کاک کے ہیرو کی طرح۔ کھڑکی سے باہر، جہاں یہ پینٹومیم روز دہرایا جاتا تھا یہ سلسلہ شاید سردیوں تک چلتا رہتا، اگر ایک دن اچانک موسم نے کروٹ نہ لی ہوتی۔

ایک رات سوتے ہوئے مجھے اچانک اپنی رضائی اور اس پر رکھے ہوئے کوٹ بوجھ جان پڑے۔ میرا جسم پسینے سے لت پت تھا جیسے بہت دنوں بعد بخار سے اٹھ رہا ہوں۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تو نہ دھند، نہ کہرا! لندن کا آکاش نیلی مخملی ڈبیا سا کھلا تھا۔ جس میں کسی نے ڈھیر سے تارے بھر دئے تھے۔ مجھے لگا جیسے یہ گرمیوں کی رات ہے اور میں غیر ملک میں نہ ہو کر اپنے گھر کی چھت پر لیٹا ہوں۔

اگلے دن کھل کر دھوپ نکلی تھی۔ میں زیادہ دیر تک لائبریری میں نہیں بیٹھ سکا۔ دوپہر ہوتے ہی میں باہر نکل پڑا اور گھومتا ہوا اس ریستوراں میں چلا آیا جہاں میں روز

کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ وہ ایک سستا یہودی ریستوراں تھا وہاں صرف ڈیڑھ شلینگ میں کوشر گوشت، دو روٹیاں اور بیر کا ایک چھوٹا گلاس مل جاتا تھا۔ ریستوراں کی یہودی مالکن جو جنگ سے پہلے لوتھنیا سے آئی تھی، ایک اونچے سٹول پر بیٹھی رہتی۔ کاونٹر پر ایک کیش باکس رکھا رہتا اور اس کے نیچے ایک سفید سیاہی بلی گاہکوں کو گھورتی رہتی۔ مجھے شاید وہ تھوڑا بہت پہچاننے لگی تھی کیونکہ جتنی دیر میں کھاتا رہتا اتنی دیر وہ اپنی ہری آنکھوں سے میری طرف ٹکر ٹکر تاکتی رہتی۔ غریبی اور ٹھنڈ اور اکیلے پن کے دنوں میں بلی کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے، یہ میں ان دنوں سوچا کرتا تھا، میں یہ بھی سوچتا تھا کہ کسی دن میں بھی ایسا ہی ہندوستانی ریستوراں کھولوں گا اور ایک ساتھ تین بلیاں پالوں گا۔

ریستوراں سے باہر آیا تو دوبارہ لائبریری جانے کی تمنا مر گئی۔ لمبی مدت بعد اس دن گھر سے چٹھیاں اور اخبار آئے تھے میں۔ انھیں پارک کی کھلی دھوپ میں پڑھنا چاہتا تھا مجھے ہلکی۔سا حیرت ہوئی جب میری نظر پارک کے پھولوں پر گئی۔ وہ بہت چھوٹے پھول تھے جو گھاس کے بیچ اپنا سر اٹھا کر کھڑے تھے۔ انھی پھولوں کے بارے میں شاید جس جس نے کہا تھا، 'لیلیج آف دفیلڈ'، ایسے پھول، جو آنے والے دنوں کے بارے میں نہیں سوچتے۔

وہ گزری ہوئی گرمیوں کی یاد دلاتے تھے۔ میں گھاس کے بیچ ان پھولوں پر چلنے لگا بہت اچھا لگا آنے والے دنوں کی فکر دور ہونے لگی۔ میں بے فکر سا ہو گیا۔ میں نے اپنے جوتے اتار دئے اور گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگا۔ میں بینچ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے ایک چیخ سنائی دی۔ کوئی تیزی سے بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی دکھائی دی۔ وہ پیڑوں سے نکل کر باہر آئی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

''یو آر کاٹ'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''اب آپ جا نہیں سکتے۔''

میں سمجھا نہیں جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا۔

''آپ پکڑے گئے'' اس نے دوبارہ کہا'' آپ میری زمین پر کھڑے ہیں''۔

میں نے چاروں طرف دیکھا، گھاس پر پھول تھے، کنارے پر خالی بینچیں تھی۔ بیچ میں تین ایور گرین پیڑ اور ایک موٹے تنے والا اوک کھڑا تھا۔ اس کی زمین کہیں دکھائی نہ دی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا۔'' میں نے کہا اور مڑ کر واپس جانے لگا۔

''نہیں نہیں..... آپ جا نہیں سکتے'' بچی ایک قدم میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''وہ آپ کو جانے نہیں دیں گے۔''

''کون نہیں جانے دے گا'' میں نے پوچھا

اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا جواب سچ مچ سیاہی سے دکھائی دے رہے تھے۔
لمبے بٹے کٹے پہرےدار۔ میں بغیر جانے ان کے نادیدہ پھندے میں چلا آیا تھا۔
کچھ دیر تک ہم چپ چاپ آمنے سامنے کھڑے رہے۔ اس کی آنکھیں برابر مجھ تکی تھیں۔ وہ پرجوش اور ہمہ تن، جب اس نے دیکھا، میرا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، تو وہ کچھ ڈھیلی پڑی۔

''آپ چھوٹنا چاہتے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''کیسے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو انھیں کھانا دینا ہوگا، یہ بہت دن سے بھوکے ہیں۔'' اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا وہ ہوا میں سر ہلا رہے تھے۔

''کھانا میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ چاہیں تو لا سکتے ہیں۔'' اس نے امید بندھائی۔ ''یہ صرف پھول، پتے کھاتے ہیں۔''

میرے لئے یہ مشکل نہیں تھا۔ وہ اکتوبر کے دن تھے اور پارک میں پھولوں کے علاوہ ڈھیروں پتے بکھرے رہا کرتے تھے۔ میں نیچے جھکا ہی تھا کہ اس نے لپک کر میرا ہاتھ روک لیا۔

''نہیں نہیں، یہاں سے نہیں، یہ میری زمین ہے آپ کو وہاں جانا ہوگا۔'' اس نے پارک میں کنارے کی طرف دیکھا۔ وہاں مرجھائے پھولوں اور پتوں کا ڈھیر لگا تھا، میں وہاں جانے لگا کہ اس کی آواز سنائی دی۔

''ٹھہریئے میں آپ کے ساتھ آتی ہوں لیکن اگر آپ بچ کر بھاگیں گے تو...... یہیں مر جائیں گے۔'' وہ رکی، میری طرف دیکھا۔ ''آپ مرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے جلدی سے سر ہلایا، وہ اتنا گرم اور اُجلا دن تھا کہ مرنے کی میری کوئی خواہش نہیں تھی۔

ہم کنارے تک گئے۔ میں نے رومال نکالا اور پھول پتیوں کو بٹورنے لگا۔ آزادی پانے کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔

واپس لوٹتے ہوئے وہ چپ رہی۔ میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ کافی پیاری بچی جان پڑتی تھی۔ ان بچوں کی طرح سنجیدہ جو ہمیشہ اکیلے میں اپنے ساتھ کھیلتے ہیں۔ جب وہ چپ رہتی تھی تو ہونٹ بچک جاتے تھے۔ نیچے کا ہونٹ تھوڑا سا باہر نکل آتا، جس کے اوپر دبی ہوئی ناک بے سہارا سی دکھائی دیتی تھی، بال بہت چھوٹے تھے اور بہت کالے۔ گول چھلوں میں ڈھلی ہوئی روئی کی طرح بٹے ہوئے جنھیں چھونے کو بے ساختہ ہاتھ آگے بڑھ جاتا تھا لیکن وہ اپنی دوری میں ہر طرح کی چھوون سے پرے جان پڑتی تھی۔

''اب آپ انھیں کھانا دے سکتے ہیں۔'' اس نے کہا وہ پیڑوں کے پاس آ کر رک گئی تھی۔

''کیا وہ مجھے چھوڑ دیں گے؟'' میں کوئی گارنٹی کوئی بھروسہ پانا چاہتا تھا۔

اس بار وہ مسکرائی۔ اور میں نے پہلی بار اس کے دانت دیکھے۔ ایک دم سفید اور چمکیلے ،جیسے اکثر نیگرو لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔

میں نے وہ پتیاں رومال سے باہر نکالیں۔ چار حصوں میں بانٹا اور برابر برابر سے پیڑوں کے نیچے ڈال دی۔

میں آزاد ہو گیا تھا، کچھ خالی سا بھی۔

میں نے جیب سے چٹھیاں اور اخبار نکالے اور اس بینچ پر بیٹھ گیا جہاں اس کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ وہ کالے چمڑے کا بیگ تھا، اندر کتابیں ٹھسی تھیں۔ اوپر کی جیب سے آدھا کترا ہوا سیب باہر جھانک رہا تھا۔

وہ اوجھل ہو گئی۔ میں نے چاروں طرف دھیان سے دیکھا تو اس کی فراک کا ایک کونا جھاڑیوں سے باہر دکھائی دیا۔ وہ ایک خرگوش کی طرح دبک کر بیٹھی تھی۔ میرے ہی جیسے کسی بھولے بھٹکے مسافر پر جھپٹنے کے لئے لیکن بہت دیر تک پارک سے کوئی آدمی نہیں گزرا۔ ہوا چلتی تو پیڑوں کے نیچے جمع کی ہوئی پتیاں گھومنے لگتیں ــــــ ایک بھنور کی طرح۔ اور وہ اپنے شکار کو بھول کر ان کے پیچھے بھاگنے لگتی۔

وہ کچھ دیر بعد بینچ کے پاس آئی، ایک لمحے مجھے دیکھا، پھر بستے کی جیب سے سیب نکالا، میں اخبار پڑھتا رہا اور اس کے دانتوں کے بیچ سیب کی کترن سنتا رہا۔

اچانک اس کی نظر میری چٹھیوں پر پڑی جو بینچ پر رکھی تھیں اس کے ہلتے ہوئے جبڑے رک گئے۔

''یہ آپ کی ہیں؟''

''ہاں'' میں نے اس کی طرف دیکھا

''اور یہ''

اس نے لفافے پر لگے ٹکٹ کی طرف انگلی۔ اٹھائی ٹکٹ پر ہاتھی کی تصویر تھی جس کی سونڈ اوپر ہوا میں اٹھی تھی۔ وہ اپنے دانتوں کے بیچ ہنستا سا دکھائی دے رہا تھا۔

''تم کبھی zoo گئی ہو؟'' میں نے پوچھا

''ایک بار پاپا کے ساتھ گئی تھی۔ انھوں نے مجھے ایک پینی دی تھی اور ہاتھی نے اپنی سونڈ سے اس پینی کو میرے ہاتھ سے اٹھایا تھا۔

''تم ڈری نہیں؟''

''نہیں، کیوں؟''اس نے سیب کترتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''پاپا تمھارے ساتھ یہاں نہیں آتے؟''

''ایک بار آئے تھے، تین بار پکڑے گئے۔''وہ دھیمے سے ہنسی۔ جیسے میں وہاں نہیں ہوں، جیسے کوئی اکیلے میں ہنستا ہے، جہاں ایک یاد پچاس تہیں کھولتی ہے۔

اسپتال کی گھڑی کا گجر سنائی دیا تو ہم دونوں چونک گئے۔ لڑکی نے بنچ سے بستہ اٹھایا اور ان پیڑوں کے پاس گئی، جو چپ کھڑے تھے۔ بچی ہر پیڑ کے پاس جاتی تھی، چھوتی تھی، کچھ کہتی تھی، جسے صرف پیڑ سن پاتے تھے۔ آخر میں وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے ہاتھ ملایا، جیسے میں بھی ان پیڑوں میں سے ایک ہوں۔

اس کی نگاہیں پیچھے مڑ گئیں۔ میں نے دیکھا کون ہے؟ وہ عورت دکھائی دی۔ وہ نرسوں والی سفید پوشاک ہری گھاس پر چمک رہی تھی۔ بچی انھیں دیکھتے ہی بھاگنے لگی۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وہی عورت تھی جنھیں میں لائبریری کی کھڑکی سے دیکھتا تھا۔ چھوٹا قد، کندھے پر تھیلا اور بچی جیسے ہی کالے، گھنگھریالے بال۔ وہ مجھ سے کافی دور تھے لیکن ان کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ الگ الگ لفظ نہیں، صرف دو لفظوں کی ایک آہٹ۔ وہ گھاس پر بیٹھ گئے تھے۔ بچی مجھے بھول گئی تھی۔

میں نے جوتے پہنے، اخبار اور چٹھیاں جیب میں رکھ لیں۔ ابھی وقت کافی ہے میں نے سوچا ایک دو گھنٹے لائبریری میں بتا سکتا ہوں۔ پارک کے جادو سے الگ، اپنے اکیلے کونے میں۔

میں بیچ پارک میں چلا آیا پیڑوں کی پھنگیوں پر آگ سلگنے لگی تھی۔ پورا پارک سونے میں گل رہا تھا بیچ میں پتوں کا دریا تھا، ہوا میں ہلتا ہوا۔

کون۔ کون ہے؟ کوئی مجھے بلا رہا تھا اور میں چلتا گیا، رکا نہیں کبھی کبھی آدمی خود اپنے کو بلانے لگتا ہے، باہر سے اندر اور اندر کچھ نہیں ہوتا لیکن یہ بلاوا اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ یہ رکا نہیں، اس لئے آخر میں مجھے ہی رکنا پڑا۔ اس بار کوئی شک نہیں ہوا سچ مچ کوئی چیخ رہا تھا۔''سٹاپ سٹاپ''۔۔۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لڑکی کھڑی ہو کر دونوں ہاتھ ہوا میں ہلا رہی تھی۔

میں پھر پکڑا گیا تھا، دوبارہ۔ بیوقوف کی طرح میں اس کی زمین پر چلا آیا تھا، چار پیڑوں سے گھرا ہوا، اس بار ماں اور بیٹی دونوں ہنس رہے تھے۔

وہ گرمی کی شروعات کے دن تھے۔ یہ دن زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ اسے سب جانتے

تھے۔ لائبریری اُجاڑ رہنے لگی۔ میرے پڑوسی، بوڑھے پنشن یافتہ لوگ، اب باہر دھوپ میں بیٹھنے لگے۔ آسمان اتنا نیلا دکھائی دیتا کہ لندن کی دھند بھی اسے میلا نہ کر پاتی اس کے نیچے پارک ایک ہرے جزیرے سا لیٹا رہتا۔

گریتا (یہ اس کا نام تھا) ہمیشہ وہاں دکھائی دیتی تھی۔ کبھی دکھائی نہ دیتی تو بھی بنچ پر اس کا بستہ دیکھ کر پتا چل جاتا کہ وہ یہیں کہیں ہے، کسی کونے میں دُبکی ہے میں بچتا ہوا آتا، پیڑوں سے، جھاڑیوں سے، گھاس کے پھولوں سے ہر روز وہ کہیں نہ کہیں ایک نادیدہ خوف ناک پھندا چھوڑ جاتی اور جب پوری ہوشیاری کے باوجود میرا پاؤں اس میں پھنس جاتا، تو وہ بدحواس چیختی ہوئی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ میں پکڑ لیا جاتا، چھوڑ دیا جاتا، پھر پکڑ لیا جاتا......

یہ کھیل نہیں تھا۔ وہ ایک پوری دنیا تھی، اس دنیا سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ حالانکہ میں کبھی کبھی اس میں بلا لیا جاتا تھا۔ ڈرامے میں ایک فاضل کردار کی طرح۔ مجھے ہمیشہ تیار رہنا پڑتا تھا کیونکہ وہ مجھے کسی بھی وقت بلا سکتی تھی۔ ایک دوپہر ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تھے کہ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہلو مسز ٹامس...'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج آپ بہت دن بعد دکھائی دیں۔ یہ میرے انڈین دوست ہے، ان سے ملئے۔''

میں حیرت زدہ اسے دیکھتا رہا، وہاں کوئی نہ تھا۔

''آپ بیٹھے ہیں؟ ان سے ہاتھ ملایئے۔'' اس نے مجھے کچھ جھڑکتے ہوئے کہا۔

میں کھڑا ہو گیا، خالی ہوا سے ہاتھ ملایا۔ گریتا کھسک کر میرے پاس بیٹھ گئی تاکہ کونے میں مسز ٹامس بیٹھ سکیں۔

''آپ بازار جا رہی تھیں؟'' اس نے خالی جگہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا تھیلا دیکھ کر سمجھ گئی نہیں، معاف کیجئے، میں آپ کے ساتھ نہیں آسکتی، مجھے بہت کام کرنا ہے، انھیں دیکھئے (اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا)، یہ صبح سے بھوکے ہیں، میں نے ابھی تک ان کے لئے کھانا بھی نہیں بنایا۔ آپ چائے پئیں گے یا کافی؟ اوہ۔ آپ گھر سے پی کر آئی ہیں۔ کیا کہا۔ میں آپ کے گھر کیوں نہیں آتی؟ آجکل وقت کہاں ملتا ہے؟ صبح اسپتال جانا پڑتا ہے، دوپہر کو بچوں کے ساتھ آپ تو جانتی ہیں، میں اتوار کو آؤں گی آپ جا رہی ہیں ...؟''

اس نے کھڑے ہو کر دوبارہ ہاتھ ملایا۔ مسز ٹامس شاید جلدی میں تھیں۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے مجھے دیکھا نہیں،، اور میں بنچ پر ہی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے، پھر اچانک وہ چونک پڑی۔

''آپ کچھ سن رہے ہیں؟'' اس نے میری کہنی کو جھنجھوڑا۔

''کچھ بھی نہیں'' میں نے کہا۔

''فون کی گھنٹی کتنی دیر سے بج رہی ہے، ذرا دیکھئے کون ہے؟''

میں اٹھ کر بینچ کے پیچھے گیا، نیچے گھاس سے ایک ٹوٹی ٹہنی اٹھائی اور زور سے کہا ''ہیلو!''

''کون ہے؟'' اس نے کچھ بے صبری سے پوچھا

''مسز ٹامس'' میں نے کہا

''او وہ پھر مسز ٹامس'' اس نے ایک تھکی سی جمائی لی، دھیمے قدموں سے پاس آئی، میرے ہاتھ سے ٹہنی کھینچ کر کہا۔ ''ہیلو، مسز ٹامس آپ بازار سے لوٹ آئیں؟ کیا کیا لائیں؟ میٹ بالس، فش فنگرس، آلو کے چپس؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں وہ شاید چن چن کر اس سب چیزوں کے نام لے رہی تھی، جو اسے سب سے اچھی لگتی تھی۔

پھر وہ چپ ہوگئی جیسے مسز ٹامس نے کوئی غیر متوقع پیش کش اس کے سامنے رکھی ہو۔

''ٹھیک ہے مسز ٹامس، میں ابھی آتی ہوں۔ نہیں مجھے دیر نہیں لگے گی، میں ابھی بس اسٹیشن کی طرف جارہی ہوں گوڈ بائے، مسز ٹامس!''

اس نے چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا

''مسز ٹامس نے مجھے ڈنر پر بلایا ہے، آپ کیا کریں گے؟''

''میں سوؤں گا۔''

''پہلے انہیں کچھ کھلا دینا ...... نہیں تو یہ روئیں گے۔'' اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا، جو ٹھہری ہوا میں ساکت کھڑے تھے۔

وہ تیار ہونے لگی۔ اپنے بکھرے بالوں کو سنوارا، پاؤڈر لگانے کا بہانہ کیا۔ ہتھیلی کا شیشہ بنا کر اس میں جھانکا، دھوپ اور پیڑوں کے سایوں کے بیچ وہ سچ مچ خوبصورت لگ رہی تھی۔

جاتے وقت اس نے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ میں اسے دیکھتا رہا، جب تک وہ پیڑوں اور جھاڑیوں کے گھنے جھرمٹ میں غائب نہیں ہوگئی۔

ایسا ہر روز ہونے لگا وہ مسز ٹامس سے ملنے چلی جاتی اور میں بنچ پر لیٹا رہتا۔ مجھے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جن کا کوئی وجود نہیں تھا ایسی پارک کی عجیب آوازیں مجھے ہر قدم گھیرے رہتیں۔ میں ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں چلا آتا۔ وہ پارک کے دور کونوں میں بھٹکتی پھرتی۔ میں لائبریری کی کتابوں کا سرہانا بنا کر بنچ پر لیٹ جاتا۔ لندن کے بادلوں کو دیکھتا، وہ گھومتے رہتے

اور جب کبھی کوئی سفید ٹکڑا سورج پر اٹک جاتا، تب پارک میں اندھیرا سا چھا جاتا۔

ایسے ہی ایک دن جب میں بنچ پر لیٹا تھا، مجھے اپنے نزدیک ایک عجیب سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ مجھے لگا، میں خواب میں مسز ٹامس کو دیکھ رہا ہوں وہ میرے قریب۔ بالکل قریب آکر کھڑی ہوگئی ہیں، مجھے بلا رہی ہیں۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

سامنے بچی کی ماں کھڑی تھیں۔ انھوں نے گریتا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور کچھ کشمکش میں وہ مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''معاف کیجئے......'' انھوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ سو تو نہیں رہے تھے؟''

میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''آج آپ جلدی آگئیں؟'' میں نے پوچھا۔ ان کی سفید پوشاک، کالی بیلٹ اور بالوں پر بندھے اسکارف کو دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ لگتا تھا وہ اسپتال سے سیدھی یہاں چلی آرہی تھیں۔

''ہاں، میں جلدی آگئی۔'' وہ مسکرانے لگیں۔ ''سنیچر کو کام زیادہ نہیں رہتا۔ میں دوپہر کو ہی آجاتی ہوں۔''

وہ ویسٹ انڈیز کے لوگوں کے لہجے میں بول رہی تھیں جس میں ہر لفظ کا آخری حصہ غبارے سا اڑتا دکھائی دیتا تھا۔

''میں آپ سے کہنے آئی تھی کہ آج آپ ہمارے ساتھ چائے پینے چلئے گا؟...... ہم لوگ قریب ہی رہتے ہیں۔''

ان کے لہجے میں کوئی تکلف یا دکھاوا نہیں تھا، جیسے وہ مجھے مدت سے جانتی ہوں۔

میں تیار ہوگیا میں عرصے سے کسی کے گھر نہیں گیا تھا۔ اپنے بیڈ سیٹر سے لائبریری اور پارک تک چکر کاٹتا رہتا تھا۔ میں لگ بھگ بھول گیا تھا کہ اس کے پرے ایک اور دنیا ہے جہاں گریتا رہتی ہوگی، کھاتی ہوگی، سوتی ہوگی۔

وہ آگے آگے چل رہی تھیں کبھی کبھی پیچھے مڑکر دیکھ لیتی تھیں کہ کہیں ہم بہت دور تو نہیں چھوٹ گئے۔ اسے شاید کچھ انوکھا سا لگ رہا تھا کہ میں اس کے گھر آرہا ہوں۔ عجیب مجھے بھی لگ رہا تھا اس کے گھر آنا نہیں، بلکہ اسکی ماں کے ساتھ چلنا۔ وہ عمر میں کافی چھوٹی جان پڑتی تھیں، شاید اپنے قد کی وجہ سے میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ کچھ اتنی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں کہ

وہم ہوتا تھا کہ میں کسی دوسری گریتا کے ساتھ چل رہا ہوں۔

راستے بھر وہ چپ رہیں صرف جب ان کا گھر سامنے آیا، تو وہ ٹھٹھک گئیں۔

''آپ بھی تو کہیں پاس رہتے ہیں؟'' انھوں پوچھا۔

''برانڈ اسٹریٹ میں'' میں نے کہا ''ٹیوب اسٹیشن کے بالکل سامنے''

''آپ شاید حال میں ہی آئے ہیں؟'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس علاقے میں بہت کم انڈین رہتے ہیں۔''

وہ نیچے اترنے لگیں۔ ان کا گھر بیسمنٹ میں تھا اور ہمیں سیڑھیاں اتر کر نیچے جانا پڑا تھا۔ بچی دروازہ کھول کر کھڑی تھی۔ کمرے میں دن کے وقت بھی اندھیرا تھا۔ بتی جلائی، تو تین چار کرسیاں دکھائی دیں۔ بیچ میں ایک میز تھی ضرورت سے زیادہ لمبی اور تنگ۔ جیسی اس پر پنگ پانگ کھیلی جاتی ہے۔ دیوار سے لگا صوفہ تھا جس کے سرہانے ایک رضائی لپٹی رکھی تھی۔ لگتا تھا، وہ کمرا بہت سے کاموں کے کام آتا تھا، جس میں کھانا، سونا اور موقعہ پڑنے پر مہمان نوازی بھی شامل تھی۔

''آپ بیٹھیے، میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

وہ پردہ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔ میں اور گریتا کمرے میں اکیلے بیٹھے رہے۔ ہم دونوں پارک کے پت جھڑی اجالے میں ایک دوسرے کو پہچاننے لگے تھے لیکن کمرے کے اندر نہ کوئی موسم تھا، نہ پارک جیسی طلسماتی فضا۔ وہ اچانک ایک بہت کم عمر والی بچی بن گئی تھی، جس کا جادو اور رعب دار انداز دونوں ختم ہو گئے تھے۔

''تم یہاں سوتی ہو؟'' میں نے صوفے کی طرف دیکھا۔

''نہیں، یہاں نہیں'' اس نے سر ہلایا۔ ''میرا کمرہ اندر ہے، آپ دیکھیں گے؟''

کچن سے آگے ایک کوٹھری تھی جو شاید بہت پہلے گودام رہا ہوگا۔ وہاں ایک نیلی چک لٹک رہی تھی۔ اس نے چک اٹھائی اور دبے قدموں سے اندر چلی آئی۔

''دھیرے سے آئیے۔ وہ سو رہا ہے۔''

''کون؟''

''ہش!'' اس نے اپنا ہاتھ منھ پر رکھ دیا۔ میں نے سوچا، کوئی اندر ہے لیکن کوٹھری بالکل سونی تھی۔ کمرے کی ہری دیواریں تھیں جن پر جانوروں کی تصویریں چپکی تھیں۔ کونے میں اس کی کھاٹ تھی، جو کھٹولا سی دکھائی دیتی تھی۔ تکیئے پر پالی بیگ میں لپٹا ایک بھالو لیٹا تھا گدڑی کے لال جیسا۔

''وہ سو رہا ہے۔''اس نے پھسپھساتے ہوئے کہا۔
''اور تم؟''میں نے کہا''تم یہاں نہیں سوتی؟''
''یہاں سوتی ہوں جب پاپا یہاں تھے،تو وہ دوسرے پلنگ پر سوتے تھے۔ ماں نے اب اس پلنگ کو باہر رکھوا دیا ہے۔''
''کہاں رہتے ہیں وہ؟''اس بار میرا لہجہ بھی دھیما ہو گیا، بھالو کے ڈر سے نہیں اپنے اس ڈر سے، جو کئی دنوں سے میرے اندر پل رہا تھا۔
''اپنے گھر رہتے ہیں۔اور کہاں؟''
اس نے تھوڑی حیرت سے مجھے دیکھا۔اسے لگا، مجھے پوری طرح سے یقین نہیں ہوا ہے۔وہ اپنی میز کے پاس گئی، جہاں اس کی اسکول کی کتابیں رکھی تھیں، دراز کھولا اور اس کے اندر سے خطوں کا پلندہ باہر نکالا۔پلندے پر ریشم کا لال فیتہ بندھا تھا، جیسے وہ کرسمس کا کوئی تحفہ ہو۔وہ انھیں اٹھا کر میرے پاس لے آئی۔سب سے اوپر والے لفافے پر لگا ٹکٹ دکھایا۔
''وہ یہاں رہتے ہیں۔''اس نے کہا۔
مجھے یاد آیا، وہ میری نقل کر رہی ہے۔بہت پہلے پارک میں میں نے اسے اپنے ملک کی چٹھی دکھائی تھی۔

بیٹھک سے اس کی ماں ہمیں بلا رہی تھی، آواز سنتے ہی وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔
میں ایک لمحے وہیں ٹھٹھکا رہا۔کھٹولے پر بھالو سو رہا تھا دیواروں پر جانوروں کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔بستر کے پاس ہی ایک چھوٹا سا واش بیسن تھا جس پر اس کا ٹوتھ برش، صابن اور کنگھا رکھے تھے۔

بالکل میرے بیڈ سیٹر کی طرح۔میں نے سوچا حالانکہ مجھ سے بہت الگ۔
میں اپنا کمرہ چھوڑ کر کہیں بھی جا سکتا تھا، اس کا کمرہ اپنی چیزوں کے جمے جمائے سیٹ میں دائمی سا جان پڑتا تھا۔

میز پر چٹھیوں کا پلندہ پڑا تھا، ریشمی ڈور میں بندھا ہوا، جسے جلدی میں وہ اکیلا چھوڑ گئی تھی۔
''کمرہ دیکھ لیا آپ نے؟''انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''یہاں جو بھی آتا ہے سب سے پہلے اسے اپنا کمرہ دکھاتی ہے۔''وہ کپڑے بدل کر آئی تھیں۔لال چھینٹ کی اسکرٹ اور کھلا بھورے رنگ کا کارڈیگن کمرے میں سستی سینٹ کی مہک پھیلی تھی۔
''آپ چائے نہیں۔دعوت دے رہی ہے''میں نے میز پر رکھے سامان کو دیکھ

کر کہا۔ ٹوسٹ جیم، مکھن، چیز پتا نہیں، اتنی ساری چیزیں میں نے پہلے کب دیکھی تھیں۔

''اسپتال کی کنٹین سے لے آتی ہوں، وہاں سستے میں مل جاتا ہے۔''

وہ پریشان لگتی تھیں۔ ہنستی تھیں لیکن پریشانی اپنی جگہ قائم رہتی تھی۔ پتہ نہیں، بچی کہاں تھیں؟ وہ اسے چیختے ہوئے بلا رہی تھیں اور چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھی رہی پھر یاد آیا، میں بھی ہوں۔ ''آپ شروع کیجئے۔ وہ باغ میں بیٹھی ہوگی''۔

''آپ کا اپنا باغ ہے؟'' میں نے پوچھا

''بہت چھوٹا سا کچن کے پیچھے جب ہم یہاں آئے تھے، اجاڑ پڑا تھا میرے شوہر نے اسے صاف کیا اب تو تھوڑی بہت سبزی بھی نکل آتی ہے''۔

''آپ کے شوہر یہاں نہیں رہتے؟''

''انھیں یہاں کام نہیں ملا۔ دن بھر پارک میں گھومتے رہتے تھے وہی عادت گریتا کو پڑی ہے......''

ان کے لہجے میں ہلکی سی تھکان تھی، جھنجھلاہٹ سے عاری۔ لیکن ایسی تھکان جو ہلکی گرد سی ہر چیز پر بیٹھ جاتی ہے۔

''پارک میں تو میں بھی گھومتا ہوں'' میں نے انھیں ہلکا کرنا چاہا وہ ہو بھی گئیں، ہنسنے لگی۔

''آپ کی بات الگ ہے'' انھوں نے ڈوبے لہجے میں کہا۔ آپ اکیلے ہیں لیکن لندن میں اگر گھر والے ساتھ ہوں، تو بنا نوکری کے نہیں رہا جا سکتا۔''

وہ میز کی چیزیں صاف کرنے لگیں۔ برتنوں کو جمع کر کے میں کچن میں لے گیا۔ سنک کے آگے کھڑکی تھی، جہاں سے ان کا باغ دکھائی دیتا تھا۔ بیچ میں ایک ویپنگ ولو کھڑا تھا، جس کی شاخائیں ایک الٹی چھتری کی سلاخوں کی طرح جھول رہی تھیں۔

پیچھے مڑا تو وہ دکھائی دیں، دروازے پر تولیہ لیکر کھڑی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''آپ کے باغ کو...... یہ تو کوئی بہت چھوٹا نہیں ہے۔''

''ہے نہیں لیکن اس پیڑ نے ساری جگہ گھیر رکھی ہے میں اسے کٹوانا چاہتی تھی، لیکن وہ اپنی ضد پر اڑ گئی۔ جس دن پیڑ کٹنا تھا، وہ رات بھر روتی رہی۔''

وہ چپ ہو گئیں جیسے اس رات کو یاد کرنا اپنے میں ایک رونا ہو۔

''کیا کہتی تھی؟''

''کہتی کیا تھی۔اپنی ضد پر اڑی تھی بہت پہلے کبھی اس کے پاپا نے کہا ہو گا کہ پیڑ کے نیچے سمر ہاؤس بنائیں گے۔اب آپ بتائیے، یہاں خود رہنے کو جگہ ہے نہیں، باغ میں گڑیوں کا سمر ہاؤس بنے گا؟''

''سمر ہاؤس''؟''

''ہاں سمر ہاؤس۔ جہاں گریتا اپنے بھالو کے ساتھ رہے گی۔''۔وہ ہنسنے لگیں، ایک اداس سی ہنسی ،جو ایک خالی جگہ سے اٹھ کر دوسری خالی جگہ پر ختم ہو جاتی ہے اور بیچ کی جگہ کو بھی خالی چھوڑ جاتی ہے۔

میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔لیکن گریتا کہیں دکھائی نہیں دی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے آئے۔لندن کی میلی دھوپ پڑوس کی چمنیاں پر رینگ رہی تھیں۔

جب جانے کی اجازت لینے کے لئے میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انھوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔''آپ کل خالی ہیں؟''

''کہیے۔میں تقریباً ہر روز خالی رہتا ہوں۔''

''کل اتوار ہے....''انھوں نے کہا۔''گریتا کی چھٹی ہے، لیکن میری اسپتال میں ڈیوٹی ہے،کیا میں اسے آپ کے پاس چھوڑ سکتی ہوں؟''

''کتنے بجے آنا ہو گا؟''

''نہیں،آپ آنے کی تکلیف نہ کریں اسپتال جاتے ہوئے میں اسے لائبریری کے سامنے چھوڑ دوں گا.....شام کو لوٹتے ہوئے لے لوں گی۔''

میں نے حامی بھری اور سڑک پر چلا آیا۔کچھ دور چل کر جیب سے پیسے نکالے اور انھیں گننے لگا۔آج کھانے کے پیسے بچ جائیں گے، یہ سوچ کر خوشی ہوئی۔ میں بچی ہوئی ریزگاری کو مٹھی میں دبایا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔میں لائبریری کے دروازے پر کھڑا تھا۔

انھیں دیر گئی تھی۔شاید سردی کی وجہ سے دھوپ کہیں نہ تھی۔لندن کی عمارتوں پر ایک ہلکی روشنی پھیلی تھی۔پیلی اور زرد، جس میں وہ اور بھی مفلس اور دکھی دکھائی دیتی تھیں۔

مجھے ان کی سفید پوشاک دکھائی دی۔ دونوں پارک سے گزرتے ہوئے آرہے تھے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے بھاگتی ہوئی گریتا جب انھوں نے مجھے دیکھ لیا تو ہوا میں ہاتھ ہلایا۔ بچی کو جلدی سے چوما اور تیز قدموں سے اسپتال کی طرف مڑ گئیں۔

جبکہ بچی میں کوئی جلدی نہ تھی وہ دھیمے قدموں سے میرے پاس آئی۔ سردی میں ناک لال سرخ ہو گئی تھی۔اس نے پوری باہوں والا براون سویٹر پہن رکھا تھا، سر پر وہی پرانی کیپ تھی

جسے میں پارک سے دیکھا کرتا تھا۔

وہ نڈھال سی کھڑی تھی۔

''چلو گی؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے چپ چاپ سر ہلا دیا۔ مجھے ہلکی سی نا امیدی ہوئی۔ میں نے سوچا تھا، وہ پوچھے گی کہاں۔ اور تب میں اسے حیرت میں ڈال دوں گا لیکن اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا اور ہم سڑک پار کرنے لگے۔

جب ہم پارک کو چھوڑ کر آگے بڑھے تو ایک بار اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے وہ اپنے کسی محفوظ گھیرے سے باہر جا رہی ہو لیکن میں چپ رہا اور اس نے کچھ نہیں پوچھا تب مجھے پہلی بار لگا کہ جب بچے ماں باپ کے ساتھ نہیں ہوتے تو سب سوالوں کو پڑیا بنا کر کسی اندھیرے گڈھے میں پھینک دیتے ہیں۔

ٹیوب میں بیٹھ کر وہ کچھ مطمئن سی نظر آئی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

''کیا ابھی سے رات ہو گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''رات کیسی؟''

''دیکھو۔ باہر کتنا اندھیرا ہے۔''

''ہم زمین کے نیچے ہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ کچھ سوچنے لگی، پھر دھیرے سے کہا۔ ''نیچے رات ہے، اوپر دن''

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔

دھیرے دھیرے روشنی نظر آنے لگی اوپر آسمان کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا اور پھر گہری سفیدی میں ڈوبا دن سرنگ کے باہر نکل آیا۔

ٹیوب اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ رک گئی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''رک کیوں گئی؟''

''مجھے باتھ روم جانا ہے۔''

مجھے دہشت ہوئی، ٹائلٹ نیچے تھا اور وہ اس طرح اپنے کورو کے بہت دور تک نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور الٹے پاؤں سیڑھیوں پر بھاگنے لگا۔ گلیارے کے دوسرے سرے پر ٹائلٹ دکھائی دیا۔ مردوں کے لئے، میں جلدی سے اسے اندر لے گیا۔ دروازہ بند کر کے باہر آیا تو لگا جیسے وہ نہیں، میں آزاد ہو رہا ہوں۔

وہ باہر آئی تو پریشان سی نظر آئی۔ ''اب کیا بات ہے؟''

''چین بہت اونچی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم ٹھہرو، میں کھینچ آتا ہوں۔''

اس نے میرا کوٹ پکڑ لیا وہ خود کھینچنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ میں اندر گیا۔ اسے دوبارہ گود میں اٹھایا اور تب تک اٹھاتا گیا، جب تک اس کا ہاتھ چین تک نہیں پہنچ گیا۔ ہم دونوں حیرت سے ٹائلٹ میں پانی کو بہتا دیکھتے رہے، جیسے یہ چمتکار زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر آئے تو اس نے کس کر میرا ہاتھ بھینچ لیا تھا مگر ٹریفال گیئر اسکیر آگے تھا۔ چاروں طرف بھیڑ، اجالا، شور۔ میں اسے حیرت میں ڈالنا چاہتا تھا مگر وہ ڈر گئی تھی وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ میرا دل چاہا کہ میں اسے دوبارہ نیچے لے جاؤں۔ ٹیوب اسٹیشن میں، جہاں زمین کا اپنا محفوظ اندھیرا تھا۔

لیکن جلدی ہی ڈر بہہ گیا اور کچھ دیر بعد اس نے میرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ سکیر کے انوکھے اجالے میں کھو گئی تھی وہ ان شیروں کے نیچے چلی آئی تھی، جو کالے پتھروں پر اپنے پنجے کھول کر بھیڑ کو نہار رہے تھے۔ بہت سے بچے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔

پنکھوں کی پرچھائیں ایک بادل سی دکھائی دیتی تھی جو ہوا میں کبھی ادھر جاتی تھی کبھی اُدھر۔ سر کے اوپر سے نکل جاتی تھی اور کانوں میں صرف ایک گرم، سنسناتی پھڑپھڑاہٹ باقی رہ جاتی تھی۔

وہ سن رہی تھی، وہ مجھے بھول گئی تھی۔ میں اس کی آنکھ بچا کر سکیر کے بیچ چلا آیا وہاں ایک لال لکڑی کا کیبن تھا، جہاں دانے بکتے تھے۔ ایک کپ دانے کے دام چار پینس۔ میں نے ایک کپ خریدا اور بھیڑ میں اسے ڈھونڈنے لگا۔

بچے بہت تھے۔ کبوتروں سے گھرے ہوئے جبکہ وہ جہاں تھی، وہیں کھڑی تھی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی تھی۔ میں اس کے پیچھے گیا اور دانوں کا کپ اس کے آگے کر دیا۔

وہ مڑی اور بکبکا کر میری طرف دیکھا۔ بچے ممنون نہیں ہوتے صرف اپنا لیتے ہیں۔ ایک تیسری آنکھ کھل جاتی ہے جو سب چیزوں کو پاٹ دیتی ہے۔ اس نے کپ کو لگ بھگ میرے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ آئیں گے؟''

''ضرور آئیں گے..... پہلے تمھیں ایک ایک دانہ ڈالنا ہوگا۔ انھیں پاس بلانے کے لئے پھر......''

اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ اس طرف بھاگتی گئی جہاں اکے دکے کبوتر بھٹک رہے تھے

۔شروع شروع میں اس نے ڈرتے ہوئے ہتھیلی آگے بڑھائی۔ کبوتر اس کے پاس آتے ہوئے جھجک رہے تھے جیسے اس کے ڈر نے انھیں بھی چھولیا ہو جبکہ زیادہ دیر وہ اپنا لالچ نہیں روک سکے۔ نخرے چھوڑ کر پاس آئے ادھر اُدھر دیکھنے کا بہانہ کیا اور پھر کھٹا کھٹ اس کی ہتھیلی سے دانے چگنے لگے۔ وہ اب اپنی فراک پھیلا کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں دونا، دوسرے ہاتھ میں دانے۔ میں اب اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پنکھوں کی سلیٹی پھڑ پھڑاتی چھت نے اسے اپنے میں ڈھک لیا تھا۔

میں بنچ بیٹھ گیا۔ پھواروں کو دیکھنے لگا، جن کے چھینٹے اُڑتے ہوئے گھٹنوں تک آجاتے تھے۔ بادل اتنے نیچے جھک آئے تھے کہ نیلسن کا سر صرف ایک کالے دھبے سا دکھائی دیتا تھا۔

دن بیت رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں میں نے دیکھا، وہ سامنے کھڑی ہے۔ ''میں ایک کپ اور لوں گی'' اس نے کہا۔

''اب نہیں——'' میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ '' کافی دیر ہوگئی ہے، اب چائے پئیں گے اور تم آئس کریم لو گی۔''

اس نے سر ہلایا

''میں ایک کپ اور لوں گی۔''

اس کے لہجے میں میں ضد نہیں تھی کچھ لمحے پہلے جو پہچان آئی تھی، وہ جیسے مجھ سے نہیں، اس میں گزارش کر رہی ہو۔

میں نے اس کے ہاتھ سے خالی کپ لیا اور دوکان کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں دوکان کے پیچھے مڑ گیا، وہاں بھیڑ تھی اور اس کی آنکھیں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کونے میں سمٹ کر میں نے جیب سے پیسے نکالے۔ چائے اور آئس کریم کے پیسے ایک طرف گنے، ٹیوب کے کرائے کے پیسے دوسری طرف باقی صرف دو پینس بچے تھے، میں نے چائے کے کچھ پینس اس میں ملائے اور دوکاندار کے آگے لگی کیو میں شامل ہوگیا۔

اس بار جب میں نے اسے کپ دیا تو اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔ وہ فوراً بھاگتی ہوئی اس جگہ چلی گئی جہاں سب سے زیادہ کبوتر جمع تھے۔ اب اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور کبوتر بھی اسے پہچاننے لگے تھے۔ وہ آس پاس اڑتے ہوئے کبھی اس کے ہاتھوں، اس کے کندھوں، اس کے سر پر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ ہنستی جا رہی تھی، پیلا چہرہ بخار کے اثر سے بجھا بجھا سا ہو گیا تھا اور ہاتھ...... وہ ہاتھ جو مجھے ہمیشہ اتنے مظلوم جان پڑتے تھے۔ اب ایک عجیب بے چینی میں کبھی کھلتے تھے، کبھی بند ہوتے تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے کبوتروں کی پھڑ پھڑاتی گداز دھڑکنوں کو بوچ

لیں گے۔ اسے پتا بھی نہ چلا، کب دانوں کی کٹوری خالی ہوگئی وہ کچھ دیر تک ہوا میں ہتھیلی کھولے بیٹھی رہی اچانک اسے احساس ہوا کہ کبوتر اسے چھوڑ کر دوسرے بچوں کے آس پاس منڈرانے لگے ہیں۔ وہ کھڑی ہوگئی اور بغیر کہیں دیکھے چپ چاپ میرے پاس چلی آئی۔

وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے شک ہوا وہ مجھ پر شک کر رہی ہے۔ میں بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اب چلیں گے'' میں نے کہا۔

''میں ایک کپ اور لوں گی۔''

''اب اور نہیں تم دو لے چکی ہو'' میں نے غصے میں کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے، ہمارے پاس کتنے پیسے بچے ہیں؟''

''صرف ایک اور اس کے بعد ہم لوٹ جائیں گے۔''

لوگ ہمیں دیکھنے لگے تھے۔ میں بحث کر رہا تھا۔ دانوں کی ایک کٹوری کے لئے، میں نے اسے اٹھا کر بنچ پر بٹھا دیا۔ ''گریتا تم بہت ضدی ہو، اب تمیں کچھ نہیں ملے گا۔''

اس نے ٹھنڈی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''آپ برے آدمی ہیں میں آپ کے ساتھ کبھی نہیں کھیلوں گی'' مجھے لگا، جیسے اس نے میرا مقابلہ کسی ان دیکھے انسان سے کیا ہو۔ میں خالی سا بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے لئے کوئی امید نہیں رہتی صرف گھور حیرانی ہونے لگتی ہے۔ پھر مجھے وہ آواز سنائی دی جو آج بھی مجھے اکیلے میں سنائی دے جاتی ہے...... اور منھ موڑ لیتا ہوں۔

وہ رو رہی تھی، ہاتھ میں دانوں کا خالی کپ تھا اور اس کی کیپ کھسک کر پیشانی پر چلی آئی تھی۔ وہ بچی کا رونا تھا الگ الگ سانسوں کے بیچ بندھا ہوا، مجھ سے وہ نہیں سہا گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کپ لیا اور لائن میں جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس بار پیسوں کو گننا بھی یاد نہیں آیا میں صرف اس کا رونا سن رہا تھا، حالانکہ وہ مجھ سے بہت دور تھی اور بیچ میں کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور بچوں کی چیخوں کی وجہ سے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا لیکن ان سب سے پرے میرے اندر کا سناٹا تھا، جس کے بیچ اس کی رندھی سانسیں تھیں۔ اور وہ میں لامختتم دوری سے سن سکتا تھا۔

لیکن اس بار پہلے جیسا نہیں ہوا۔ بہت دیر تک کوئی کبوتر اس کے پاس نہیں آیا۔ اس کی اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے یا گھرتے اندھیرے کی وجہ سے وہ پاس تک آتے تھے لیکن اس کی کھلی ہتھیلی کی نظر انداز کرکے دوسرے بچوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ مایوس ہوکر اس نے دانوں کی کٹوری

زمین پر رکھ دی اور خود میرے پاس بنچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے جاتے ہی کبوتروں کا جمگھٹ کٹوری کے ارد گرد جمع ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا، دانوں کی کٹوری اوندھی پڑی ہے اور اس میں ایک بھی دانہ نہیں ہے۔

''اب چلو گی؟'' میں نے کہا

وہ فوراً بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی جیسے وہ اتنی دیر سے صرف اس کا ہی انتظار کر رہی ہو۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ایک بھیگی ہوئی چمک جو آنسوؤں کے بعد چلی آتی ہے۔

ان دنوں بڑی فالگر سکیر کے سامنے لائنس کا ریستوراں ہوتا تھا، گندا اور سستا دونوں ہی۔ سڑک پار کر کے ہم وہیں چلے آئے۔

اس بیچ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسوں کو گن لیا تھا۔ میں نے اس کے لئے دو توسٹ منگائے اور اپنے لئے چائے۔ آئس کریم کو بھلا دینا ہی بہتر تھا۔

وہ پہلی بار کسی ریستوراں میں آئی تھی۔ گہرے تجسس سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا کچھ دیر پہلے کی مایوسی ختم ہونے لگی ہے۔ ہم قریب قریب دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے لیکن پہلے جیسے نہیں۔ کبوتروں کی پرچھائیں اب بھی ہم دونوں کے بیچ پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''میں کیا بہت برا آدمی ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے آنکھیں اُٹھائیں، ایک لمحہ مجھے دیکھتی رہی، پھر بہت بے چین لہجے میں بولی۔ ''میں نے آپ کو نہیں کہا تھا۔''

''مجھے نہیں کہا تھا؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر کس کو کہا تھا؟''

''مسٹر نامس کو، وہ برے آدمی ہیں، ایک دن جب میں ان کے گھر گئی، وہ ڈانٹ رہے تھے اور مسز نامس بے چاری رو رہی تھیں۔''

''اوہ!'' میں نے کہا۔

''آپ سمجھے، میں نے آپ کو کہا تھا؟''

وہ ہنسنے لگی، جیسے میں نے سچ مچ بڑی بیوقوفی کی بھول کی ہے اور اس کی ہنسی دیکھ کر، نہ جانے کیوں، میرا دل بیٹھنے لگا۔

''ہم یہاں پھر کبھی آئیں گے؟'' اس نے کہا۔

''گرمیوں میں'' میں نے کہا۔ ''گرمیوں میں ٹیمز پر چلیں گے، وہ یہاں سے بہت قریب ہے۔''

''کیا وہاں کبوتر ہوں گے؟'' اس نے پوچھا

مجھے برا لگا، جیسے کوئی لڑکی اپنے محبوب کی باتیں بار بار چھیڑ دے لیکن میں اسے دوبارہ

نا امید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گرمیاں کافی دور تھیں۔ بیچ میں پت جھڑ اور برف کے دن آئیں گے تب تک میرا جھوٹ بھی پگھل جائے گا۔ میں نے سوچا۔

ہم باہر آئے، تو پیلا سا اندھیرا گھر گیا تھا حالانکہ دوپہر ابھی باقی تھی۔ اس نے کھوئی ہوئی آنکھوں سے سکیئر کی طرف دیکھا جہاں کبوتر ابھی بھی اڑ رہے تھے۔ میری جیب میں اب اتنے ہی پیسے تھے جن سے ٹیوب کا کرایہ دیا جاسکے۔ اس بار اس نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بچے ایک حد کے بعد، بڑوں کی غریبی نہ سہی، مجبوری سونگھ لیتے ہیں۔

میں نے سوچا تھا، ٹرین میں بیٹھیں گے، تو میں اس سے سرہاوس کے بارے میں پوچھوں گا اس ویلو کے بارے میں بھی، جو اکیلا اس کے باغ میں کھڑا تھا۔ میں اسے دوبارہ اس کی اپنی دنیا میں لانا چاہتا تھا جہاں پہلی بار ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اسکی آنکھیں مندنے لگیں۔ ٹریفالگر سکیئر سے اس للنگٹن تک کا کافی لمبا فاصلہ تھا، کچھ دیر بعد اس نے میرے کندھوں پر اپنا سر ٹکا لیا اور سونے لگی۔

اس بیچ میں نے ایک آدھ بار اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ سوتے ہوئے وہ ہو بہو ویسی ہی لگ رہی ہے، جیسے پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ پارک میں پیڑوں کے بیچ اپنے آپ میں مگن اور ڈوبی ہوئی۔ کبوتروں کے لئے جو بھٹکاؤ آیا تھا، وہ اب کہیں نہ تھا۔ آنسو کب کے سوکھ چلے تھے۔ نیند میں وہ اتنی ہی مکمل جان پڑتی تھی جتنی جھاڑیوں کے بیچ اور تب مجھے عجیب سا خیال آیا۔ پارک میں اس نے کئی بار مجھے پکڑا تھا جبکہ اس کے سوتے ہوئے غافل چہرے کو دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ ہمیشہ سے پکڑی ہوئی لڑکی ہے جبکہ میرے جیسے لوگ صرف کبھی کبھی پکڑ میں آتے ہیں اور اسے اس کا کوئی پتا نہیں ہے اور یہ ایک طرح کا وردان ہے کیونکہ دوسروں کو ہمیشہ چھوٹنے کا، آزاد ہونے کی تشویش رہتی ہے جبکہ بچی کو اس طرح کی کوئی امید نہیں تھی تب پہلی بار میں نے اسے چھونے کی ہمت کی۔ میں دھیرے دھیرے اس کے گالوں کو چھونے لگا، جو آنسوؤں کے بعد گرم ہو گئے تھے، کچھ ویسے ہی جیسے بارش کے بعد گھاس کی پتیاں ہو جاتی ہیں۔

وہ جاگی نہیں، ٹیوب اسٹیشن آنے تک آرام سے سوتی رہی۔

اس رات بارش شروع ہوئی، تو ہفتے بھر چلتی رہی۔ جھوٹی گرمیوں کے دن ختم ہو گئے۔ سارے شہر پر پیلی دھند کی پرتیں جمی رہتیں۔ سڑک پر چلتے ہوئے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا، نہ پیڑ، نہ لیمپ پوسٹ، نہ دوسرے آدمی۔

مجھے وہ دن یاد ہے، کیونکہ انہیں دنوں مجھے کام ملا تھا۔ لندن میں وہ میری پہلی نوکری تھی

کام زیادہ تھا لیکن مشکل نہیں۔ ایک پب میں کاؤنٹر کے پیچھے سات گھنٹے کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ بیئر اور لیگر کے گلاس دھونے پڑتے تھے۔ گیارہ بجے گھنٹی بجانی پڑتی تھی اور پیکڑ لوگوں کو باہر کھدیڑنا پڑتا تھا۔ کچھ دن تک میں باہر کہیں نہ جا سکا، گھر لوٹتا اور بستر پکڑ لیتا، جیسے پچھلے مہینوں کی نیند کوئی پرانا بدلہ نکال رہی ہو۔ نیند کھلتی تو بارش دکھائی دیتی جو گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح برابر چلتی رہتی کبھی کبھی وہم ہوتا کہ میں مر گیا ہوں اور اپنی قبر کی دوسری طرف سے بارش کی ٹپ ٹپ سن رہا ہوں۔

لیکن ایک دن آسمان دکھائی دیا۔ پورا نہیں صرف ایک نیلی ڈوبی سی پھانک اور اسے دیکھ کر مجھے اچانک پار کے دن یاد آ گئے۔ یہودی ریستوراں کی بلی اور بازار جاتی ہوئی مسز ٹامس۔ وہ میری چھٹی کا دن تھا۔ اس دن میں نے اپنے سب سے اچھے کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

لائبریری کھلی تھی۔ سارے پرانے چہرے وہاں دکھائی دیئے۔ پارک خالی پڑا تھا۔ پیڑوں پر پچھلے دنوں کی بارش چمک رہی تھی۔ وہ سکڑے سے دکھائی دیتے تھے جیسے آنے والے سردیوں کی افواہ انھیں چھو گئی ہو۔

میں دوپہر تک انتظار کرتا رہا۔ گریتا کہیں دکھائی نہیں دی۔ نہ بینچ پر نہ پیڑوں کے پیچھے دھیرے دھیرے پارک کا پیلی، پت جھڑی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ پانچ بجے اسپتال کا گجر سنائی دیا اور میری آنکھیں یک لخت پھاٹک کی طرف اٹھ گئیں۔

کچھ دیر تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ پھاٹک کے اوپر لوہے کا ہینڈل شام کی آخری دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کے پیچھے اسپتال کے لال اینٹے والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا انھیں گھر جانے کیلئے پارک کے بیچ سے نکلنا ہوگا جبکہ پھر بھی میں غیر یقینی نگاہوں سے کبھی پھاٹک کو دیکھتا تھا، کبھی سڑک کو۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ شاید آج ان کی ڈیوٹی اسپتال میں نہ ہو اور وہ دونوں گھر میں ہی بیٹھے ہوں۔

سڑک کی بتیاں جلنے لگیں۔ مجھے عجیب سی گھراہٹ ہوئی جیسے انتظار کا آخر لمحہ آ پہنچا ہو اور میں اسے ٹالتا جا رہا ہوں۔ میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا، کھڑے ہو کر انتظار کرنا زیادہ آسان جان پڑا۔ تبھی مجھے پھاٹک کے نزدیک سرسراہٹ سنائی دی، ان کے چہرے کو بعد میں دیکھا۔ ان کی سفید پوشاک پہلے دکھائی دی۔ وہ تیز قدموں سے پارک کے بیچ پگ ڈنڈی پر چل رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا اگر وہ میری طرف آ رہی ہوتی، تو بھی شاید دھند لکے میں مجھے نہیں پہچان پاتیں۔

میں بھاگتا ہوا ان کے پیچھے چلا آیا۔

''مسز پارکر!'' پہلی بار میں نے انھیں ان کے نام سے بلایا تھا۔

وہ ٹھہر گئیں اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ ''آپ یہاں کیسے؟'' اب بھی وہ اپنے کو نہیں سنبھال پائی تھیں۔

''میں یہاں دوپہر سے بیٹھا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ہکبکائی سی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن جیسے اس پہچان کا مطلب نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔ میں کچھ الجھن میں پڑ گیا اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''آج آپ اتنی دیر سے لوٹ رہی ہیں؟ پانچ کا گجر کو کب کا بج چکا ہے؟''

''پانچ کا گجر؟'' انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ ہمیشہ پانچ بجے لوٹتی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ!'' انھیں یاد آیا، جیسے میں کسی تاریخی واقعے کا ذکر کر رہا ہوں۔

''آپ لندن میں ہی تھے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''مجھے کام مل گیا، اتنے دنوں سے اسی لئے نہیں آ سکا، گریتا کیسی ہے؟''

وہ ہچکچائیں۔ چند لمحوں کی ہچکچاہٹ، جو کچھ بھی معنی نہیں رکھتی لیکن شام کے دھندلکے میں مجھے وہ نحوست سی جان پڑی۔

''میں آپ کو بتانا چاہتی تھی، لیکن مجھے آپ کا گھر نہیں معلوم تھا......''

''وہ ٹھیک ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' انھوں نے جلدی میں کہا۔ ''لیکن وہ اب یہاں نہیں ہے کچھ دن پہلے اس کے والد آئے تھے، وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے......''

میں انھیں دیکھتا رہا۔ میرے اندر جو کچھ تھا، وہ ٹھہر گیا۔ میں اس کے اندر تھا۔ اس ٹھہراؤ کے اور وہاں سے دنیا بالکل باہر دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کبھی اتنی صفائی سے باہر کو نہیں دیکھا تھا۔

''کب کی بات ہے؟''

''جس دن آپ اس کے ساتھ ٹیفالگر سکیر گئے تھے۔ اس کے دوسرے دن ہی وہ آئے......آپ جانتے ہیں، انھیں وہاں کام مل گیا۔''

''اور آپ؟'' میں نے کہا۔ ''آپ یہاں اکیلی رہیں گی؟''

''میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔'' انھوں نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ آواز ہلکی سی کانپتی تھی اور ایک لمحے کے لئے مجھے ان کے چہرے پر بچی دکھائی دی۔ اوپر اٹھا ہوا ہونٹ اور بھیگی آنکھیں۔ ہوا میں اڑتے ہوئے کبوتروں کو نہارتی ہوئی۔

''آپ کبھی گھر ضرور آیئے گا۔'' انھوں نے اجازت مانگی اور میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں بہت دور تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر کافی دیر تک بینچ پر بیٹھا رہا مجھے کہیں نہیں جانا تھا۔ نہ ہی انتظار کرنا تھا۔ دھیرے دھیرے پیڑوں کے اوپر تارے نکلنے لگے۔ میں نے پہلی بار لندن کے آسمان میں اتنے تارے دیکھے تھے۔ صاف اور چمکیلے جیسے بارش نے انھیں بھی دھوڈالا ہو۔

''اٹ از ٹائم ڈیر''

پارک کے چوکیدار نے دور سے آواز لگائی۔ وہ گیٹ کی چابیاں کھنکھناتا ہوا پارک کا چکر لگا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ ہر بینچ، جھاڑی اور پیڑ کے نیچے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں کوئی چھوٹ تو نہیں گیا۔ کوئی کھویا ہوا بچہ، کوئی شرابی، کوئی گھریلو بلی۔

وہاں کوئی نہ تھا کوئی بھی چیز نہیں چھوٹی تھی۔۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ اچانک ہوا اٹھی تھی، ہلکا سا جھونکا اندھیرے میں چلا آیا۔ اور پیڑ سرسرانے لگے اور تب مجھے دھیمی سی آواز سنائی دی۔ ایک بے حد نرم گزارش میں لپٹی ہوئی 'اسٹاپ۔ اسٹاپ' ۔میرے پاؤں بیچ پارک میں ٹھٹھک گئے ۔ چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نہ تھا، نہ کوئی آواز، نہ کھٹکا، صرف پیڑوں کی شاخیں ہو امیں ڈول رہی تھیں ۔ اس وقت ایک پگلی، بے ساختہ ننگی سی خواہش میرے اندر جاگنے لگی کہ یہیں بیٹھ جاؤں۔ ان پیڑوں کے بیچ جہاں میں پہلی بار پکڑا گیا تھا۔ میری اب اور آگے جانے کی خواہش نہ تھی۔ میں اس بار آخری اور لازمی طور پر پکڑ لیا جانا چاہتا تھا۔

''اٹ از کلوزنگ ٹائم'' چوکیدار نے اس بار بہت قریب آ کر کہا۔ میری طرف تجسس سے دیکھا کہ کیا میں وہی آدمی ہوں جو ابھی کچھ دیر پہلے بینچ پر بیٹھا تھا۔

اس بار میں نہیں مڑا۔ پارک سے باہر آ کر ہی سانس لی۔ میرا گلا سوکھ گیا تھا۔ اور جسم کھوکھلا سی جان پڑتا تھیا۔ پارک میں سامنے پب کی لالٹین جھولتی دکھائی دی۔ میں نے جیب سے پرس نکالا، پیسے گننے کے لئے۔ پرانی مفلسی کے دن کی یہ عادت اب بھی بچی تھی۔ میں نے حیرانی سے دیکھا کہ میرے پاس پورے دو پاؤنڈ ہیں۔ اور تب مجھے یاد آیا کہ میں انھیں کبوتروں کے دانے کے لئے لایا تھا۔

☆☆☆

شائستہ فاخری موجودہ اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں اردو اور ہندی زبان میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔وہ کئی زبانوں کی جانکار ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق الہ آباد کے مشہور دائرہ ،دائرہ شاہ اجمل سے ہے اور گھر کا ماحول حد درجہ مذہبی ہونے کے باعث عربی، فارسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔اردو تو ان کی مادری زبان ہے اور جس کی تعلیم گریجویشن تک حاصل کی۔ سنسکرت سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگری لی اور اسی زبان میں ریسرچ بھی کر رہی ہیں۔۔کئی زبانوں سے دلچسپی نے انھیں ان زبانوں کے ادب کو پڑھنے کے مواقع فراہم کئے۔ان کے اندر تخلیقی صلاحیت تو تھی ہی دوسری زبانوں کے ادب نے ان کو ترجمے کی طرف مائل کیا۔انھوں نے اردو زبان کے سرمایے میں اضافے کی خاطر اس میدان میں بھی قدم رکھا اور جب کبھی تخلیقی کاموں سے ذرا بھی فراغت ملی وہ ترجمے کے کام میں جٹ گئیں۔وہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمے کرتی ہیں۔

ترجمہ تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔دوسری تہذیبوں سے کچھ سیکھنے اور اپنی تہذیب کو بہتر بنانے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ ترجمہ بڑا آسان کام ہے لیکن ترجمہ بھی ایک مشکل فن ہے۔ شائستہ فاخری کبھی اس سے پیچھے نہیں ہٹیں۔انھوں نے ایشیائی زبانوں کی کہانیوں کے ترجمے کے ساتھ عالمی زبانوں کی سو سے زاید کہانیوں کا بھی ترجمہ کیا۔ پاکستانی شاعرات کی نظموں کا ہندی میں ترجمہ ان کا ایک بڑا کام ہے۔ ان دنوں سیفو کی نظموں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر رہی ہیں۔

پیش نظر کتاب چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیوں کے ترجمے کی شکل میں ہے۔ان کی محنت لائق تحسین اور قابل داد ہے۔

-ادارہ

Chaubees Zabanon Ki Hindustani Kahaniyan

Translation: Shaista Fakhri

arshia publications arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 978-93-81029-59-6